فضائل القرآن

تقاریر

سیّدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعود

خلیفۃ المسیح الثانیؓ

الناشر

نظارت نشر و اشاعت قادیان

نام کتاب	:	فضائل القرآن
مصنف	:	حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفة المسیح الثانیؓ
سن اشاعت کمپوزڈ بار اول	:	2012ء
تعداد	:	1000
مطبع	:	فضل عمر پرنٹنگ پریس قادیان
ناشر	:	نظارت نشرو اشاعت صدر انجمن احمدیہ قادیان ، ضلع گورداسپور، پنجاب، انڈیا-143516

ISBN : 978-81-7912-275-4

FAZAILUL QURAN

Speeches Delivered by:

Hadhrat Mirza Bashiruddin Mahmud Ahmad

Khalifatul Masih II (ra)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

سیدنا حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب قادیان کے ہندوؤں اور آریوں نے نشان نمائی کا مطالبہ کیا تو آپؑ باذنہ تعالیٰ ہوشیار پور تشریف لے گئے جہاں پر آپؑ کو بہت سی صفاتِ محمودہ کے حامل ایک موعود بیٹے کی بشارت دی گئی جو" پیشگوئی مصلح موعود "کے نام سے جماعت احمدیہ میں معروف و مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بابرکت وجود میں اس پیشگوئی کے ہر حصہ کو بڑی شان سے پورا فرمایا۔

پیشگوئی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ فرزند دلبند علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا اور اس کے آنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ

"تا دین اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر ہو"

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ساری زندگی اس مقصد کو پورا کرتے ہوئے کلام اللہ یعنی قرآن کریم کی خدمت میں گزری ہے۔ آپؓ نے قرآن کریم کی بے لوث خدمت کی ہے۔ قرآن مجید کے ترجمہ اور مختصر تفسیر کی صورت میں تفسیر صغیر، قرآن کریم کی منتخب سورتوں کی پُر معارف تفسیر کے ساتھ تفسیر کبیر، فضائل القرآن اور آپ کی بے شمار تقاریر اس کا واضح ثبوت ہیں۔

سیدنا حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی" فضائل القرآن "کے موضوع پر چھ عظیم الشان تقاریر اس مجموعہ کے ذریعہ احباب جماعت کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔ یہ تقریریں انوار العلوم کی مختلف جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ احباب جماعت کی سہولت کی خاطر ان کو یکجائی صورت میں کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

۱۹۲۸ء کے جلسہ سالانہ پر حضور نے ان تقاریر کے سلسلہ کا آغاز فرمایا اور ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو حضور نے اس بلند پایہ علمی موضوع پر چھٹی تقریر فرمائی۔ ان تقاریر میں آپؓ نے قرآن کریم کے حقائق و معارف اور اس کے اسرار مخفیہ سے تعلق رکھنے والے علوم کے خزانوں پر مشتمل مضامین بیان فرمائے ہیں۔ ان تقاریر میں قرآن کریم کی عظمت اور عالی مرتبت اور اس کے معانی و تفاسیر کا ایک نیا اور دلکش اسلوب نظر آتا ہے۔ آپؓ نے تفسیر القرآن کے ایسے مؤثر اصول پیش فرمائے ہیں جو عدیم المثال ہیں۔

سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی اجازت و منظوری سے نظارت نشر و اشاعت قادیان کتاب '' فضائل القرآن '' کو پہلی بار کمپوز کروا کر افادہ عام کے لئے شائع کر رہی ہے۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت کو ہر لحاظ سے بابرکت کرے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ وہ ہم سب کو نور قرآن سے منور کر دے اور اس نادر خزانہ سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار
حافظ مخدوم شریف
ناظر نشر و اشاعت قادیان

فہرست تقاریر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

فضائل القرآن

نمبر......۱

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هُوَ النَّاصِرُ

فضائل القرآن

(نمبر......ا)

قرآن کریم کی سابقہ الہامی کتب پر فضیلت
اور
مستشرقین یورپ کے اعتراضات کا ردّ

(فرمودہ ۲۸؍دسمبر ۱۹۲۸ء بر موقع جلسہ سالانہ قادیان)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت کے متعلق کوئی حد بندی کرنا یا کوئی حد بندی چاہنا انسانی طاقت سے بالا اور ادب کے منافی ہے۔ لیکن آج جس وقت نماز جمعہ کے قریب بادل گھر آئے اور تیز بارش برسنے لگی تو باوجود ضعف اور خرابی صحت کے میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ کم از کم جلسہ سب دوستوں

کے ساتھ مل کر دُعا پر ختم ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طاقتیں تو بہت وسیع ہیں لیکن بندہ گھبرا جاتا ہے۔ جب بارش تھمنے میں نہ آئی تو میں نے ایک تحریر لکھی اور دوستوں سے کہا کہ اس کی نقلیں کروا کر ابھی کمروں میں پہنچا دی جائیں۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ بارش کی وجہ سے چونکہ ہم سب لوگ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اس لئے سوا پانچ بجے میں دُعا کروں گا سب دوست اپنی اپنی جگہ اس دعا میں شامل ہو جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ ابھی نقلیں ہو ہی رہی تھیں کہ بارش تھم گئی اور میں نے کہلا بھیجا کہ خدا تعالیٰ نے دوسری صورت پیدا کر دی ہے اب نقلیں کروانے کی ضرورت نہیں۔

قرآنی مطالب پر غور کرنے کے لئے بعض اصولی باتیں

مجھے افسوس ہے کہ آج میں اس مضمون کو پوری طرح بیان کرنے کے قابل نہیں جو اس جلسے کے لئے میں نے تجویز کیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون کم از کم وقت لے اور اسے خلاصۃً بھی بیان کیا جائے تب بھی پانچ چھ گھنٹے میں بیان ہو سکتا ہے۔ اور اتنی لمبی تقریر موسم کے خراب ہونے اور پھر طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے اس وقت نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس مضمون کو جلسہ سالانہ کے لئے اس وجہ سے چُنا تھا کہ یہ مضمون قرآن کریم کے متعلق ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو تو آئندہ جو قرآن کریم کا ترجمہ ہماری طرف سے شائع ہو اس کا اسے دیباچہ بنا دیا جائے۔ کچھ حصہ ان مضامین کا جلسہ کے موقعہ پر بیان کر دوں اور باقی حصہ میں خود لکھ لوں۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ مضمون تفصیلی طور پر بیان نہیں ہو سکتا اس لئے آج میں اختصار کے ساتھ صرف اتنا ہی بیان کر دیتا ہوں کہ قرآن کریم پر غور کرنے اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے کِن کِن مطالب پر غور کرنا چاہئے اور یہ کہ عیسائی اور دوسرے غیر مسلم اسلام اور قرآن کریم کے خلاف کتنی کوششیں کر رہے ہیں اور مسلمان اس طرف سے کتنے غافل اور لاپرواہ ہیں۔ میرے نزدیک قرآن کریم پر مجموعی نظر ڈالنے کے لئے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے۔

ضرورتِ قرآن

اوّل کیا اُس وقت جبکہ قرآن کریم نازل ہوا دنیا کو کسی الہامی کتاب کی ضرورت تھی یا نہیں؟

کیونکہ جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ کوئی چیز با موقع نازل ہوئی ہے اس وقت تک خدا تعالیٰ کی طرف وہ منسوب نہیں کی جا سکتی۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ جب قرآن کریم نازل ہوا تو اس وقت لوگوں کی حالت خراب تھی۔ مگر لوگوں کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ضروری نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی کتاب بھی نازل ہو۔ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس وقت تشریف لائے جب لوگوں کی عملی حالت بالکل خراب ہو چکی تھی۔ لیکن کیا آپ کوئی کتاب لائے۔ پس یہ کہنا کہ لوگوں کی عادات خراب ہوگئی تھیں فسق و فجور پیدا ہو گیا تھا یہ اس بات کیلئے کافی نہیں کہ اُس زمانہ میں قرآن کریم کی بھی ضرورت تھی۔ یا یہ کہ عربوں میں بد رسوم پیدا ہوگئی تھیں۔ بیٹیوں کو مار ڈالتے تھے۔ سوتیلی ماؤں سے شادی کر لیتے تھے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ عربوں کے لئے ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ یہ ثابت نہیں ہوگا کہ ساری دنیا کے لئے ضرورت تھی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت سخت خراب تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام ساری دنیا کے لئے آئے تھے۔ ہمیں جو چیز ثابت کرنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں تمام مذہبی کتب میں ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ذات میں دنیا کو تسلی دینے کے لئے ناکافی تھیں۔ پس قرآن کریم کے نازل ہونے کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے پہلی کتب میں بگاڑ ثابت کرنا ضروری ہے۔

قرآن کریم کی وحی کس طرح نازل ہوئی

(۲) دوسرے اس بات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی وحی کس طرح نازل ہوئی؟ کیونکہ کسی وحی کے نزول کے طریق سے بھی بہت کچھ اس کی صداقت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ مثلاً اس بات پر بحث کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آجائے گا کہ جس انسان پر یہ وحی نازل ہوئی کیا اس کے نازل ہونے کے وقت کی کیفیت سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ دماغ خراب تھا۔ بیسیوں لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں ہمیں یہ یہ الہام ہوا۔ وہ اپنی طرف سے جھوٹ نہیں بول رہے ہوتے۔ مگر ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے آکر کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ آپ اس کی بات سن کر خاموش رہے اس

نے پھر کہا جب میں سجدہ کرتا ہوں تو خدا تعالیٰ مجھے کہتا ہے عرش پر سجدہ کر اور کہتا ہے تو محمد ہے تو عیسیٰ ہے تو موسیٰ ہے آپ نے فرمایا کیا جب تمہیں محمد کہا جاتا ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا جمال اور جلال بھی دیا جاتا ہے یا قرآن کریم کے علوم بھی تم پر کھولے جاتے ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر خدا تعالیٰ تمہیں عرش پر نہیں لے جاتا ہے بلکہ شیطان بہکاتا ہے۔ اگر خدا تمہیں عرش پر لے جاتا اور محمد قرار دیتا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم والی طاقتیں بھی تمہیں آپ کی غلامی میں عطا فرماتا۔ تو قرآن کریم کی وحی کے نزول پر بحث کرتے ہوئے یہ سوال بھی سامنے آجائے گا کہ جس شخص پر یہ کلام اترا وہ ایسا تو نہ تھا کہ مجنوں ہو یا اس کے دماغ میں کوئی اور نقص ہو۔

جمع قرآن پر بحث

(۳) تیسرا سوال قرآن کریم پر نظر ڈالتے وقت یہ سامنے آئے گا کہ قرآن کریم کس طرح جمع ہوا؟ یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جو کتاب دنیا کے سامنے رکھی گئی کیا اسی صورت میں سامنے آئی ہے جو اس کے نازل کرنے والے کا منشا تھا؟ اگر اسی صورت میں سامنے آئی ہے تب تو معلوم ہوا کہ اس پر غور کرنے سے وہ صحیح منشاء معلوم ہو جائے گا جو پیش کرنے والے کا تھا۔ لیکن اگر اس میں کوئی خرابی اور نقص پیدا ہو گیا ہے تو پھر اس کتاب کے پیش کرنے والے کا جو منشا تھا وہ حبط ہو گیا۔ اس وجہ سے اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یورپ کے لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم صحیح طور پر جمع نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں قرآن کریم کی عبارت کی کوئی ترتیب نہیں یونہی مختلف باتوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

حفاظت قرآن کریم کا مسئلہ

(۴) چوتھی چیز یہ ثابت کرنی ہوگی کہ قرآن اب تک محفوظ بھی ہے۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ قرآن صحیح طور پر پیش کرنے والے کے منشاء کے مطابق جمع ہوا ہے۔ مگر یہ کہا جائے کہ اس میں کچھ زائد حصہ بھی شامل ہو گیا ہے یا اس میں سے کچھ حصہ حذف ہو گیا ہے تو پھر سوال ہوگا کہ کتاب اب اصل شکل میں نہیں رہی۔ اس وجہ سے وہ فائدہ نہیں دے سکتی جس کے لئے آئی تھی اور دنیا کے لئے

کامل ہدایت نامہ نہیں ہوسکتی۔

اس کے لئے بھی عیسائی مورخین نے بڑا زور لگایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم محفوظ نہیں ہے۔

قرآن کریم کا پہلی کتب سے تعلق

(۵) پانچواں سوال جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پہلی کتب سے کیا تعلق ہے۔ آیا قرآن کریم پہلی کتب کا مصدّق ہے یا نہیں اگر ہے تو کس طرح؟ ان کو موجودہ صورت میں درست تسلیم کرتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ پہلے صحیح اُتری تھیں مگر اب بگڑ گئی ہیں۔ یورپ کے لوگوں نے اس بات کے لئے بڑی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم نے پہلی کتب کو ان کی موجودہ صورت میں صحیح تسلیم کیا ہے۔ اس سے ان کی غرض یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے ان کتب کی موجودہ شکل کو درست مانا ہے تو پھر قرآن کریم کا ان سے جو اختلاف ہوگا وہ غلط ہوگا۔ سرولیم میور نے اس پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس میں اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک پہلی کتابیں صحیح ہیں۔

قرآن کریم کی پہلی کتب سے تصدیق

(۶) چھٹا سوال یہ ہوگا کہ اتنی عظیم الشان کتاب جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ساری دنیا کے لئے ہے اس کی تصدیق پہلی کتب سے ہوتی ہے یا نہیں اور کیا قرآن کریم کا ذکر پہلی کتب میں موجود ہے؟ تا لوگ معلوم کرلیں کہ پہلی کتب میں اس کی جو خبر دی گئی تھی یہ اسی کے مطابق آیا ہے۔

قرآن کریم میں پہلی کتب سے زائد خوبیاں

(۷) ساتواں سوال اس کے ساتھ ہی یہ پیدا ہوجائے گا کہ قرآن کریم پہلی کتابوں سے کون سی زائد چیز لایا ہے۔ یا تو وہ یہ کہے کہ پہلی سب کتابیں جھوٹی ہیں اس لئے مجھے نازل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کہتا ہے کہ وہ بھی سچی ہیں تو پھر یہ دکھانا چاہئے کہ قرآن کریم زائد خوبیاں کیا پیش کرتا

ہے ورنہ اس کے نازل ہونے کی ضرورت ثابت نہ ہوگی۔ پس یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہوگا کہ قرآن دوسری کتب کے مقابلہ میں افضل ہے۔

ترتیب قرآن

(۸) ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ آیا قرآن کریم میں کوئی ترتیب مدنظر ہے؟ یعنی اس میں کوئی معنوی ترتیب ہے؟ یورپ والے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی ترتیب نہیں۔ بالکل بے ربط کلام ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان علماء نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ قرآن میں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ کوئی ترتیب نہیں۔ لیکن کسی کتاب کا بے ترتیب ثابت ہونا اس پر بہت بھاری حملہ ہے اور اگر اس میں ترتیب ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اُس طرح نہیں جس طرح نازل ہوئی تھی۔ پہلی اُتری ہوئی آیتیں پیچھے اور پچھلی پہلے کر دی گئی ہیں۔ سورۃ علق پہلے نازل ہوئی مگر بعد میں رکھی گئی اور سورۃ فاتحہ بعد میں نازل ہوئی اور اسے پہلے رکھا گیا۔ اسی طرح اور آیتوں کو بھی آگے پیچھے کیا گیا ہے۔ مکہ میں بعض آیتیں اُتریں جنہیں مدنی سورتوں میں درج کیا گیا ہے۔ اور بعض مدینہ میں اُتریں انہیں مکی سورتوں میں لکھا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ میں قرآن کریم کی ترتیب مدنظر تھی تو پھر کیوں اسی طرح جمع نہ کیا گیا جس طرح نازل ہوا تھا۔ اور اگر وہ ترتیب صحیح ہے جس میں اب قرآن موجود ہے تو پھر کیوں اسی ترتیب سے نازل نہ ہوا؟

یہ ایک اہم سوال ہے جو اہل یورپ نے اُٹھایا ہے۔ اسے خدا تعالیٰ کے فضل سے اصولی طور پر میں نے اس طرح حل کیا ہے کہ ہر سمجھدار کی سمجھ میں آجائے گا۔

ناسخ ومنسوخ کی بحث

(۹) ایک سوال قرآن کریم کے متعلق ناسخ ومنسوخ کا آجاتا ہے۔ یہ خود مسلمانوں کا پیدا کردہ ہے۔ کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیتیں منسوخ ہیں۔ انہیں بعض دوسری آیتوں یا حدیثوں نے منسوخ کر دیا ہے۔ وہ پڑھی تو جائیں گی مگر ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

یورپ والوں نے اس کے متعلق کہا ہے کہ ناسخ منسوخ کا ڈھکوسلا اس لئے بنایا گیا ہے کہ

قرآن کریم میں صریح تضاد پایا جاتا ہے۔ جب اسے دور کرنے کی مسلمانوں کو کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے متضاد آیتوں میں سے ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دے دیا۔

نزولِ قرآن کا مقصد اور اس کا پورا ہونا

(۱۰) پھر ایک یہ بھی سوال ہے کہ آیا قرآن کریم اس مقصد کو پورا کرتا ہے جس کے لئے کوئی مذہب نازل ہوتا ہے۔ ہر ایک الہامی کتاب اسی وقت مفید ہوسکتی ہے جب اس مقصد کو پورا کرے جسے الہامی کتاب کو پورا کرنا چاہئے۔ اور لوگ جن الہامی کتب کو مانتے ہیں ان کی کوئی نہ کوئی ضرورت بھی ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کتاب آنے کی یہ یہ ضرورت تھی اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم اُس ضرورت کو پورا کرتا ہے جس کے لئے وہ نازل ہوا ہے؟ اگر کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی کتاب ہے ورنہ نہیں۔

فطرتِ انسانی کے مطابق تعلیم

(۱۱) پھر قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کی فطرت کے لوگوں کے لئے ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کی تعلیم فی الواقع ایسی ہے کہ اس سے ایک اَن پڑھ بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اگر ایک عالم پڑھے تو وہ بھی مستفیض ہوسکتا ہے۔ اگر اس کی تعلیم ایسی ہے تو یہ کتاب خدا تعالیٰ کی طرف سے کہلا سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔

فہمِ قرآن کے اصول

(۱۲) ایک اور سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ قرآن کریم کے فہم کے اصول کیا ہیں؟ ہر کتاب کو سمجھنے اور اس سے مستفیض ہونے کے لئے کوئی نہ کوئی کلید ہوتی ہے۔ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے کن اصول کی ضرورت ہے؟ گویا قرآن کریم کو اصول تفسیر بھی بیان کرنے چاہئیں تا کہ ان سے کام لے کر ہر انسان اپنی سمجھ اور اپنے علم کے مطابق فہمِ قرآن حاصل کر سکے۔

قرآن کریم کو پہلی کتب کا مُصَدِّق کن معنوں میں کہا گیا ہے؟

(۱۳) ایک سوال یہ بھی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں قرآن اس لئے پہلی کتب کا مُصَدِّق ہے کہ ان کتابوں کی نقل کرتا ہے۔ اس نقل کے الزام سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے کہ قرآن ان کا مصدق ہے۔ ہم کہتے ہیں بے شک قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے مگر ان کے خلاف بھی تو کہتا ہے۔ اب ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ثابت کریں کہ قرآن دوسری کتابوں سے کیا نقل کرتا ہے اور کیا چھوڑتا ہے؟ اور جو بات نقل کرتا ہے اسے پہلی کتاب سے زائد بیان کرتا ہے یا نقل کرتے ہوئے پہلی کتابوں سے اختلاف کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا وجہ ہے کہ ہم قرآن کی بات کو صحیح مانیں۔

پُرانے واقعات کے بیان کرنے کی غرض

(۱۴) پھر قرآن میں پرانے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کیوں بیان کیا گیا ہے۔ کیا قرآن قصے کہانیوں کی کتاب ہے؟ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ہی کفار کی طرف سے کہا گیا تھا کہ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ[۱] قرآن تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

قسموں کی حقیقت

(۱۵) یہ سوال بھی شبہات پیدا کرتا ہے کہ قرآن کریم میں قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں؟ قسموں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام بنایا اور وہ یہ بات بھول گئے کہ اسے خدا کا کلام قرار دے رہے ہیں۔ اس لئے قسمیں کھانے لگے۔ اس قسم کے شبہات دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بتایا جائے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بھی قسمیں ہوتی ہیں اور ان کی کیا وجہ ہوتی ہے

معجزات پر بحث

(۱۶) اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس بات پر زور دینا کہ کوئی نشان دکھانا

رسول کے اختیار میں نہیں۔ جب خدا چاہتا ہے نشان دکھاتا ہے۔ دراصل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پردہ پوشی کے لئے ہے۔ اس کے متعلق یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ سارے کا سارا قرآن نشانات کا مجموعہ ہے۔

خدا تعالیٰ کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں

(۱۷) اسی طرح قرآن کریم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سائنس اور علوم طبعیہ کے خلاف باتیں پیش کرتا ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ کا قول اس کے فعل کے خلاف نہیں ہوسکتا اس لئے یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام اس کے کسی فعل کے خلاف نہیں ہے۔ اس میں ایسی سچائیاں ہیں جو پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھیں۔ اور انہیں علومِ طبعیہ کے خلاف قرار دیا جاتا تھا مگر اب انہیں درست قرار دیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کے روحانی کمالات

(۱۸) یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن کریم میں کیا کمالات ہیں اور قرآن کریم بنی نوع انسان کو کس اعلیٰ روحانی مقام پر پہنچانے کے لئے آیا ہے۔

آخری شرعی کلام

(۱۹) یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن خدا تعالیٰ کا آخری شرعی کلام ہے۔ لوگ کہتے ہیں جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ کلام نازل ہوتا رہا ہے تو اب شرعی کلام کا آنا کیوں بند ہوگیا۔ اس کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اب کسی اور شرعی کلام کی ضرورت نہیں۔

عربی زبان اختیار کرنے کی وجہ

(۲۰) پھر اس امر پر بحث کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لئے عربی زبان کیوں اختیار کی گئی۔ کیوں فارسی، سنسکرت یا کوئی اور زبان اختیار نہ کی گئی؟

پہلی تعلیموں کے نقائص کا اصولی ردّ اور صحیح اصول کا بیان

(۲۱) پھر جب قرآن کریم ساری دنیا کے لئے آیا ہے اور تمام پہلی مذہبی تعلیموں کا قائم مقام ہے تو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ان تعلیموں میں جو نقائص تھے ان کو اصولی طور پر قرآن کریم نے دور کر دیا ہے اور ان کی جگہ صحیح اصول قائم کئے ہیں۔

قرآن کریم کی سچائی کے ثبوت

(۲۲) پھر قرآن کریم کی سچائی کے ثبوت بھی پیش کرنے ہونگے کہ اس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کے یہ یہ ثبوت ہیں۔

قرآن کریم کے اثرات

(۲۳) قرآن کریم کے اثرات پر بھی بحث کرنی ہوگی۔

متشابہات کا حل

(۲۴) آیات متشابہات کو حل کرنا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم یہ تو کہتا ہے کہ اس میں کچھ آیات متشابہات ہیں مگر یہ نہیں بتاتا کہ کون کون سی ہیں۔ جب تک ان آیات کا پتہ نہ ہو سارے قرآن کو متشابہات کہنا پڑے گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی ایسا علم عطا فرمایا ہے کہ معمولی سے معمولی علم رکھنے والے کے لئے بھی متشابہات کا پتہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا اور نیز یہ کہ آیات متشابہات قرآن کریم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہیں۔

حروفِ مقطّعات کا حل

(۲۵) حروفِ مقطّعات پر بحث کرنی بھی ضروری ہے کہ ان کی کیا ضرورت اور غرض ہے؟

سات قرأتوں سے کیا مراد ہے

(۲۶) یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی سات قرأتیں ہیں ان سے کیا مراد ہے؟ یہ بحث بھی ضروری ہے۔

خلقِ قرآن کا مسئلہ

(۲۷) کلامِ الٰہی کو خدا تعالیٰ کے علم سے کیا نسبت ہے۔ پہلے زمانہ میں اس پر بہت بڑی بحث ہوئی ہے۔ اور بڑے بڑے علماء کو خلقِ قرآن کے مسئلہ پر ماریں پڑی ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو عباسی خلیفہ نے مار مار کر اتنا چور کر دیا کہ وہ فوت ہو گئے۔ غرض خلقِ قرآن کے مسئلہ پر بھی بحث ضروری ہے یعنی خدا کے کلام کو خدا سے کیا نسبت ہے۔

قرآن کریم ایک زندہ کتاب ہے

(۲۸) پھر ایک بحث یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم ایک زندہ کتاب ہے۔ کسی کتاب کی پیشگوئیاں بتا دینا کہ وہ پوری ہو رہی ہیں اس کی زندگی کا ثبوت نہیں۔ تورات اور انجیل کی بعض پیشگوئیاں بھی اب تک پوری ہو رہی ہیں۔ لیکن ان کتب سے وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا جو ان کے نازل ہونے کے وقت مدنظر تھا۔ مگر قرآن کریم آج بھی وہ مقصد پورا کر رہا ہے جسے لیکر وہ نازل ہوا تھا۔

قرآن کریم کِن کِن علوم کا ذکر کرتا ہے

(۲۹) پھر یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کِن کِن علوم کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی سوال یہ ہے کہ مذہب کو کہاں تک دوسری بحثوں سے تعلق ہے۔ اخلاق، سیاست، تمدن وغیرہ مذہب میں شامل ہیں یا نہیں۔

قرآن ذوالمعارف ہے

(۳۰) یہ بحث بھی ضروری ہے کہ قرآن ذوالمعارف ہے اور یہ اس کی خوبی ہے نقص نہیں کہ ایک آیت کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں۔

قرآن کامل کتاب ہے

(۳۱) اس بات پر بحث کرنی بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کامل کتاب ہے اور اب کسی اور آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں۔ مگر اس کے باوجود سنت اور حدیث کی ضرورت ہے اور اس سے قرآن کریم کے کمال میں نقص پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی فصاحت

(۳۲) قرآن کریم جو فصیح ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ وہ کس طرح بے مثل ہے اور کیوں کوئی اس کی مثل نہیں لاسکتا۔

قرآن کریم کا دوسری الہامی کتب سے مقابلہ

(۳۳) قرآن اور دوسری کتابوں کی تعلیم کا مقابلہ بھی ضروری ہے۔

ایک بے نظیر روحانی، جسمانی، تمدنی اور سیاسی قانون

(۳۴) اجمالی طور پر اس امر پر بحث کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم بے نظیر روحانی، جسمانی، تمدنی اور سیاسی قانون ہے۔

قرآن کریم کے استعارات

(۳۵) قرآن کریم میں استعارات کیوں آئے ہیں۔ ان کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوال بھی

قابلِ حل ہے۔

تراجمِ قرآن کی ضرورت

(۳۶) یہ بھی کہ قرآن کو ترجمہ کے ساتھ شائع کرنا کیوں ضروری ہے؟

حفاظتِ قرآن کے ذرائع

(۳۷) قرآن کریم کی حفاظت کا جو دعویٰ کیا گیا ہے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ اس دعویٰ کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے گئے ہیں۔

قرآن کریم کو شعر کیوں کہا گیا ہے

(۳۸) قرآن کریم کو جو اس زمانہ کے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک شاعر کا کلام ہے اور قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے [۲] اس کا کیا مطلب ہے۔ یعنی قرآن میں شعر کا کیا مفہوم ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ قرآن کریم کے متعلق کہتا ہے کہ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں تو اس کا کیا مطلب ہے۔

قرآن کریم آہستہ آہستہ کیوں نازل ہوا

(۳۹) یہ بحث بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں نازل ہوا۔ کیوں نہ ایک ہی دفعہ نازل ہو گیا۔

قرآن کریم کا کوئی ترجمہ اس کے سارے مضامین پر حاوی نہیں ہو سکتا

(۴۰) یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کا کوئی ترجمہ اس کے سارے مضامین پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کے تمام الفاظ الہامی ہیں

(۴۱) یہ بحث بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے وہی الفاظ ہیں جو خدا تعالیٰ نے نازل کئے یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو خیال آیا، اسے آپ نے اپنے لفظوں میں لکھوا دیا؟

یورپ اس دوسری صورت کو ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگاتا ہے۔ وجہ یہ کہ انجیل کے نسخوں میں چونکہ اختلاف ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ الفاظ الہامی نہیں بلکہ مطلب الہامی ہے۔ اگر الفاظ میں اختلاف ہے تو کوئی حرج نہیں۔ کہتے ہیں کسی گیدڑ کی دُم کٹ گئی تھی۔ اس نے سب گیدڑوں کو جمع کر کے تحریک کی کہ ہر ایک کو اپنی دُم کٹوا دینی چاہئے۔ اس نے دُم کے کئی ایک نقصان بتائے۔ کئی گیدڑ اس کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ایک بوڑھے گیدڑ نے کہا کہ پہلے دُم کٹانے کی تحریک کرنے والا اُٹھ کر دکھائے کہ اس کی اپنی دُم ہے یا نہیں۔ اگر اس کی دُم پہلے ہی کٹی ہوئی ہے تو معلوم ہوا کہ وہ سب کو اپنے جیسا بنانا چاہتا ہے۔ یہی حال یورپ والوں کا ہے۔ ان کی انجیلوں میں چونکہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ قرآن کے متعلق بھی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے الفاظ الہامی نہیں۔

قرآن کریم ہر قسم کے شیطانی کلام سے مُنزّہ ہے

(۴۲) یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ قرآن کریم میں کوئی شیطانی کلام بھی شامل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا سامان مسلمانوں نے ہی بہم پہنچایا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر نَعُوذُ بِاللّٰہِ بعض شیطانی فقرے جاری ہو گئے تھے جن کے متعلق جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ یوروپین لوگ کہتے ہیں مخالفین کو خوش کرنے کے لئے آپؐ نے کچھ کلمات کہے تھے لیکن بعد میں ان پر پچھتائے اور کہہ دیا کہ منسوخ ہو گئے ہیں۔ اس اعتراض کو بھی غلط ثابت کرنا ضروری ہے۔

قرآن کریم کے مخاطب کون تھے؟

(۴۳) ایک یہ بھی سوال ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب کون لوگ تھے۔ صرف اہل عرب یا ساری دنیا کے لوگ؟ اور پھر یہ بھی کہ شروع میں صرف اہلِ عرب مخاطب تھے اور بعد میں اور لوگ۔ یا سب کے سب شروع سے ہی مخاطب تھے؟

قرآن کریم کا ترجمہ لفظی ہونا چاہئے یا بامحاورہ

(۴۴) پھر یہ بھی ایک سوال ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ لفظی ہو یا بامحاورہ؟ عام طور پر لوگ لفظی ترجمہ پسند کرتے ہیں۔ مگر اس طرح عربی کی سمجھ آتی ہے۔ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ وجہ یہ کہ لفظ کے نیچے لفظ ہوتا ہے۔ اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُوپر کے عربی لفظ کا ترجمہ یہ ہے لیکن سارے فقرے کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ دونوں زبانوں کے الفاظ کے استعمال میں فرق ہے۔ لفظی ترجمہ کرنا ایسی ہی بات ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں۔ فلاں کی آنکھ بیٹھ گئی۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والا اگر یہ ترجمہ کرے کہ "HIS EYE HAD SAT" اور عربی میں یہ کرے کہ جلست عینہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ لفظی ترجمہ اصل مفہوم کو ظاہر نہیں کرے گا۔ کیونکہ آنکھ بیٹھنے کا جو مفہوم اردو میں ہے وہ دوسری زبانوں کے لفظی ترجمہ میں نہیں پایا جاتا۔ ترجمہ کی غرض چونکہ مطلب سمجھانا ہے اس لئے ایسا ہونا چاہئے کہ مطلب سمجھ میں آجائے، چاہے محاورہ بدلنا ہی پڑے۔

یہ سوالات ہیں جن پر مقدمہ قرآن میں بحث کی ضرورت ہے۔ ارادہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان امور پر بحث کروں۔

قرآن کریم پر مستشرقین یورپ کا حملہ

اب میں جماعت کو یہ بتاتا ہوں کہ قرآن کریم کی خدمت ایک نہایت اہم خدمت ہے۔ یورپین اقوام کا اسلام کے خلاف جس بات پر سب سے زیادہ زور ہے وہ یہی ہے کہ قرآن کریم کی اہمیت کو گرایا جائے۔ چنانچہ نولڈ کے جو جرمنی کا ایک مشہور مصنّف اور اسلام کا بہت بڑا دشمن ہے اور یورپ میں عربی زبان کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے اس نے انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں غلطیاں اور نقائص ثابت کرنے کے لئے یورپین مصنّفوں نے بڑا زور لگایا ہے مگر وہ

اپنی کوشش میں ناکام رہے ہیں۔ [۳] گویا خود تسلیم کرتا ہے کہ یوروپین مصنفوں نے قرآن کریم کے خلاف بڑا زور لگایا ہے مگر سب سے بڑھ کر قرآن کریم کے خلاف خطرناک کوشش ایک کتاب ہے جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور جس کا نام ہے۔ ''تین پُرانے قرآنوں کے صفحات'' ایک عورت نے جو ڈاکٹر آف فلاسفی ہے یہ کتاب لکھی ہے اور اس نے بیان کیا ہے کہ وہ مصر میں گئی جہاں اس نے ایک کتاب خریدی جو عیسائی کتابوں کی نقل تھی۔ جب اس کے صفحات پر بعض دوائیں لگائی گئیں تو نیچے سے اور حروف نمودار ہو گئے۔ ڈاکٹر منگانا نے اس کے متعلق بتایا کہ یہ ایک پُرانا قرآن ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں اور موجودہ قرآن میں فرق ہے۔ وہ کہتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن بگڑ چکا ہے۔

وہ اس کا ثبوت اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے جب قرآن نقل کیا تو باقی قرآنوں کو جلا دیا۔ چونکہ ان میں جو کچھ لکھا تھا اسے کوئی نقل نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اس وقت عیسائیوں نے بظاہر اپنے مذہب کی ایک کتاب لکھی لیکن دراصل خفیہ طور پر اس میں وہ قرآن نقل کیا جسے جلانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اب بعض قسم کی دوائیاں لگانے سے پوشیدہ لکھا ہوا قرآن ظاہر ہو گیا ہے۔

یہ ایک نہایت خطرناک چال ہے جو چلی گئی۔ اس کتاب کا پُرانا کاغذ دکھایا جاتا ہے۔ اس پر پُرانی تحریریں دکھائی جاتی ہیں اور ان سے مختلف قسم کے شبہات پیدا کئے جاتے ہیں۔

عیسائیوں کی مزوّرانہ چالیں

اس کے متعلق میں نے مفصل تحقیقات کی ہے جو آج پیش کرنا چاہتا تھا مگر اب نہ وقت ہے اور نہ موقع کیونکہ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ البتہ اس کے متعلق ایک لطیفہ سنا دیتا ہوں۔ وہ صفحات جو اس کتاب میں پرانے قرآن کے قرار دیکر شائع کئے ہیں۔ وہ اپنی غلطی آپ ظاہر کر رہے ہیں۔ مثلاً قرآن میں آتا ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ [۴] لیکن جو عیسائیوں کا لکھا ہوا قرآن ہے۔ اس میں آتا ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبَعَهٗ۔ کہ وہ اللہ پر

ایمان لاتا ہے اور اس کے کلمہ پر اور کلمہ سے مراد حضرت عیسیٰ لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ کے پیرو تھے۔

اس قسم کی چالیں اس میں چلی گئی ہیں۔ مگر باوجود اس قسم کی کوششوں کے یہی باتیں ان کو جھوٹا ثابت کر رہی ہیں۔ اوّل اس طرح کہ عیسائیوں کی طرف سے جو قرآن پیش کیا جاتا ہے اس کی وہی ترتیب ہے جو موجودہ قرآن کی ہے۔ اس لئے ان کا یہ کہنا انہی کے پیش کردہ قرآن سے غلط ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کے وقت قرآن کریم کی ترتیب بدل گئی تھی۔

پھر اس قرآن میں بعض ایسے الفاظ لکھے ہیں جو عربی کے ہیں ہی نہیں۔ مثلاً ایک جگہ علم کو ایلم لکھا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایسی غلطی کی ہے جس سے اس چور کا مشہور قصہ یاد آ جاتا ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نیا نیا چور بنا تھا۔ چوری کرنے کے بعد جب پولیس تحقیقات کے لئے آئی تو وہ خود بھی وہاں چلا گیا۔ اور تحقیقات میں مدد دینے لگ گیا۔ کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے چور ادھر سے آیا۔ یہاں سے اُترا اور پھر ادھر گیا۔ پولیس والوں نے تاڑ لیا کہ اس کا چوری میں ضرور دخل ہے۔ اس لئے اس سے ساری باتیں پوچھنے لگے اور جدھر وہ لے گیا اس کے ساتھ چل پڑے۔ آخر ایک دروازہ کے پاس جا کر کہنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے چور اس دروازہ سے نکلا اور اسے یہاں سے ٹھوکر لگی۔ اس پر گٹھڑی اندر اور میں باہر۔ اس موقع پر بے اختیار اس کے منہ سے میں نکل گیا۔ پولیس نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ یہی حال یہاں ہوا۔ قرآن کریم میں ایک آیت ہے وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا[۵] اللہ تعالیٰ نے ایسے لشکر اُتارے جن کو تم دیکھ نہیں رہے تھے۔ یہاں ھَا کی ضمیر جنود کی طرف جاتی ہے۔ مگر عیسائیوں کے پیش کردہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہاں جُنْدًا ہے مگر آگے ھَا ہی رکھا ہے اور ضمیر کو نہیں بدلا۔ غرض اس قسم کی بہت سی شہادتیں ہیں جن سے اس کے اندر سے ہی غلطیاں معلوم ہو جاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کسی نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے اسے لکھا اور اس میں غلطیاں کرتا گیا۔ چنانچہ وَاِذِ اسْتَسْقٰی کو ک کے ساتھ لکھا ہے۔

اسی طرح هُمُ السُّفَهَآءُ کو هُمُسُّفَهَا لکھ دیا۔ اسی طرح اور کئی الفاظ غلط لکھے ہیں۔ مثلاً اِنَّمَا النَّسِیٓءُ کو اِنَّمَا آلَ نَاسِیْ لکھا ہے۔ حالانکہ نَاسِی ان معنوں میں آتا ہی نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جاہل عیسائی قرآن کی نقل کرنے بیٹھا جسے عربی نہ آتی تھی اور اس قسم کی

غلطیاں کرتا گیا۔

اب میں قرآن کریم کے متعلق یوروپین مستشرقین کے بعض متفرق اعتراضات کا ذکر کرتا ہوں۔

قرآن کریم کا نزول چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں

یورپ کے مستشرق کہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم ٹکڑے ٹکڑے نازل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں۔ خدا کو کیا ضرورت تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کرتا۔ اسے تو اگلا پچھلا سب حال معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ بندہ کو ہی اگلے حالات کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ اگلی باتوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حالات پیش آتے جاتے تھے ان کے متعلق قرآن میں ذکر کر دیتے۔ پس یہ ان کا کلام ہے، خدا کا کلام نہیں۔

قرآن کریم نے خود اس سوال کو لیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً[۶] یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن اس رسول پر ایک ہی دفعہ کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو سوال عیسائیوں کو اب سُوجھا ہے یہی سوال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کفار نے بھی کیا تھا کہ ایک ہی دفعہ قرآن کیوں نہ اُترا۔ اس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا کہ كَذٰلِكَ اسی طرح اُترنا چاہئے تھا جس طرح اُتارا گیا ہے۔ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ[۷] اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم تیرے دل کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ گویا قرآن کا ٹکڑے ٹکڑے نازل ہونا خدا تعالیٰ کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سے اس کی شانِ بلند کا اظہار ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قرآن کے نازل ہونے سے دل کی مضبوطی کس طرح ہوتی ہے اس کے متعلق میں چند باتیں بتا دیتا ہوں۔

(۱) اگر ایک ہی دفعہ قرآن نازل ہو جانے پر اس سے استدلال کرتے رہتے تو دل کو ایسی تقویت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جیسی کسی امر کے متعلق فوراً کلام الٰہی کے اُترنے سے ہو سکتی ہے۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لطف اس میں آتا ہوگا کہ آپ کوئی کام کرتے اور اس کے متعلق وحی ہو جاتی اور خدا تعالیٰ اپنی مرضی اور منشاء کا اظہار کر دیتا۔ وہ لطف ہمیں اجتہاد سے کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی واقعہ پیش آتا، آپ پر اس کے متعلق کلامِ الٰہی نازل ہو جاتا اور اس طرح

معلوم ہو جاتا کہ اس کلام کا یہ مفہوم ہے۔ اگر آپ اجتہاد کر کے آیات کو کسی بات پر چسپاں کرتے تو وہ لطف نہ آتا جو اس صورت میں آتا تھا۔

(۲) قرآن کریم لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ کا مصداق اس طرح ہے کہ جو کتاب ساری دنیا کے لئے آئی ہو، اُسے محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔ اگر قرآن ایک ہی دفعہ سارے کا سارا اُترتا تو اسے وہی شخص حفظ کر سکتا تھا جو اس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دیتا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُترنے سے بہت لوگ اس کو یاد کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے دوسرے کاروبار کے ساتھ قرآن کریم بھی حفظ کرتے گئے۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس بات پر مضبوطی سے قائم ہو گیا کہ یہ کتاب ضائع نہیں ہوگی بلکہ محفوظ رہے گی۔ یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بہت کثرت سے ایسے لوگ تھے جنہیں قرآن کریم حفظ تھا مگر اب اس نسبت کے لحاظ سے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی وجہ سے بہت لوگ ساتھ کے ساتھ یاد کرتے جاتے تھے۔

(۳) تیسری حکمت تھوڑا تھوڑا نازل ہونے میں یہ ہے کہ ایک دفعہ سارا قرآن نازل ہونے کی وجہ سے لوگوں کے قلوب میں راسخ نہ ہو سکتا تھا۔ اب ایک ہندو جب مسلمان ہوتا ہے تو اسے اسلامی احکام پر عمل کرنے والے مسلمان نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ گھبراتا نہیں اور ان احکام پر عمل کرنا بوجھ نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کسی کو ہم ایک کتاب لکھ کر دے دیں کہ اس پر عمل کرو اور کوئی نمونہ موجود نہ ہو تو لوگ سو سال میں بھی اس پر عمل کرنا نہ سیکھ سکیں۔ پس قرآن کریم کی تعلیم کو راسخ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اسے آہستہ آہستہ نازل کیا جاتا۔ ایک حکم پر عمل کرنا جب لوگ سیکھ جاتے تو دوسرا نازل ہوتا۔ پھر تیسرا۔ اور اس طرح سارے احکام پر عمل کرایا جاتا۔

(۴) اگر ایک ہی وقت قرآن نازل ہوتا تو ترتیب وہی رکھنی پڑتی جو اَب ہے۔ لیکن یہ ترتیب اُس وقت رکھی جانی خطرناک ہوتی۔ جس طرح اب ہمارے لئے وہ ترتیب خطرناک ہے جس کے مطابق قرآن نازل ہوا تھا۔ اگر نماز اور روزوں وغیرہ کے احکام شروع میں ہوتے اور نبوت ثابت نہ ہو چکی ہوتی، تو وہ سمجھ میں ہی نہ آسکتے تھے۔ پس پہلے نبوت کو ثابت کرنے کی ضرورت تھی اور یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچانی چاہئے تھی کہ یہ سچا نبی ہے۔ اس کے بعد عمل کی دعوت کا موقع تھا جس کے لئے احکام سکھائے جاتے۔ مگر اب یہ ضروری نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کو

ماننے والی ایک جماعت موجود ہے۔اب جو شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو کر آتا ہے۔پس اس کے لئے قرآن کی اسی ترتیب کی ضرورت ہے جو اَب ہے۔لیکن قرآن کے ایک ہی دفعہ اکٹھا نازل ہونے سے یہ نقص پیش آتا۔

(۵) اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہوتا تو ایک حصہ میں دوسرے حصہ کی طرف اشارہ نہیں ہوسکتا تھا۔مثلاً قرآن کریم میں یہ پیشگوئی تھی کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر صحیح وسلامت لے جائیں گے۔اگر ایک ہی دفعہ سارا قرآن نازل ہوجاتا تو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ لے جایا گیا اس وقت یہ نہ کہا جاسکتا کہ دیکھو اسے ہم دشمنوں کے نرغہ سے بچا کر لے آئے ہیں۔یہ اسی صورت میں کہا جاسکتا تھا کہ پہلے ایک حصہ نازل ہوتا جس میں رسول کریم ﷺ کو صحیح وسلامت لے جانے کی پیشگوئی ہوتی۔پھر جب یہ پیشگوئی پوری ہوجاتی اس وقت وہ حصہ اُترتا جس میں اس کے پورا ہونے کے متعلق اشارہ ہوتا۔

(۶) میرے نزدیک ایک اور اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ کسی اور نے بنا کر دیا ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں اس اعتراض کا ذکر بھی آتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ [۸]

یعنی کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ایک جھوٹ ہے جو اس نے بنالیا ہے۔اور اس کے بنانے پر ایک اور قوم نے اس کی مدد کی ہے۔اگر قرآن اکٹھا ملتا تو مخالف یہ کہہ سکتے تھے کہ کسی نے بنا کر یہ کتاب دے دی ہے۔اب کچھ حصہ مکہ میں نازل ہوا کچھ مدینہ میں۔مکہ والے اگر کہیں کہ کوئی بنا کر دیتا ہے تو مدینہ میں کون بنا کر دیتا تھا۔پھر قرآن مجلس میں بھی نازل ہوتا،اس وقت کون سکھاتا تھا۔پھر قرآن سفر میں بھی نازل ہوتا۔ایسا کون شخص تھا جو ہر لڑائی میں شامل ہوا،کوئی بھی نہیں۔غرض قرآن سفر اور حضر میں، رات اور دن میں، مکہ اور مدینہ میں، مجلس اور علیحدگی میں نازل ہوا اور اس طرح اعتراض کرنے والوں کا جواب ہوگیا کہ قرآن کوئی اور انسان بنا کر آپ کو نہیں دیتا تھا۔ورنہ اگر اکٹھی کتاب نازل ہوتی تو کہا جاتا کہ کوئی شخص کتاب بنا کر دے گیا۔جسے سنا دیا جاتا ہے مگر اب جب کہ موقع اور محل کے مطابق آیات اُترتی رہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہر موقع پر کوئی بنا کر دے

دیتا ہے۔ پس قرآن کا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُترنا ثبوت ہے لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ کا۔

جمع قرآن پر اعتراضات

ایک اعتراض جمع قرآن کے متعلق کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہیں وہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ:

(۱) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو جس قدر کام ہوتے تھے اور جس طرح وہ لڑائیوں اور شورشوں میں گھرے ہوئے تھے ایسی حالت میں انہیں قرآن صحیح طور پر کہاں یاد رہ سکتا تھا۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ مگر یہ غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا حافظہ اچھا نہیں ہوتا تھا جو اس سے ظاہر ہے کہ ان کی ان نظموں میں اختلاف ہے جو پہلے شاعروں کی ہیں۔ کوئی کسی طرح بیان کرتا ہے اور کوئی کسی طرح۔ اس سے معلوم ہوا کہ عربوں کے حافظے اچھے نہ تھے ورنہ اختلاف کیوں ہوتا۔

(۳) قرآن رسول کے زمانہ میں پورا نہیں لکھا گیا۔ اگر پورا لکھا جاتا تو حافظوں کے مارے جانے پر قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ کیوں ظاہر کیا جاتا۔

(۴) قرآن میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ[۹] یعنی وہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ کہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے پیدا ہو گئے تھے۔

(۵) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خود پڑھے لکھے نہ تھے اس لئے انہوں نے قرآن لکھنے کے لئے کاتب رکھے ہوئے تھے اور وہ جو چاہتے لکھ دیتے۔

(۶) لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن کے پڑھنے میں بڑا اختلاف ہو گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں قرآن کے متعلق اختلاف موجود تھا۔

(۷) حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت کے قرآن کی جتنی کاپیاں تھیں وہ جلوا دی تھیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ان میں اختلاف تھا اس قرآن سے جو عثمانؓ نے لکھوایا۔ اگر اختلاف نہیں تھا تو ان کو کیوں جلوایا گیا۔

(۸) قرآن کریم کی اصلیت پر صرف زید گواہ ہے۔ مگر اس کا تو فرض تھا کہ قرآن لکھے۔ اس پر بھروسہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

(۹) اگر حضرت ابوبکرؓ کے وقت کے قرآن کی کاپی درست تھی تو پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں دوبارہ لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کی کاپیوں کو غلط سمجھا گیا۔

(۱۰) حضرت عثمانؓ پر الزام لگایا گیا ہے کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو بہت سے قرآن تھے۔ لیکن جب وہ فوت ہوئے تو پیچھے صرف ایک قرآن چھوڑا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف والے قرآنوں کو جلا دیا گیا تھا۔

مخالفین کے اعتراضات کے جوابات

اب میں ان اعتراضوں کا جواب دیتا ہوں۔

پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو اتنے کاموں اور شورشوں میں قرآن کریم یاد کس طرح رہ سکتا تھا۔ یہ ایسا سوال ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک واقعہ کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ جب واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم آپ کو یاد رہا اور شب و روز نمازوں میں سنایا جاتا رہا تو اس کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے سامنے پروفیسر مارگولیتھ نے یہ اعتراض کیا کہ اتنا بڑا قرآن کس طرح یاد رہ گیا۔ میں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تو قرآن اُترا تھا اور آپؐ کے سپرد ساری دنیا کی اصلاح کا کام کیا گیا تھا آپؐ اسے کیوں یاد نہ رکھتے؟ میرے ایک لڑکے نے گیارہ سال کی عمر میں قرآن یاد کر لیا ہے۔ اور لاکھوں انسان موجود ہیں جنہیں سارے کا سارا قرآن یاد ہے۔ جب اتنے لوگ اسے یاد کر سکتے ہیں تو کیا وہی نہیں کر سکتا تھا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ عرب کے لوگوں کا حافظہ اچھا نہ تھا، کیونکہ وہ پرانی نظموں میں اختلاف کرتے ہیں۔ اس کے متعلق اوّل تو میں کہتا ہوں کہ یہ شتر مرغ والی مثال ہے۔ ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ عربوں کو پرانے قصیدے یاد ہوتے تھے جن میں اختلاف ہوتا تھا۔ اور دوسری طرف

مارگولیتھ کہتا ہے کہ پرانے زمانہ میں قصیدے تھے ہی نہیں یوں ہی بنا کر پہلے لوگوں کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ گویا جس پہلو سے اسلام پر اعتراض کرنا چاہا وہی سامنے رکھ لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ عربوں کے ایسے حافظے ہوتے تھے کہ مشہور ہے ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جس شاعر کو ایک لاکھ شعر یاد نہ ہوں وہ میرے پاس نہ آئے۔ اس پر ایک شاعر آیا اور اس نے آکر کہا میں بادشاہ سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ اسے بتایا گیا کہ بادشاہ سے ملنے کے لئے ایک لاکھ شعر یاد ہونے ضروری ہیں۔ اس نے کہا بادشاہ سے جا کر کہہ دو وہ ایک لاکھ شعر اسلامی زمانہ کا سننا چاہتا ہے یا زمانہ جاہلیت کا۔ عورتوں کے سننا چاہتا ہے یا مردوں کے۔ میں سب کے اشعار سنانے کے لئے تیار ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ فوراً باہر آ گیا۔ اور آکر کہا کیا آپ فلاں شاعر ہیں۔ اس نے کہا ہاں میں وہی ہوں۔ بادشاہ نے کہا اسی لئے میں نے یہ اعلان کیا تھا کہ آپ میرے پاس آتے نہ تھے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس اعلان پر جوش کی وجہ سے آپ آجائیں۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ عربوں کے حافظے اچھے نہ تھے۔ رہی یہ بات کہ شعروں میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ جو شعر یاد رکھتے تھے وہ انہیں الہامی کتاب کے شعر سمجھ کر نہیں یاد کرتے تھے بلکہ ان کا مطلب اخذ کر لیتے تھے۔ مگر قرآن کو تو خدا کا کلام سمجھ کر یاد کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس کا ایک لفظ بھی آگے پیچھے نہ کرتے تھے۔ پھر شعر جو وہ یاد کرتے تھے وہ استادوں سے پڑھ کر یاد نہ کرتے تھے بلکہ جس سے سنتے یاد کر لیتے۔ اور ہر شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ صحیح الفاظ ہی یاد کرائے۔ لیکن اسلامی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن لکھنے کے متعلق اور قرآن یاد کرنے کے متعلق خاص قواعد مقرر تھے اور قرآن یاد کرانے کے لئے چار آدمی مقرر تھے۔ اور اس میں اتنی احتیاط کی جاتی تھی کہ ایک دفعہ نماز میں حضرت علیؓ نے پڑھنے والے کو لقمہ دے دیا تو انہیں منع کیا گیا اور کہا گیا کہ آپ اس کام کے لئے مقرر نہیں۔ غرض قرآن کریم کے بارہ میں اتنی احتیاط کی گئی تھی کہ چار آدمی اس کام کے لئے مقرر تھے حالانکہ قرآن جاننے والے ہزاروں تھے۔ اس کے مقابلہ میں شاعروں کی طرف سے کون سے لوگ مقرر تھے جو شعر یاد کراتے تھے۔ امرأ القیس نے کسے مقرر کیا تھا کہ اس کے اشعار لوگوں کو یاد کرایا کرے۔ مگر قرآن یاد کرانے کے متعلق تو استاد در استاد بات چلی آرہی ہے۔

سوم: ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پورا قرآن نہ لکھا گیا

تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یقیناً سارا قرآن لکھا گیا۔ جیسا کہ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ جب کوئی حصہ نازل ہوتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے والوں کو بلاتے اور فرماتے اسے فلاں جگہ داخل کرو۔ جب یہ تاریخی ثبوت موجود ہے تو پھر یہ کہنا کہ قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت پورا نہ لکھا گیا تھا بے وقوفی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں کیوں لکھا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن اس طرح ایک جلد میں نہ تھا جس طرح اب ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ قرآن محفوظ نہیں۔ اس لئے انہوں نے اس بارے میں حضرت ابوبکرؓ سے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے کہ اِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَاْمُرَ جَمْعَ الْقُرْاٰنِ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کرنے کا حکم دیں۔ یہ نہیں کہا کہ آپ اس کی کتابت کرالیں۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے زیدؓ کو بلا کر کہا کہ قرآن جمع کرو۔ چنانچہ فرمایا اِجْمَعْهُ اسے ایک جگہ جمع کردو۔ یہ نہیں کہا کہ اسے لکھ لو۔ غرض الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ اس وقت قرآن کے اوراق کو ایک جلد میں اکٹھا کرنے کا سوال تھا۔ لکھنے کا سوال نہ تھا۔

چہارم: یہ اعتراض تھا کہ قرآن کریم میں بعض لوگوں کے متعلق اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ آیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں پر ویسا ہی عذاب نازل کرے گا۔ جیسا ان لوگوں پر کیا جو قرآن کے بعض حصوں پر عمل کرتے ہیں اور بعض پر نہیں کرتے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کافروں اور منافقوں کا ذکر ہے۔ اور اگر یہی معنے کئے جائیں کہ قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے تھے تو یہ بھی ہمارے لئے مفید ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اس وقت جمع تھا۔ اس لئے دشمن اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے تھے۔ مسلمانوں کے پاس قرآن محفوظ تھا مگر منافق اس کے ٹکڑے ٹکڑے رکھتے تھے۔

پنجم: یہ جو کہا جاتا ہے کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ اس لئے کاتب جو چاہتے لکھ دیتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے ہی اس کا انتظام کر لیا تھا۔ اور وہ یہ کہ جب وحی نازل ہوتی تو کاتب کو کہتے لکھ لو اور چار آدمیوں کو کہتے یاد کر لو۔ اس طرح لکھنے

والے کی غلطی یاد کرنے والے درست کرا سکتے تھے۔ اور یاد کرنے والوں کی غلطی لکھنے والا بتا سکتا تھا۔ فرض کرو لکھنے والے نے لفظ غلط لکھ لیا مگر یاد کرنے والے اس غلطی کے ساتھ کیونکر متفق ہو سکتے تھے، اس طرح فوراً غلطی پکڑی جا سکتی تھی۔

ششم: یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے وقت قرآن کے پڑھنے میں بہت اختلاف ہو گیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی صحیح روایت سے یہ پتہ نہیں لگتا کہ حضرت عثمانؓ کے وقت قرآن کے متعلق اختلاف ہو گیا تھا۔ بلکہ صاف لکھا ہے کہ قرأت میں اختلاف تھا۔ اور حدیثوں سے ثابت ہے کہ سات قرأتوں پر رسول کریم ﷺ نے قرآن پڑھا۔ چونکہ بعض قوموں کے لئے بعض الفاظ کا ادا کرنا مشکل تھا۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلایا جاتا کہ ان الفاظ کو اس طرح بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اس بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں بلا کر کہا کہ مختلف قبائل کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قرأت صحیح ہے اور اس پر جھگڑا پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ ہونا چاہئے۔ حضرت علیؓ نے کہا آپ ہی فیصلہ کر دیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ مسلمان ہو کر اب سب ایک ہو گئے ہیں اس لئے ایک ہی قرأت ہونی چاہئے اور وہ قریش والی قرأت ہے۔

ہفتم: اگر قرأتوں میں اختلاف نہ تھا تو حضرت ابوبکرؓ کے وقت کے قرآن جلائے کیوں گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی صریح طور پر غلط ہے۔ وہاں تو یہ لکھا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا قرآن تھا۔ وہ ان سے منگوایا گیا اور کہا گیا کہ نقل کرنے کے بعد واپس کر دیں۔ چنانچہ واپس کر دیا گیا۔ اور جلائے مختلف قرأتوں والے قرآن گئے تھے تاکہ قرأتوں کا اختلاف نہ رہے۔

ہشتم: یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآن کی اصلیت پر صرف زیدؓ کی گواہی ہے، یہ بھی غلط ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے زیدؓ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رکھا اور مسجد کے دروازہ پر بٹھا دیا۔ اور حکم دیا کہ کوئی تحریر ان کے پاس ایسی نہ لائی جائے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی نہ ہو اور جس کے ساتھ دو گواہ نہ ہوں جو یہ کہیں کہ ہمارے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لکھوائی تھی۔

نہم: ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اختلاف نہیں تھا تو حضرت عثمانؓ کے وقت دوبارہ تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرأتوں کی تحقیق کرائی گئی تھی عبارتوں اور سورتوں کی تحقیق نہیں کروائی گئی۔

دہم: اس طرح یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر اختلاف نہ تھا تو ایک کے سوا باقی کاپیاں کیوں جلائی گئیں۔ اس کا بھی وہی جواب ہے کہ مختلف قرأتوں والی کاپیاں جلائی گئی تھیں۔ پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے کے وقت بہت قرآن تھے مگر ان کے بعد ایک رہ گیا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ انہوں نے مختلف قرأتوں کو اڑا دیا اور پھر جن قوموں کی قرأتوں کو مٹایا گیا انہوں نے یہ اعتراض کیا۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں تھا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

محکمات اور متشابہات

اب میں متشابہات کے متعلق مختصر طور پر کچھ بیان کر دیتا ہوں۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی، پھر قرآن کا کیا اعتبار رہا۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کے متشابہات پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ[10] کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس قرآن کو اپنے رسول پر اُتارا۔ اس میں کچھ تو محکمات ہیں جو اُمّ الکتاب ہیں اور کچھ متشابہات ہیں۔

اس کے متعلق لوگ کہتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ کونسی آیت محکم ہے اور کونسی متشابہ۔ اس کے مقابلہ میں سورۃ ہود میں آتا ہے۔ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ[11] کہ یہ کتاب وہ ہے جس کی ساری آیات محکمات ہیں۔ اس سے بظاہر اُوپر کی بات غلط ہوگئی کہ قرآن کی بعض آیات متشابہ ہیں اور بعض محکم۔ تیسری جگہ آتا ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ[12] یعنی خدا ہی ہے جس نے بہتر سے بہتر بات یعنی وہ کتاب

نازل فرمائی ہے جو متشابہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی ساری آیتیں ہی متشابہ ہیں۔ حالانکہ پہلے ساری آیات کو محکم قرار دیا گیا تھا۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ محکم اور متشابہ کا مطلب اور تھا جو سمجھا نہیں گیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ متشابہ کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ جس سے شکوک پیدا ہوں۔ حالانکہ قرآن متشابہ کی یہ تفسیر کرتا ہے۔ مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ [13] کہ اس کے مضامین نہایت اعلیٰ ہیں اور جو لوگ اس کتاب کو سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے جسم کا رواں رواں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یعنی ان کے قلوب میں خدا تعالیٰ کی محبت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اب بتاؤ۔ کیا کسی شکی بات سے اس طرح ہو سکتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ متشابہ کا اور مطلب ہے اور وہ یہ کہ متشابہ کے معنی ہیں جو دوسری سے ملتی ہو۔ یعنی متشابہ وہ تعلیم ہے جو پہلی تعلیموں سے ملتی جلتی ہو۔ مثلاً روزہ رکھنا ہے۔ یہ حکم اپنی ذات میں متشابہ ہے کیونکہ یہ تعلیم پہلے بھی پائی جاتی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ [14] پس مجرد روزہ رکھنے کا حکم متشابہ ہے۔ اسی طرح قربانیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا [15] یعنی ہر قوم کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریق مقرر کیا ہے۔ پس قربانی کا حکم بھی متشابہ ہے۔ دراصل قرآن نے اس میں ان لوگوں کو جواب دیا ہے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ قرآن نے دوسری کتابوں سے چوری کر کے سب کچھ پیش کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کچھ تعلیمیں تو جدید ہیں اور کچھ تعلیمیں ایسی ہیں جو لازماً پچھلی تعلیموں سے ملنی چاہئیں۔ مثلاً پہلے نبیوں نے کہا سچ بولا کرو۔ کیا قرآن یہ کہتا ہے کہ سچ نہ بولا کرو۔ جھوٹ بولا کرو؟ غرض فرمایا قرآن میں بعض تعلیمیں ایسی ہیں جو پہلی تعلیموں سے ملتی ہیں۔ مگر آگے فرماتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ [16] بیوقوف لوگ جدید تعلیموں پر نظر نہیں ڈالتے اور پہلی تعلیموں سے ملتی جلتی تعلیموں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ قرآن

نے یہ نقل کی ہے۔ وہ محض فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے اور اس کتاب کو اس کی حقیقت سے پھیر دینے کے لئے ایسا کرتے ہیں وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ حالانکہ ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور وہی سمجھ سکتا ہے کہ کتنی تعلیم دوبارہ نازل کرنی ضروری ہے۔ انسان کے ہاتھ میں اس نے یہ کام نہیں رکھا۔ کیونکہ گو وہ تعلیم پہلے نازل ہو چکی ہوتی ہے مگر پھر بھی اس کی وہ مقدار جو آئندہ کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ خدا تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اور یا پھر خدا تعالیٰ کے علم دینے کے بعد وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی کتب کا حقیقی علم رکھنے والے ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ کس حد تک اس تعلیم کو قائم رکھا جانا ضروری تھا اور کسی امر کو کیوں بدلا گیا؟

اس کی اور تشریحات صحیحہ بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر ان میں محکم اور متشابہ کو معین نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی آیت ایک وقت میں محکم اور ایک وقت میں متشابہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جو آیت کسی کی سمجھ میں آ گئی وہ محکم ہو گئی اور جو نہ آئی متشابہ ہو گئی مگر پھر اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک معنی کے لحاظ سے کسی آیت کو محکم قرار دے دے اور دوسرا اسے درست نہ سمجھتے ہوئے اسے متشابہ کہہ دے مگر ان معنوں میں محکم آیات بالکل ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ تعلیماتِ قرآنیہ جو پہلی کتب سے زائد ہیں وہ سب محکم ہیں اور دوسری متشابہ۔

سارے قرآن کو محکم اور سارے قرآن کو متشابہ کیوں کہا گیا ہے

باقی رہا یہ سوال کہ پھر ایک جگہ سارے قرآن کو محکم اور دوسری جگہ سارے قرآن کو متشابہ کیوں کہا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قرآن کریم کی اصطلاح میں محکم تعلیم وہی ہے جس میں قرآن کریم نے تجدید کی ہے۔ اور جس امر میں وہ پہلی کتب سے ملتا ہے وہ متشابہ ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے سارا ہی قرآن محکم ہے۔ کیونکہ اصولاً کسی تعلیم کو دیکھتے ہوئے اس کے کسی ایک ٹکڑے کو نہیں بلکہ مجموعہ کو دیکھتے ہیں۔ اور احکام کی مختلف اجناس کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اسلامی تعلیم بالکل جُدا ہے۔ کسی حصہ تعلیم میں بھی اس نے اصلاح کو ترک نہیں کیا۔ اور وہ پہلی کتب کے بالکل مشابہ نہیں ہے، اس لئے وہ سب محکم ہے۔ لیکن اسی طرح چونکہ سب اصول شریعت کا پہلی کتب میں پہلے لوگوں کے درجہ کے مطابق نازل ہونا بھی ضروری تھا تاکہ پہلے زمانہ

کے لوگ بھی اپنے اپنے دائرہ میں تکمیل حاصل کریں اس لئے ہر قسم کے احکام جو قرآن کریم میں ہیں کسی نہ کسی صورت میں پہلی کتب میں بھی موجود ہیں اس لحاظ سے قرآن کریم سب کا سب متشابہ ہے۔ نماز بھی پہلے مذاہب میں ہے۔ روزہ بھی ہے۔ حج بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور اس تشابہ کو دیکھ کر بعض لوگ دھوکے میں پڑ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا پھر کیا فائدہ ہوا۔ عیسائیوں میں سے ''ینابیع الاسلام'' وغیرہ کتابوں کے مصنف اسی گروہ میں شامل ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی دوسری کتب سے مشابہت ثابت کر کے قرآن کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے پہلے سے اس اعتراض کا ذکر کر کے اس کا نہایت واضح جواب دے دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ ایک زبردست حقیقت بتائی ہے کہ ہر ایک آسمانی صحیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر کچھ محکم ہو اور کچھ متشابہ۔ متشابہ اس لئے کہ جو صحیفہ پہلی تعلیمات سے بکلّی جدا ہو جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے یہ معنی ہونگے کہ اس سے پہلے کوئی شخص خدا کا برگزیدہ ہوا ہی نہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے کسی کو ہدایت دی ہی نہیں، اور یہ باطل ہوگا۔ اور محکم اس لئے کہ اگر وہ کوئی جدید خوبی دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا تو اس کی آمد کی ضرورت کیا ہے، پہلی تعلیم تو موجود ہی تھی۔ اور کون ہے جو اس اصل کی خوبی کا انکار کر سکے یا اس کی سچائی کو رد کر سکے۔

مفسرین نے محکم اور متشابہ کی تاویل میں بہت کچھ زور لگایا ہے۔ مگر اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے بہت کچھ دھوکا کھایا ہے۔

اب چونکہ سردی بڑھ رہی ہے اور بادل بھی گھرے ہوئے ہیں اس لئے میں اسی پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ آپ لوگوں کو قرآن کریم کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(اس تقریر کے بعد حضور نے تمام مجمع کے ساتھ مل کر دُعا کی اور پھر خدا تعالیٰ کے حضور اس امر پر سجدہ شکر ادا کیا کہ اس نے حضور کو کمزوری صحت کے باوجود جلسہ میں شامل ہو کر تقریر کرنے اور پھر سب کے ساتھ مل کر دُعا کرنے کی توفیق بخشی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ)

---

۱ الانعام:۲۶ ۲ الحاقّة:۴۲

۳ The Encyclopaedia Britannica Vol 15th P.905
Published 1911ء

۴ الاعراف:۱۵۹ ۵ التوبة:۲۶

۶،۷ الفرقان:۳۳

۸ الفرقان:۵ ۹ الحجر:۹۲ ۱۰ أل‌عمران:۸

۱۱ هود:۲

۱۲،۱۳ الزمر:۲۴

۱۴ البقرة:۱۸۴

۱۵ الحج:۳۵ ۱۶،۱۷ أل‌عمران:۸

فضائل القرآن

نمبر......۲

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النَّـــــــــاصِرُ

فضائل القرآن

(نمبر......۲)

قرآن کریم کی کتب سابقہ پر افضلیت کے عقلی اور نقلی شواہد

(فرمودہ ۲۹ ر دسمبر ۱۹۲۹ء بر موقع جلسہ سالانہ قادیان)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے سورۃ نور کی ان آیات کی تلاوت فرمائی۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳۶﴾ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۷﴾ رِجَالٌ ۙ

لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۸﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ [1]

اس کے بعد فرمایا:

اسلام کا مغز اور اس کی جان

یہ مضمون جس کے متعلق میں اس وقت کچھ بیان کرنے لگا ہوں نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اور درحقیقت یہ اسلام کا مغز اور اس کی جان ہے۔ اور دوستوں کا فرض ہے کہ وہ اسے پورے غور اور توجہ کے ساتھ سنیں اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔ یہ مضمون فضائل قرآن کریم کے متعلق ہے یعنی قرآن کریم میں وہ کونسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے دوسرے مذاہب کی کتابوں پر اسے فضیلت دی جاسکتی ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ قرآن کریم پر ہمارے مذہب کا دارومدار ہے۔ اگر خدانخواستہ قرآن کریم میں ہی کوئی نقص ثابت ہو جائے یا اس میں غیر معمولی خوبیاں ثابت نہ ہوں تو اسلام کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ پس یہ ایک نہایت ہی نازک مسئلہ ہے جس پر حملہ کرنے سے اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔

میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم سے باہر نہیں سمجھتا۔ آپ بھی قرآن کا جزو ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. [2] یعنی یہ قرآن یقیناً ربّ العالمین خدا کی طرف سے اُتارا گیا ہے۔ یہ قرآن رُوْحُ الْاَمِيْن لے کر تیرے دل پر نازل ہوا ہے تا کہ تُو انذار کرنے والوں کی مقدس جماعت میں شامل ہو جائے۔ پس ایک قرآن لفظوں میں نازل ہوا ہے اور ایک قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہر پر نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ درحقیقت قرآن کریم پر ہی حملہ ہوگا۔

تمام ادیان اور کتب الہامیہ پر قرآن کریم کی فضیلت

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم ساری دنیا کے لئے اور سارے زمانوں کے لئے ہے۔ اب اگر قرآن کریم ساری دنیا اور سارے زمانوں کے لئے ہے تو ہماری اس کے متعلق ذمہ داری بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ قرآن کریم صرف عرب کے لئے ہوتا اور صرف ایک زمانہ کے مفاسد دور کرنے کے لئے آتا۔ عربوں کے پاس کوئی شریعت نہ تھی کوئی مذہبی کتاب نہ تھی۔ وہ خیالی باتوں پر یا قومی رسم و رواج پر عمل کرتے تھے۔ ان کے متعلق ہمارے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ عرب چونکہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھے قرآن کریم نے انہیں ان برائیوں سے روک دیا اس وجہ سے اس کی ضرورت تھی۔ پس اگر عرب ہی کے لئے قرآن ہوتا تو قرآن کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم ساری دنیا کے لئے آیا ہے اور یہودی، مسیحی، ہندو، پارسی وغیرہ سب اس کے مخاطب ہیں اور تمام دوسری کتابیں جن کو الہامی درجہ دیا جاتا ہے یا وہ کتابیں جن کا پتہ آثار قدیمہ سے لگا ہے ان سب سے افضل ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ پہلی تمام کتابوں پر مقدم اور ان سے افضل ہے۔ قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو تورات میں نہیں۔ قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو پرانے صحیفوں میں نہیں۔ قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو انجیل میں نہیں۔ قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو ویدوں میں نہیں۔ اور قرآن کریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو زرتشت وغیرہ کی کتابوں میں بھی نہیں۔

قرآن کریم ایک روحانی خزانہ ہے

پھر قرآن کریم کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے ہمیں یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن کریم میں وہ روحانی خزانہ ہے جس کے بغیر دنیا میں ہم گذارہ نہیں کر سکتے۔ صرف دوسری الہامی کتب کے مقابلہ میں زیادتی ثابت کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم نے جو چیز پیش کی ہے اس سے ایسی نئی سہولتیں بہم پہنچی ہیں جو پہلے حاصل نہ تھیں۔ جب دو چیزیں صفات

کے لحاظ سے برابر ہوں تو ایک کی ظاہری خوبی بھی دوسری پر فضیلت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ جیسے دو آم ایک ہی طرح میٹھے ہوں مگر ان میں سے ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ہو تو بڑے کو چھوٹے پر بڑائی کی فضیلت حاصل ہوگی۔ لیکن قرآن کریم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ ساری دنیا کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ اب اس کے بعد کوئی شرعی کتاب نہیں آسکتی۔ اس لئے ہمیں ساری قوموں، سارے مذاہب اور سارے علوم کے مقابلہ میں قرآن کریم کی فضیلت ثابت کرنی ہوگی۔ جو کتاب یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ سب سے آخری الہامی کتاب ہے، جیسے قرآن کہتا ہے، اس کی ذمہ داری پہلی تمام کتب سے بالا خوبیاں پیش کرنے کی ہے۔ پہلی کتابوں کو منسوخ کرنے کا دعویٰ کرنے والی کتاب کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ اتنا ثابت کردے کہ پہلی کتابوں سے زیادہ اس میں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ کتاب جو یہ کہے کہ میرے بعد کوئی شرعی کتاب نہیں آسکتی اور میں اب ہمیشہ کے لئے مکمل کتاب ہوں اس کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ پہلی کتابوں سے بڑھ کر خوبیاں پیش کرے بلکہ یہ ثابت کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ آئندہ روحانیت کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں آسکتی جو اس میں نہ ہو۔ پس وہ کتاب جو صرف یہ نہ کہے کہ میں پہلی کتب کو منسوخ کرتی ہوں بلکہ یہ بھی کہے کہ آئندہ کے لئے بھی سب الہامی کتابوں کا دروازہ بند کرتی ہوں، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس بات کے قطعی ثبوت پیش کرے کہ آئندہ بھی کوئی ایسی کتاب نازل نہیں ہوسکتی۔

پس قرآن کریم کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے یہ معیار نہایت ضروری ہے۔ ہاں علاوہ اس اصولی بحث کے تفصیلی بحث بھی کی جاسکتی ہے کہ فلاں فلاں خوبی قرآن کریم میں ہے جو اور کسی کتاب میں نہیں ہے مگر اصولی طور پر بحث کرنا بھی ضروری ہوگا۔

جب ہم قرآن کریم میں خوبیوں کی کثرت ثابت کردیں مثلاً یہ کہیں کہ فلاں فلاں خوبیاں وید، بائیبل اور ژند اَوِستا میں بھی پائی جاتی ہیں اور قرآن میں بھی ہیں مگر یہ چار یا دس بیس خوبیاں ایسی ہیں جو صرف قرآن میں پائی جاتی ہیں تو اس سے بھی قرآن کریم کی فضیلت ثابت ہوگی مگر اس سے قرآن کریم کا اکمل ہونا ثابت نہ ہوگا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچے گی کہ آئندہ کوئی اور شرعی کتاب نہیں آسکتی۔ اس طرح قرآن کریم صرف موجودہ کتب کے مقابلہ میں افضل ثابت ہوسکتا۔

تمام وجوہِ کمال میں افضل کتاب

غرض سب کے آخر اور سب سے افضل ہونے کا دعویٰ کرنے والی کتاب کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس کے اندر وہ کچھ ہے جو دوسری کتب میں نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ یہ بھی ثابت کرے کہ جو کچھ اس میں ہے وہ دوسری کتب میں ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ یہ ثابت نہ کرے اس وقت تک صرف اچھی باتیں بتانے سے اس کی افضلیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہاں افضلیت چونکہ صرف اعلیٰ خوبیوں کے لحاظ سے نہیں ہوتی بلکہ وسیع خوبیوں کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے۔ اس لئے خوبیوں کی وسعت اس غرض کے اثبات کے لئے پیش کی جاسکتی ہے کہ گو بعض خوبیاں کسی اور کتاب میں بھی پائی جاتی ہوں مگر خوبیوں کی وسعت کے لحاظ سے فلاں کتاب افضل ہے۔ ہاں کامل افضل کتاب وہ کہلائے گی جو تمام وجوہِ کمال میں افضل ثابت ہو۔ اور میرا قرآن کریم کے متعلق یہی دعویٰ ہے۔

جواہرات کی کان

ممکن ہے کوئی کہے کہ کیا پہلے لوگوں کو قرآن کریم کے ان فضائل کا علم نہ تھا؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ علم تھا مگر روحانی علوم خدا تعالیٰ کے فضل سے روزانہ ترقی کرتے ہیں۔ اور جب ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے پاس قرآن کریم جواہرات کی ایک کان ہے جس میں سے نئے سے نئے جواہر نکلتے رہتے ہیں تو پھر کیوں ہم انہی جواہرات پر اکتفاء کریں جو پہلے لوگ حاصل کر چکے ہیں اور کیوں قرآنی کان میں سے ہم نئے ہیرے اور جواہرات نہ نکالیں۔ پس میں قرآن کریم کے خزانہ میں گیا کیونکہ پہلے میں وہاں سے کئی بار لعل و جواہر نکال چکا تھا، اور پھر اپنے دامن کو بھر کر لایا۔ جب میں اس خزانہ میں قرآن کریم کی خوبیاں معلوم کرنے کے لئے گیا تو مجھے ایک عجیب بات سوجھی۔ اور وہ یہ کہ بجائے اس کے کہ اس خزانہ میں مَیں اندھا دھند ہاتھ ماروں اور جو چیز میرے ہاتھ میں آئے اسے اُٹھالوں حالانکہ ممکن ہے اس سے بہتر چیز وہاں موجود ہو اور میں اسے نہ اُٹھا سکوں اس لئے کیوں نہ میں اصولی طور پر غور کروں کہ مجھے کیا لینا چاہئے۔ تب مجھے خیال آیا کہ کسی کتاب کی

فضیلت اور اکملیت ثابت کرنے کے لئے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس کے مضامین پر غور کریں اور اس طرح اس کی کوئی خوبی معلوم کریں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی چیز کو دوسری چیز پر فضیلت کیوں حاصل ہوتی ہے۔

پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ جو فضیلت کے معیار ہیں اور جن کی وجہ سے کسی کو فضیلت دی جاتی ہے وہ کس قدر قرآن میں پائے جاتے ہیں۔

قرآنی فضیلت کے چھبیس (۲۶) وجوہ

جب میں نے اس رنگ میں غور کیا تو قرآن کریم کا سمندر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ہر فضیلت کے وجہ جو دنیا میں پائی جاتی ہے اور جس کی بناء پر ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے وہ بدرجہ اتم قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اور فضیلت دینے والی خوبیوں کے سارے رنگ قرآن کریم میں موجود ہیں۔ میں نے اس وقت سرسری نگاہ سے دیکھا تو قرآن کریم کی فضیلت کی چھبیس وجوہات میرے ذہن میں آئیں۔ بالکل ممکن ہے کہ یہ وجوہات اس سے بہت بڑھ کر ہوں اور میں پھر غور کروں یا کوئی اور غور کرے تو اور وجوہات بھی نکل آئیں۔ مگر جتنی وجوہات اس وقت میرے ذہن میں آئیں، ان میں مَیں نے قرآن کریم کو تمام کتب سے افضل پایا۔

منبع کی افضلیت

(۱) پہلی وجہ کسی چیز کے افضل ہونے کی اس کے منبع کی افضلیت ہوتی ہے۔ جیسے گورنمنٹ کی ملازمت میں باپ نے جو گورنمنٹ کی خدمات کی ہوتی ہیں ان کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ایک دوسرے شخص کو جو تعلیم اور قابلیت کے لحاظ سے بالکل مساوی ہوتا ہے اس پر ایسے شخص کو ترجیح دے دی جاتی ہے جس کے باپ دادا نے گورنمنٹ کی خدمات کی ہوتی ہیں۔ یہ منبع کے لحاظ سے فضیلت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص جو امیر باپ کے گھر پیدا ہوتا ہے وہ امارت اپنے ساتھ لاتا ہے اور اسے یہ خوبی منبع کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس فضیلت کے لحاظ سے بھی دوسری کتب سے افضل پایا۔

ذاتی قابلیت کے لحاظ سے فضیلت

دوسری وجہ فضیلت میرے ذہن میں یہ آئی کہ اندرونی اور ذاتی قابلیت اور طاقت کی وجہ سے بھی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے دوائیں اپنے اندر طاقت رکھتی ہیں۔ اس وجہ کے لحاظ سے بھی میں نے قرآن کریم کو سب سے بڑھ کر پایا۔

نتائج کے لحاظ سے فضیلت

تیسری وجہ فضیلت نتائج کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بھی ایک چیز کو ہم دوسری پر فضیلت دے دیتے ہیں۔ بعض چیزیں اپنی ذات میں اچھی ہوتی ہیں مگر دوسری چیزوں سے مل کر ان کا اچھا نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ جیسے ڈاکٹر جرمز (Germs) کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ٹیکہ سے مر جاتے ہیں۔ گویا انسان کے جسم میں جرمز اور ٹیکہ کا مادہ ملنے سے الٹا اثر ہوتا ہے۔ تو کبھی ایک چیز کو نتائج کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے اور جو چیز اس میں بڑھ جاتی ہے اس کی برتری تسلیم کر لی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض تعلیمیں یوں بڑی اچھی اور مفید نظر آتی ہیں لیکن ان کے نتائج ایسے اعلیٰ پیدا نہیں ہوتے۔ میں نے اس لحاظ سے بھی قرآن کریم کو دوسری کتب سے افضل پایا۔

شدّتِ فائدہ کے لحاظ سے فضیلت

چوتھی وجہِ فضیلت شدّتِ فائدہ کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ فائدے تو سب چیزوں میں ہوتے ہیں مگر ایک میں زیادہ ہوتے ہیں اور دوسروں میں کم۔ قرآن کریم میں شدّتِ فوائد کے لحاظ سے بھی فضیلت پائی جاتی ہے۔

کثرتِ فوائد کے لحاظ سے فضیلت

پانچویں کثرتِ فوائد کے لحاظ سے بھی ہم ایک چیز کو دوسری پر فضیلت دیتے ہیں۔ ایک دوائی ایک بیماری میں بڑا فائدہ دیتی ہے۔ مگر ایک اور دوائی ہوتی ہے جو اتنا فائدہ اس بیماری میں نہیں

دیتی، مگر پچاس اور بیماریوں میں مفید ہوتی ہے۔ اسے پہلی دوائی پر کثرت فوائد کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہوگی۔ قرآن کریم کو میں نے اس لحاظ سے بھی دوسری کتب سے افضل پایا۔

وسعتِ نفع کے لحاظ سے فضیلت

چھٹے۔ کبھی وسعتِ نفع کے لحاظ سے بھی فضیلت دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک دوائی کے متعلق یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتنی بیماریوں میں نفع دیتی ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کتنی طبائع پر اثر ڈالتی ہے اور کتنے لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی مجھے افضل نظر آیا۔

میعادِ نفع کے لحاظ سے فضیلت

ساتویں۔ نفع کے وقت کے لحاظ سے بھی کہ کتنے عرصہ تک کوئی چیز نفع پہنچاتی ہے۔ ہم بعض دفعہ ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دے دیتے ہیں۔ جب ایک قسم کے دو کپڑے سامنے ہوں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک کپڑا کتنی مدت تک چلتا ہے اور دوسرا کتنی مدت تک۔ ایک اگر ایک سال چلنے والا ہو اور دوسرا چھ ماہ، تو ایک سال چلنے والے کو دوسرے پر فضیلت دے دی جائے گی۔ قرآن کریم کی اس لحاظ سے بھی مجھے فضیلت نظر آئی۔

نفع اُٹھانے والوں کے مقام کے لحاظ سے فضیلت

آٹھویں۔ پھر فضیلت کی ایک وجہ ان لوگوں کی عظمت کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے جن کو وہ نفع پہنچاتی ہے۔ یعنی دیکھا جاتا ہے کہ کس پایہ کے لوگ اس سے نفع اُٹھاتے ہیں۔ جن چیزوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ بڑے پایہ کے انسانوں کو نفع پہنچاتی ہیں ان کو دوسری چیزوں پر مقدم کر لیا جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے۔

نفع اُٹھانے والوں کی اقسام کے لحاظ سے فضیلت

نویں۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کتنی اقسام کی چیزوں کو کوئی چیز نفع پہنچاتی ہے کیونکہ علاوہ افراد کے،

اقسام بھی ایک درجہ رکھتی ہیں۔ایک چیز ایسی ہے جو ایک کروڑ انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے اور ایک اور ہے کہ وہ بھی ایک کروڑ انسانوں کو ہی نفع پہنچاتی ہے لیکن ان میں فرق یہ ہو کہ ایک صرف ایک قسم کے لوگوں کو نفع پہنچائے۔ مثلاً عیسائیوں یا ہندوؤں کو مگر دوسری ایک کروڑ انسانوں کو ہی نفع پہنچائے۔لیکن عیسائیوں، ہندوؤں، یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نفع پہنچائے تو اسے افضل قرار دیا جائے گا۔غرض وسعتِ اقسامِ افراد کے لحاظ سے بھی ایک چیز افضل قرار دی جاتی ہے اس میں بھی مجھے قرآن کریم کی دوسری کتب پر فضیلت نظر آئی۔

کھوٹ سے مبرّا ہونے کے لحاظ سے فضیلت

دسویں۔اس لحاظ سے بھی کسی چیز کی فضیلت کو دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کوئی کھوٹ تو نہیں ملا ہوا۔جس چیز میں کھوٹ نہ ہو اسے دوسری چیزوں پر فضیلت دی جاتی ہے۔اس میں بھی قرآن کریم تمام کتبِ الٰہیہ سے افضل پایا گیا۔

یقینی فوائد کے لحاظ سے فضیلت

گیارہویں۔بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کھوٹ سے تو پاک ہوتی ہیں مگر ان کے نفع کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا۔یہ احتمال ہوتا ہے کہ ان کے استعمال میں کوئی غلطی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑے۔لیکن جس کے استعمال کے متعلق غلطی کا کوئی احتمال نہ ہو اور اس کے فوائد کے متعلق کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو اسے اختیار کر لیا جاتا اور اس کی فضیلت تسلیم کر لی جاتی ہے۔اس لحاظ سے بھی قرآن کریم کو فضیلت حاصل ہے۔

ظاہری حسن کے لحاظ سے فضیلت

بارہویں۔ظاہری حُسن کی وجہ سے بھی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت دے دی جاتی ہے۔ قرآن کریم اپنے ظاہری حسن کے لحاظ سے بھی دوسری کتب سے افضل پایا گیا۔

ضروری امور کو نقصان نہ پہنچانے کے لحاظ سے فضیلت

تیرہویں۔ ایک چیز کو دوسری پر اس لئے بھی فضیلت دے دی جاتی ہے کہ اس کا استعمال دوسری ضروری اشیاء کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ مثلاً ایک شخص دو بیماریوں میں مبتلا ہو۔ اس کی ایک بیماری کے لئے ایک ایسی دوا ہو جو بہت فائدہ دیتی ہو لیکن دوسری بیماری کو بڑھا دیتی ہو۔ تو اس کی نسبت وہ دوائی استعمال کی جائے گی جو نفع کم دیتی ہو لیکن دوسری بیماری کو نقصان نہ پہنچاتی ہو۔ اس لحاظ سے بھی قرآن کریم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

فوائد کے سہل الحصول ہونے کے لحاظ سے فضیلت

چودھویں۔ اس لئے بھی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت دی جاتی ہے کہ اس کے فوائد سہل الحصول ہوتے ہیں۔ یعنی آسانی سے اس کے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے۔

ضروریات پوری کرنے میں یکتا ہونے کے لحاظ سے فضیلت

پندرہویں۔ اس لحاظ سے بھی ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت دی جاتی ہے کہ وہ ایسی ضرورت کو پورا کرتی ہے جسے اور کوئی چیز پورا نہیں کرسکتی۔ یہ فضیلت بھی قرآن کریم کو دوسری کتب کے مقابلہ میں حاصل ہے۔ کیونکہ وہ ایسی ضرورتیں پوری کرتا ہے جنہیں اور کوئی کتاب پوری نہیں کر سکتی۔

اہم ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے فضیلت

سولہویں۔ اس لحاظ سے بھی ایک چیز کو دوسری چیزوں پر مقدم کیا جاتا ہے کہ جس ضرورت کو وہ پورا کرتی ہے وہ ایسی ضرورت ہوتی ہے کہ اسے ہم کسی صورت میں بھی ترک نہیں کر سکتے۔ کئی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے نقصان تو ہوتا ہے مگر پھر بھی انہیں چھوڑا جا

سکتا ہے۔ لیکن بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں ہم چھوڑیں، تو گئے۔ قرآن کریم ایسی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے اس لئے وہ دوسری کتب سے افضل ہے۔

حفاظت میں آسانی ہونے کے لحاظ سے فضیلت

سترہویں۔ اس امر کے لحاظ سے بھی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ اس کی حفاظت میں کس قدر کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ایک ایسی چیز جسے ہم آسانی اور سہولت سے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اسے ہم ایسی چیز پر مقدم کر لیتے ہیں جس کی حفاظت مشکل ہوتی ہے میں نے دیکھا کہ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے۔

نفع کے لحاظ سے فضیلت

اٹھارہویں۔ کسی چیز کی فضیلت معلوم کرنے کے لئے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کا استعمال کس قدر ذمہ داریاں ڈالتا ہے اور اس کے مقابلہ میں نفع کس قدر ہے۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے کیونکہ اس کے لینے میں خرچ کم ہوتا ہے اور نفع زیادہ۔

ہر قسم کے نقصان سے مبرّا ہونے کے لحاظ سے فضیلت

انیسویں۔ اس لئے بھی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت دے دی جاتی ہے کہ اس کے استعمال سے نقصان تو نہیں ہوتا۔ جب نقصان نہیں ہوتا تو اسے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً دو دوائیاں ہیں جن میں سے ایک تھوڑے نفع والی ہے مگر کوئی نقصان اس سے پہنچنے کا خدشہ نہیں ہے تو اسے ہم استعمال کر لیتے ہیں اور زیادہ نفع دینے والی جس کے استعمال سے نقصان کا بھی خطرہ ہو اسے استعمال نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے بھی قرآن کریم کی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے۔

دعوتِ عام کے لحاظ سے فضیلت

بیسویں۔ کسی چیز کو فضیلت اس وجہ سے بھی دی جاتی ہے کہ وہ اپنی چیز ہوتی ہے۔ جب میں

نے قرآن کریم کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف قرآن ہی اپنا تھا۔ باقی سب کتب میں مجھے غیریت نظر آئی۔ قرآن کریم کو میں نے ایک ہندو کی نظر سے بھی دیکھا اور ایک عیسائی کی نظر سے بھی۔ ایک پارسی کی نظر سے بھی اور ایک بدھ کی نظر سے بھی۔ پھر کبھی میں سید بن کر اس کے پاس گیا کبھی مغل بن کر، کبھی شیخ بن کر، کبھی راجپوت بن کر، کبھی عالم کے رنگ میں اور کبھی جاہل کے رنگ میں۔ مگر ہر دفعہ اس نے یہی کہا کہ آؤ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔ لیکن دوسری کتب کے پاس جس حالت میں بھی میں گیا۔ انہوں نے مجھے دھتکارا اور اپنے پاس تک پھٹکنے نہ دیا۔

علاج الامراض کے لحاظ سے فضیلت

اکیسویں۔ کسی چیز کو اس لحاظ سے بھی ہم فضیلت دیا کرتے ہیں کہ وہ ان بیماریوں کا علاج ہو جو ہم میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے جب دیکھا تو قرآن کریم میں مجھے یہ بھی فضیلت نظر آئی۔

زائد فوائد کے لحاظ سے فضیلت

بائیسویں۔ ایک چیز کو دوسری پر ہم اس لئے بھی مقدم کیا کرتے ہیں کہ اس سے ہمیں زائد فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس لحاظ سے بھی قرآن کریم دوسری کتب سے افضل ہے۔

مطمحِ نظر کی وسعت کے لحاظ سے فضیلت

تیئیسویں۔ مذہب کی افضلیت کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اعلیٰ ترقیات کی امید پیدا کر کے انسان کا مطمحِ نظر وسیع کرے۔ اپنے پیروؤں کی ہمت بڑھائے۔ ان میں مایوسی اور ناامیدی نہ آنے دے اور ان کی اُمنگوں کو قائم رکھے۔ میں نے دیکھا کہ اسلام اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات اور تعلق باللہ کا دروازہ ہمارے لئے کھولتا ہے اور اس طرح ہماری امید کو نہ صرف قائم رکھتا ہے بلکہ اسے وسیع کر کے ہماری ہمت کو بڑھاتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ انسانی ترقی اس کے مستقبل کے خواب میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس اس لحاظ سے بھی مجھے قرآن کریم ہی افضل نظر آیا۔

دوسری کتب سے مستغنی کرنے کے لحاظ سے افضلیت

چوبیسویں۔ اس لحاظ سے بھی کسی چیز کو دوسری چیزوں سے افضل قرار دیا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک دوسری اشیاء کی ضرورت سے مستغنی کر دیتی ہے۔ ایسی چیز کی لوگ زیادہ قدر کرتے ہیں کیونکہ انہیں دوسری چیزوں کی فکر نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے۔

صحیح علوم کی طرف راہنمائی کرنے کے لحاظ سے فضیلت

پچیسویں۔ کسی چیز کی افضلیت کا ایک یہ بھی باعث ہوتا ہے کہ وہ صحیح علوم کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرتی اور انہیں لغو امور میں حصہ لینے سے بچاتی ہے۔ کتابِ الٰہی چونکہ معلم ہوتی ہے اس لئے اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ صحیح طرف لگائے۔ انہیں لغویات سے روکے اور صحیح علوم کی طرف ان کی راہنمائی کرے۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کریم اس لحاظ سے بھی افضل ہے۔

اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لحاظ سے فضیلت

چھبیسویں۔ اس امر کے لحاظ سے بھی ایک چیز کو دوسری چیز پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اگر ایک چیز اپنی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو لازماً اس دوسری چیز کو ترجیح دی جائے گی جو اس ضرورت کو پورا کر سکتی ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس پہلو کے لحاظ سے بھی قرآن کریم کو دوسری کتب پر فضیلت حاصل ہے۔

غرض غور کرتے وقت مجھے فضیلت کی یہ چھبیس (۲۶) وجوہات نظر آئیں۔ گو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ممکن ہے کہ اور بھی کئی باتیں غور کرنے سے نکل آئیں۔ بہرحال جب میں نے ان پر قرآن کریم کو پرکھا تو اسے ہر بات میں دوسری کتب سے افضل پایا۔

قرآن کریم کا دعویٰ اور افضلیت

مگر پیشتر اس کے کہ ان امور پر تفصیلی بحث کی جائے سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے خود بھی دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا ہے یا نہیں کہ وہ تمام کتبِ الٰہیہ سے افضل ہے۔ اگر قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہو تو پھر تو اس کی افضلیت اور برتری کے وجوہ پر بھی بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر اس کا یہ دعویٰ ہی نہ ہو تو اس کی افضلیت کے وجوہ پیش کرنا ''مدعی سست اور گواہ چست'' والی بات بن جاتی ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اپنی افضلیت کا بڑے واضح الفاظ میں دعویٰ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ تَقۡشَعِرُّ مِنۡہُ جُلُوۡدُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ [۳] یعنی اللہ تعالیٰ نے نہایت زور، طاقت اور قوت کے ساتھ اس کتاب کو اُتارا ہے جو اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ ہے۔ یعنی ساری الہامی کتابوں سے افضل ہے۔ یہ کس طرح کہا گیا کہ ساری الہامی کتابوں سے افضل ہے۔ اوّل اس لئے کہ جب قرآن خدا تعالیٰ کی کتاب ہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کتابوں سے افضل ہے۔ اعتراض کے موقع پر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں کتاب الہامی نہیں بلکہ انسانی دست بُرد کی آماجگاہ بن چکی ہے لیکن اصولی طور پر ان کو انسانی کتب قرار دے کر قرآن کو ان کے مقابلہ میں لانا بے وقوفی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے ایک پہلوان کہے کہ دیکھو میں فلاں بچہ سے طاقتور ہوں۔ ہاں اگر بچہ پہلوان کو آکر کہے کہ میں تمہیں گرادوں گا آؤ تم میرا مقابلہ کرلو تو پہلوان اسے بیشک کہہ سکتا ہے کہ جا چلا جا ورنہ تُو میرے ایک ہی تھپڑ سے مرجائے گا۔

اس آیت میں حدیث کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے یہ پہلی الہامی کتابوں کے متعلق ہے۔ اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ فَذَرۡنِیۡ وَمَنۡ یُّکَذِّبُ بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ [۴] یعنی تو مجھے اور اس کو جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے چھوڑ دے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَمَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا

كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۵ یعنی رحمٰن خدا کی طرف سے کبھی کوئی نیا ذکر نہیں آتا کہ جس سے لوگ اعراض نہ کرتے ہوں۔ چونکہ انبیاء کا کلام ضرور کسی نئی شئے کو لے کر آتا ہے۔ یعنی وہ حسب ضرورت آتا ہے خواہ شریعت لائے خواہ فہم لائے، خواہ ایمان کی تجدید کے سامان لائے، اس لئے اسے حدیث کہتے ہیں اور قرآن کریم اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ ہے یعنی جنس حدیث میں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ کلام الٰہی میں سب سے افضل ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا۔ یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے ان تمام کتابوں سے جو اس سے پہلے نازل ہوئیں بڑھی ہوئی ہے۔ پس قرآن کریم سے ہمیں اس کی افضلیت کا دعویٰ ملتا ہے۔

پھر قرآن کریم کی افضلیت کا دعویٰ اس آیت میں بھی موجود ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [۶] فرماتا ہے۔ ہم کوئی کلام الٰہی منسوخ نہیں کرتے یا فراموش نہیں کراتے جب تک کہ اس سے بہتر یا اس جیسا کلام نہ لائیں۔ یعنی جسے منسوخ کرتے ہیں اس سے بہتر لاتے ہیں اور جو بھول چکا ہوتا ہے مگر عمل کے قابل ہوتا ہے اسے ویسا ہی لے آتے ہیں۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اے مخاطب! تجھے یہ کیوں عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تورات میں ایک نئی شریعت نازل ہونے کی پیشگوئی

جب قرآن کریم پہلی الہامی کتب کا ناسخ ہے تو ضروری تھا کہ وہ کچھ تعلیم تو ان تعلیموں سے بہتر لائے اور کچھ وہ لائے جو مٹ گئی ہو۔ جب میں نے اس پہلو سے غور کیا تو قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق دوسری کتابوں سے بھی معلوم ہوئی۔ چنانچہ بائیبل میں آتا ہے۔

> ’’میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مونہہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہے گا۔‘‘ [۷]

اس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی مبعوث ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ صاحب شریعت نبی تھے اس لئے ان جیسے نبی کے آنے کے لازماً یہ

معنی تھے کہ وہ بھی صاحب شریعت ہوگا۔ پھر جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے گا تو معلوم ہوا کہ جو کتاب وہ لائے گا اس میں بعض باتیں زائد بھی ہونگی جو بائیبل میں موجود نہ ہونگی، ورنہ نئی شریعت کے آنے کی کیا ضرورت تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ کرنے میں کیا حکمت تھی۔ لیکن جب وہ منسوخ کی گئی تو ضروری تھا کہ آنے والی شریعت اس سے افضل ہو۔ پس قرآن کریم کی افضلیت بائیبل کے اس حوالہ سے بھی ثابت ہے کیونکہ شریعت جدیدہ ناسخہ عقلاً شریعت منسوخہ سے حقیقی طور پر یا نسبتی طور پر افضل ہونی چاہئے۔

حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مصداق ہونے کا دعویٰ

ممکن ہے کوئی کہے کہ قرآن کریم کب کہتا ہے کہ میں وہی کتاب ہوں جس کا وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ سو اس کا جواب بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا[8] یعنی اے لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے شَاهِدًا عَلَيْكُمْ جو تم پر شاہد اور گواہ ہے كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا اور وہ اسی قسم کا رسول ہے جس قسم کا رسول موسیٰؑ تھا جسے فرعون کی طرف بھیجا گیا۔ اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸ کے مصداق ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور طرح بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ اور وہ یہ کہ استثنا باب ۱۸ کی آیت ۱۸ حضرت مسیحؑ پر چسپاں نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بھی کہتے ہیں کہ میں اس کا مصداق نہیں۔ انجیل میں آتا ہے، حضرت مسیحؑ کہتے ہیں۔

> ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔''[9]

پس انجیل سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں جس آنے والے کی پیشگوئی ہے وہ حضرت مسیحؑ پر چسپاں نہیں ہوتی بلکہ اس کا مصداق کوئی اور ہے۔ پھر حضرت مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کے لئے آئے تھے۔ مگر وہ جس کی نسبت حضرت موسیٰؑ نے پیشگوئی کی وہ ساری دنیا کے

لئے ہے۔ اور یہ دعویٰ قرآن ہی پیش کرتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[1] یعنی اے لوگو! آج میں نے دین کے کامل کرنے کی کڑی کو پورا کر دیا۔ وہ کڑی جو آدمؑ سے لے کر اب تک ناکمل چلی آتی تھی آج قرآن کے ذریعہ پوری کر دی گئی ہے اور میں نے اپنے احسان کو تم پر کامل کر دیا ہے۔ گویا مختلف چکروں میں سے انسانوں کو گذارتے ہوئے میں انہیں اس مقام پر لے آیا کہ بندہ خدا کا مظہر بن گیا اور میں نے تمہارے لئے دین کے طور پر اسلام کو پسند کر لیا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم اپنے بعد کسی اور شریعت اور نئی کتاب کی امید نہیں دلاتا بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ نیا فہم اور نیا علم حاصل کرو جو قرآن کریم کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کے اس دعویٰ کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ فضیلت کے وہ تمام وجوہ جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں اور فضیلت کے ہر اصل کے لحاظ سے قرآن کریم تمام دوسری کتب الہامیہ سے افضل اور برتر ہے۔

منبع کے لحاظ سے قرآن کریم کی افضلیت کا ثبوت

پہلی بات جو میں نے بطور فضیلت بیان کی ہے وہ منبع کے لحاظ سے کسی چیز کی افضلیت ہے۔ یعنی کسی چیز کے منبع اور مخرج کا اعلیٰ ہونا بھی اس کے لئے وجہ فضیلت ہوتا ہے۔ جیسے ایک بادشاہ کے کلام کو دوسرے لوگوں کے کلام پر مقدم کیا جاتا ہے۔ اگر دو آدمی کلام کر رہے ہوں جن میں سے ایک بادشاہ ہو تو سننے والے لازماً بادشاہ کی بات کی طرف زیادہ متوجہ ہونگے اور بغیر یہ فیصلہ کرنے کے کہ ان میں سے کس کا کلام افضل ہے پہلے ہی یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بادشاہ کا کلام دوسرے سے اہم ہوگا۔ اسی طرح ایک بڑے ادیب کے کلام کو دوسروں کے کلام پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مختلف شعراء اگر ایک جگہ بیٹھے ہوں اور وہاں مثلاً غالب بھی آ جائیں تو بغیر اس کے کہ ان کے اشعار سنے جائیں یہی کہا جائے گا کہ ان کے اشعار افضل ہونگے۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر کسی بیمار کے متعلق رائے دیتا ہے اور بعض دفعہ وہ غلطی بھی کر جاتا ہے بلکہ بعض اوقات عورتوں کے بتائے ہوئے نسخے زیادہ فائدہ دے دیتے ہیں مگر کوئی عقلمند یہ نہیں کہتا کہ ایک ڈاکٹر کی بات رد کر دی جائے اور ایک عورت کی بات مان لی

جائے۔ لازماً ڈاکٹر کی بات کی طرف ہی توجہ کی جائے گی۔ ہاں جسے کسی دوائی سے فائدہ نہ ہوتا ہو وہ کسی عورت کی بتائی ہوئی دوائی بھی استعمال کرے گا۔ کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا کے مطابق وہ یہ کہے گا کہ چلو اس کی دوائی بھی آزما لو۔

غرض اتھارٹی اپنی ذات میں بھی فضیلت رکھتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اتھارٹی کے لحاظ سے غالب گمان ہوتا ہے کہ اس کی بات ٹھیک ہوگی۔ اسی کی طرف پہلے کیوں نہ توجہ کریں۔ بہر حال جس چیز کی فضیلت مقام اور منبع کے لحاظ سے ثابت ہو جائے اس کی طرف دوسروں کی نسبت زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور اسے فضیلت دے دی جاتی ہے۔ لیکن اگر منبع ایسا ہو کہ جس سے غلطی کا امکان ہی نہ ہو تو پھر تو سُبْحَانَ اللہِ!

اب قرآن کریم کو ہم اس اصل کے ماتحت دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے جو سب خوبیوں کا جامع ہے اور جب ہم یہ دعویٰ پڑھتے ہیں تو ہمارا دل کہتا ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے تو پھر یقیناً انسانوں کے کلاموں سے افضل ہوگا اور ان کلاموں کو ہم اس کے مقابلہ میں قطعی طور پر ٹھکرا دیں گے۔

میں پہلے یہ دعویٰ بیان کر آیا ہوں کہ قرآن خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور وہ دعویٰ یہ ہے کہ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ اب اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو قرآن کریم کو تمام انسانی کلاموں پر منبع کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہوگئی۔

قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کے تین دلائل

لیکن ظاہر ہے کہ صرف دعویٰ کافی نہیں ہو سکتا۔ دعویٰ کے لئے دلیل بھی چاہئے جس سے ثابت ہو کہ فی الواقعہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم یہ دلیل دیتا ہے کہ اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَیَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّرَحۡمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَکُ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡهُ ۚ اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ [11] اس آیت میں قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے کی تین دلیلیں دی گئی ہیں۔ پہلی

دلیل یہ بیان کی کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک بَيِّنَة یعنی روشن دلیل پر قائم ہو وہ جھوٹا ہوسکتا ہے یا وہ تباہ ہوسکتا ہے۔ یہاں مِن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ پس فرمایا کیا یہ لوگ تمہارے خیال کے مطابق تباہ و برباد ہوجائیں یا نقصان اُٹھائیں گے یہ تو ایسی کتاب کو ماننے والے ہیں جو بَيِّنَة ہے یعنی اس میں الہامی دلائل ہیں جو مدلول علیہ کے دعویٰ کی صحت کو بیان کرتے ہیں۔

آیت اور بیّنۃ میں فرق

آیت اور بَيِّنَة میں یہ فرق ہے کہ آیت وہ ہوتی ہے جس سے ہم خود نتیجہ نکالیں۔ اور بَيِّنَة وہ ہوتی ہے جو اپنی دلیل آپ پیش کرے۔ جیسے ایک درخت کو ہم دیکھتے ہیں کہ اسے کسی صانع نے بنایا ہے یہ آیت ہے۔ لیکن ایک نبی آتا ہے اور آکر کہتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں یہ بَيِّنَة ہے۔ تو آیت عام لفظ ہے اور بَيِّنَة خاص۔ اس سے مراد وہ دلیل ہوتی ہے جو اپنے لئے آپ شاہد ہوتی ہے۔

قرآن کریم کے بَيِّنَة ہونے کا ثبوت

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کس طرح بَيِّنَة ہے؟ یہ بھی تو دعویٰ ہی ہے کہ قرآن بَيِّنَة ہے۔ اس کے لئے میں کہیں دور نہیں جاتا۔ قرآن کریم کے بَيِّنَة ہونے کا ثبوت اس پہلی وحی میں ہی موجود ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ باقی کتابیں دوسروں کی دلیلوں کی محتاج ہوتی ہیں مگر قرآن اپنے دعویٰ کی آپ دلیل دیتا ہے۔ اور قرآن کے بَيِّنَة ہونے کی دلیل ان تین آیتوں میں موجود ہے جو پہلے پہل نازل ہوئیں۔ قرآن کریم کا یہ کمال دکھانے کے لئے میں نے سب سے پہلی وحی قرآنی کو ہی لیا ہے۔ سب سے پہلی وحی غار حرا میں نازل ہوئی تھی جب جبرائیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آیا اور اس نے کہا۔ اِقْرَاْ یعنی پڑھ۔ اس کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا اَنَا بِقَارِئٍ [۱۲] میں پڑھنا نہیں جانتا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ بوجھ مجھ

پر نہ ڈالا جائے۔ کیونکہ اس وقت آپ کے سامنے کوئی کتاب تو نہیں رکھی گئی تھی جسے آپ نے پڑھنا تھا بلکہ جو کچھ جبرائیل بتاتا وہ آپ کو زبانی کہنا تھا۔ اور یہ آپ کہہ سکتے تھے مگر آپ نے انکسار کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے آپ ہی کو چنا تھا۔ اس لئے بار بار کہا کہ پڑھو۔ آخر تیسری بار کہنے پر آپ نے پڑھا اور جو کچھ پڑھا وہ یہ تھا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔ [۱۳]

کیا ہی مختصر سی عبارت اور کتنے تھوڑے الفاظ ہیں مگر ان میں وہ حقائق اور معارف بیان کئے گئے ہیں جو اور کتابوں میں ہرگز نہیں پائے جاتے۔ دوسری کتابوں کو دیکھو تو ویدیوں شروع ہوتے ہیں۔ ”اگنی میبرھے پروہتم“۔ آگ ہماری آقا ہے۔ بائبل کو دیکھو تو اس میں زمین و آسمان کی پیدائش کا یوں ذکر ہے۔

”ابتداء میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اُوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانیوں پر جُنبش کرتی تھی۔“ [۱۴]

انجیل کی ابتداء اس طرح ہے:-

”ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔“ [۱۵]

لیکن قرآن کریم اس دلیل کے ساتھ اپنی بات شروع کرتا ہے کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۔ اے محمد! (ﷺ) تم ان لوگوں کے معلم بن جاؤ اور پڑھو اس خدا کے نام کے ساتھ جس نے دنیا کو پیدا کیا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اس نے انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ہاں اے محمد! پڑھ کہ تیرے پڑھتے پڑھتے خدا کی عزت دنیا میں قائم ہو جائے گی۔

قرآن کریم کی ایک عظیم الشان پیشگوئی

یہ پہلی پیشگوئی ہے جو قرآن کریم کے بَيِّنَة ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ فرمایا

قرآن کے بَیِّنَۃ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہ کتاب خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان دنیا میں قائم کر دے گی۔

حضرت مسیح علیہ السلام پر مخالفین نے اعتراض کیا تھا کہ اسے شیطان سکھاتا ہے اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کیا شیطان اپنے خلاف آپ سکھاتا ہے۔

''اگر شیطان شیطان کو نکالے تو وہ اپنا ہی مخالف ہوا۔ پھر اس کی بادشاہت کیونکر قائم رہے گی۔''[۱۶]

اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ کتاب جو خدا تعالیٰ کی گمشدہ عظمت قائم کرنے کے لئے آئے اسے شیطان کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اوّل تو کوئی کتاب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو یہ کہہ ہی کس طرح سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی عزت اور عظمت اس کے ذریعہ قائم ہو جائے گی۔ کئی لوگ کتابیں لکھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی کتاب دنیا کا نقشہ بدل دے گی لیکن پھر اسی کتاب پر دوسروں سے ریویو کرانے کے لئے منتیں کرتے پھرتے ہیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ ایک شخص نے جس نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے وہ شکوہ کرتا پھرتا ہے کہ ''الفضل'' اس کی کتابوں کے خلاف کیوں نہیں لکھتا۔ ایک اور مدعی نبوت نے مجھے لکھا کہ میں آپ کے پاس اپنی کتاب بھیجتا ہوں خواہ آپ اس کے خلاف ہی لکھیں لیکن لکھیں ضرور۔ تو بیسیوں کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہیں پیدا ہوتا۔ پھر کیا یہ معمولی بات ہے کہ ایک ایسے علاقہ میں جہاں بُت پرستی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہاں کہا گیا کہ اسے ایسی حالت میں پڑھ کہ تیرے ربّ کی عزت اس کے ذریعہ دنیا میں قائم ہوتی جائے گی۔ اس کلام کے ذریعہ تیرا رَبُّ اَکْرَمُ کے طور پر ظاہر ہوگا۔

اُس وقت نہ صرف عرب میں بلکہ سارے جہان میں شرک پھیلا ہوا تھا اور حالت یہ تھی کہ آخری مذہب جو عیسائیت تھا۔ اس کے ماننے والے عیسائی خود لکھتے ہیں کہ اسلام اس لئے اتنی جلدی اور اس وسعت کے ساتھ پھیل گیا کہ عیسائیت میں شرک داخل ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں کو دیکھو تو یہی معلوم ہوگا کہ اُس وقت ہندوؤں میں بکثرت شرک پایا جاتا تھا۔ زرتشتی بھی مانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہر طرف شرک ہی شرک تھا۔ غرضیکہ تمام مذاہب والے فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام کے پھیلنے کی یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہر مذہب میں شرک پھیل چکا تھا۔ ہم کہتے ہیں یہ درست ہے

اور قرآن کریم نے ایسے ہی وقت میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ شرک مٹ جائے گا اور خدائے واحد کی حکومت دنیا میں قائم ہو جائے گی۔

اُس وقت جب کہ قرآن نے توحید پیش کی مکّہ والوں کی جو حالت تھی اس کا ذکر قرآن کریم اس طرح کرتا ہے کہ انہوں نے کہا اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔ [۱۷] یہ عجیب بات ہے کہ اس نے سارے معبودوں کو کوٹ کاٹ کر ایک بنا دیا ہے ان لوگوں کو یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اِلٰہ ہیں ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سب معبودوں کو اس نے اکٹھا کر کے ایک بنا دیا ہے۔ سورۃ ص میں ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر معًا ان کی حالت بدلنے لگی۔ اور اس کے بعد ان میں اس قدر تغیر پیدا ہو گیا کہ انہوں نے اسلامی توحید کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ کہنے لگے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [۱۸] یعنی یہ یونہی کہتا ہے کہ ہم مشرک ہیں ہم تو خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بُتوں کو مانتے ہیں۔ گویا وہ معذرت کرتے ہیں کہ ہم کب کہتے ہیں کہ بُت خدا ہیں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

یہ کتنا عظیم الشان تغیر ہے جو اُن میں پیدا ہوا اور کس طرح خدا تعالیٰ کا اَکْرَمُ ہونا ظاہر ہو گیا۔ غرض فرماتا ہے۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ تُو اس کتاب کو پڑھ کیونکہ اس کے پڑھنے کے ساتھ ہی توحید پھیلنے لگ جائے گی۔ لوگ خدا تعالیٰ کو ماننے لگ جائیں گے اور اس کا جلال دنیا میں قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر یہ تو اس وقت کا حال تھا جب قرآن کریم نازل ہوا۔ اب دیکھ لو کہ کس طرح شرک کے خیالات دنیا سے مٹ رہے ہیں۔ ہندوستان میں ۳۳ کروڑ بُت پوجے جاتے تھے مگر ان ہندوؤں میں سے ہی آریہ اُٹھے جو کہتے ہیں کہ ہم ہی اصل توحید کے ماننے والے ہیں۔ اسی طرح مسیحیوں کو دیکھو تو وہ کہتے ہیں اصل توحید ہم میں ہی ہے میں نے عیسائیوں کی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ اسلام نے ہم پر یہ غلط اعتراض کیا ہے کہ ہم شرک میں مبتلا ہیں حالانکہ اب بھی ان میں ایسے لوگ ہیں جو حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی پرستش کرتے ہیں۔

غرض کتنا بڑا تغیر رونما ہو گیا کہ جہاں جہاں قرآن پڑھا گیا وہاں توحید قائم ہوتی چلی گئی۔ اور دنیا یہ اقرار کرنے لگ گئی کہ خدا ہی اَکْرَمُ ہے۔ یہ کتنی عظیم الشان پیشگوئی ہے جو قرآن کریم کے

متعلق کی گئی۔ پھر پہلے دن پہلی وحی میں اور پہلے وقت میں کی گئی۔

قلم کے ذریعہ ہر قسم کے علوم کا اظہار

ایک اور پیشگوئی اس وحی میں قرآن کے متعلق یہ کی کہ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ یعنی اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف یہ ثابت ہوگا کہ تیرا رب سب سے بالا ہے اور باقی ساری ہستیاں اس کے تابع ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوگا کہ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ تیرے رب نے قلم کے ساتھ علم سکھایا ہے۔ یعنی آئندہ تحریر کا عام رواج ہو جائے گا۔ وہ مکّہ جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت صرف سات آدمی پڑھے لکھے تھے۔ جہاں کے بڑے بڑے لوگ لکھنا پڑھنا ہتک سمجھتے تھے۔ شعراء اپنے شعر صرف زبانی یاد کراتے تھے۔ اور اگر انہیں کہا جائے کہ اشعار لکھوا دیئے جائیں تو اسے اپنی ہتک سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ لوگ ان کے اشعار زبانی یاد رکھتے ہیں۔ جب قرآن نازل ہوا تو ان میں ایک عظیم الشان تغیر آ گیا۔

یہاں تک کہ صحابہؓ میں کوئی اَن پڑھ نہ ملتا تھا۔ سَو میں سے سَو ہی پڑھے لکھے تھے۔ تو فرمایا اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ اس کتاب کے ذریعہ دوسرا عظیم الشان تغیر یہ ہوگا کہ لوگوں کی توجہ علوم کی طرف پھیر دی جائے گی چنانچہ آپؐ کی بعثت کے معاً بعد لکھنے کا رواج ترقی پذیر ہوا۔ صحابہؓ نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ مدینہ میں آپؐ نے سب بچوں کو تعلیم دلوائی یہاں تک کہ عرب کا بچہ بچہ پڑھ لکھ گیا بلکہ اسلام کے ذریعہ سے یونانی کتب بھی محفوظ ہو گئیں۔ غرض قلم کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ اس کی مثال پہلے زمانہ میں نہیں ملتی۔

یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ اس بات کا تعلق قرآن کریم کی فضیلت سے کیا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کو کامل اور افضل ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مخاطب عالِم ہوں جاہل نہ ہوں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کریم کے نازل ہونے کے بعد علم کا زمانہ آ جائے گا۔ لوگ مختلف علوم کے ماہر ہوں گے۔ مگر باوجود اس کے یہ کتاب دنیا میں قائم رہے گی اور پڑھی جائے گی۔ اور کوئی اس پر غالب نہیں آ سکے گا۔ غرض اس پیشگوئی کے بعد کیا عرب اور کیا دوسرے ممالک ان میں علم کا اتنا رواج ہوا کہ اس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں مل سکتی۔

نئے نئے علوم کی ترویج

تیسری پیشگوئی یہ کی کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ خدا کا نام لے کر اس کتاب کو پڑھ جو انسان کو وہ باتیں سکھانے والا ہے جنہیں اس سے پہلے وہ ہرگز نہیں جانتا تھا۔ گو یہ عام بات ہے کہ جہاں تحریر کی کثرت ہوگی وہاں علوم کا رواج ہوگا۔ اور لوگ نئی نئی باتیں بیان کریں گے مگر لغو تحریریں بھی ہو سکتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اب میں انسانوں کو وہ باتیں سکھاؤں گا جو خواہ دینی ہوں یا دنیوی، دُنیا اس سے پہلے نہیں جانتی تھی۔

چنانچہ قرآن کریم نے ایسے علوم بتائے جو نہ تورات میں موجود ہیں نہ انجیل میں اور نہ کسی اور کتاب میں۔ پھر دوسرے علوم بھی اس کے ذریعہ سے کھلنے شروع ہوئے۔ عرب میں شعروں کے قواعد، علم معانی، بیان اور صرف و نحو وغیرہ کے اصول و قواعد کوئی نہ تھے۔ یہ علوم صرف مسلمانوں نے رائج کئے۔ عرب کے جاہل لوگوں کی ساری کائنات لوٹ مار تھی۔ مگر قرآن کریم نازل ہونے کے بعد جن علوم سے وہ ہزاروں سال سے ناآشنا چلے آ رہے تھے ان سے وہ آشنا ہوئے اور وہ ساری دنیا کے علوم کے حامل بن گئے۔ یونانی علوم کی کتابوں کے انہوں نے ترجمے کئے اور پھر ان کے ترجمے یورپ میں گئے۔ سپین میں جب مسلمان پہنچے تو انہوں نے ان کتابوں کے ترجمے کئے اور پھر ان ترجموں سے یورپ نے فائدہ اُٹھایا۔ غرض عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کے بعد ایسا تغیر شروع ہوا کہ وہ باتیں جو دنیا کو پہلے معلوم نہ تھیں ساری دُنیا میں پھیل گئیں۔ اور مسلمانوں نے ایسے علوم ایجاد کئے جو پہلے نہ تھے۔ مثلاً علم الاخلاق، علم النفس، سائنس کے متعلق علوم، علم قضا ان سب علوم کے متعلق نئے اصول تجویز کئے۔ اسی طرح مسلمانوں نے علم روایت نکالا، علم کلام ایجاد کیا، علم قضا اور حکومت کے قوانین مرتب کئے۔ پہلے رومن لاء جاری تھا مگر خود یوروپین مدبروں نے تسلیم کیا ہے کہ اسلامی لاء اس سے بہتر ہے۔ حفظان صحت، علم تصوف اور الجبرا کے علوم بھی مسلمانوں کے ذریعہ نکلے۔ غرض ایک طرف تو قرآن نے ایسی روحانی باتیں بیان کیں جو دنیا پہلے نہ جانتی تھی اور دوسری طرف ایسے دنیوی علوم ظاہر ہوئے جن کے مقابلہ میں پہلے علوم ایک لحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ تین پیشگوئیاں قرآن کریم کے الٰہی کتاب ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

قرآن کریم کی افضلیت کی ایک اور شہادت

مگر ان پیشگوئیوں کے علاوہ قرآن کریم اپنی افضلیت کے لئے ایک چوتھی شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ [19] اس کتاب کے معارف اور حقائق صرف انہی لوگوں پر کھل سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اور اس کی طرف سے پاک کئے گئے ہوں۔ دیکھو قرآن اسی زبان میں آیا جسے لوگ جانتے تھے۔ اس کے الفاظ وہی تھے جو لوگ استعمال کرتے تھے۔ اور عربی جاننے والے لوگ دنیا میں موجود ہیں مگر ان پر قرآن کے معارف نہیں کھلتے۔ معارف انہی پر کھلتے ہیں جو اس کے خدا کا کلام ہونے پر ایمان لاتے اور اپنے اندر پاکیزگی اور طہارت پیدا کرتے ہیں۔ کیا کوئی انسان اپنی تصنیف کردہ کتاب کے متعلق یہ شرط عائد کرسکتا ہے کہ میں نے جو کتاب تصنیف کی ہے اس کے مطالب وہی سمجھے گا جو خدا تعالیٰ کا مقرب ہوگا۔ کوئی انسان اپنی تصنیف کے متعلق اس قسم کی شرط نہیں پیش کرسکتا۔ پس جو کتاب معروف زبان میں ہو مگر اس کے مطالب کا انکشاف دماغی قابلیتوں اور علوم ظاہری کی بجائے تعلق باللہ کے ساتھ وابستہ ہو، اس کے متعلق ماننا پڑے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ اس کے علوم کا ظہور خالی علم وفکر پر کیوں نہ ہوتا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ جس قدر الہامی کتب پائی جاتی ہیں ان کے مطالب ان زبانوں کے جاننے والوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے متعلق یہ شرط ہے کہ خواہ ظاہری طور پر کوئی بڑا عالم نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق رکھتا ہو تو اس پر اس کے معارف کھل جائیں گے۔ چنانچہ جہاں تورات، انجیل، وید اور ژند اَوِستا کے علوم ظاہری عالموں کے ہاتھوں میں ہیں وہاں قرآن کریم کے علوم صرف روحانی علماء اور اولیاء کے ہاتھ سے ہی کھلتے چلے آئے ہیں۔ جیسے سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ، حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ، مولانا رومؒ، امام غزالیؒ، سید احمد صاحب سرہندیؒ، شہاب الدین صاحب سہروردیؒ، شاہ ولی اللہ صاحبؒ یہی لوگ قرآن کریم کے علوم کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے قابل ہوئے ہیں۔ بے شک ظاہری علوم رکھنے والے بعض علماء نے بھی قرآن کریم کی تفسیریں لکھی ہیں لیکن انہوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں بھی کھائی ہیں جو لوگوں کے لئے گمراہی کا موجب ہوئی ہیں لیکن صوفیاء جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتے تھے

انہوں نے ان کا بڑی عمدگی سے رڈ کیا ہے۔

روحانی علماء کے ذریعہ قرآن کریم کے مشکل مقامات کا حل

مثلاً قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کے متعلق آتا ہے۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ [20] یعنی یونس کو بھی یاد کرو جب وہ غضب کی حالت میں چلا گیا اور اسے یہ یقین تھا کہ ہم اسے تنگی میں نہیں ڈالیں گے۔ اس آیت میں لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کے جو الفاظ آتے ہیں ان کے متعلق بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یونسؑ نے یہ خیال کیا کہ خدا اسے گرفتار نہیں کرسکتا۔ مگر حضرت محی الدین ابن عربیؒ اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں لَنْ نُّضِيْقَ عَلَيْهِ [21] یعنی حضرت یونس علیہ السلام کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں تنگی میں نہیں ڈالے گا۔ بلکہ ہر مشکل اور مصیبت میں ان کا ساتھ دیگا۔

غرض عصمت انبیاء کے متعلق ظاہری علماء نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن صوفیاء اس سے محفوظ رہے ہیں بلکہ انہوں نے عصمت انبیاء ثابت کرنے کے لئے بڑی لطیف بحثیں کی ہیں۔

پیدائش عالم کے متعلق ابن عربیؒ کا ایک کشف

اسی طرح دنیا کی پیدائش کے متعلق حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ مجھے کشفی طور پر معلوم ہوا کہ دُنیا کئی لاکھ سال میں مکمل ہوئی ہے اور مکمل ہونے کے سترہ ہزار سال کے بعد انسان کی پیدائش ہوئی ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہوا ہے حالانکہ حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ نے پہلے سے یہ بات اپنی کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ وہ اپنی کتاب فتوحات مکیہ جلد اوّل کے ساتویں باب میں انسان کے متعلق لکھتے ہیں کہ هُوَ اٰخِرُ جِنْسٍ مَوْجُوْدٍ مِنَ الْعَالَمِ الْكَبِيْرِ وَاٰخِرُ صِنْفٍ مِنَ الْمُوَلَّدَاتِ [22] یعنی انسان عالم کبیر کی آخری جنس اور مولّدات ثلاثہ (جمادات، نباتات اور حیوانات) میں سے آخری قسم ہے۔ اور مولّدات ثلاثہ کی پیدائش کا زمانہ وہ اکہتر ہزار سال بتاتے ہیں۔

اسی طرح بعض صوفیاء نے قرآن کریم سے استدلال کر کے لکھا کہ زمین گول ہے۔ چنانچہ

کولمبس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اسے امریکہ کی طرف جانے کا خیال محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اس نے ہسپانیہ کے مسلمانوں سے سنا تھا کہ زمین گول ہے۔ غرض صوفیاء نے تو زمین کے متعلق لکھا کہ وہ گول ہے مگر ظاہری علوم رکھنے والے اسے نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح اجرائے نبوت کے متعلق صوفیاء اور اولیاء نے تو لکھا کہ رسول کریم ﷺ کی غلامی میں نبی آسکتے ہیں۔ جیسے محی الدین صاحب ابن عربیؒ آنے والے مسیح کو امتی بھی اور نبی بھی قرار دیتے ہیں لیکن علماء نے اس کا انکار کیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا چیلنج

اب اسی زمانہ میں دیکھ لو کہ ظاہری علوم رکھنے والوں کی سمجھ میں قرآن کریم کی کوئی بات نہ آئی۔ انہوں نے معذرت کے پیچھے پناہ لینی چاہی اور لکھ دیا کہ قرآن میں خطابیات ہیں یعنی قرآن نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں جنہیں دوسرے لوگ مانتے تھے۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن خود بھی انہیں درست قرار دیتا ہے مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسے رڈ کیا اور اس طرح قرآن کریم کی صداقت ثابت کی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ اعلان کیا کہ کوئی ایسی بات بتاؤ جو روحانیت سے تعلق رکھتی ہو مگر قرآن میں نہ ہو یا قرآن کریم کی بتائی ہوئی باتوں پر جو اعتراض پڑے وہ پیش کرو۔ آپ نے قرآن کریم سے ایسی ایسی معرفت کی باتیں نکالیں کہ انہیں پڑھنے والے سر دُھنتے ہیں اور ان لوگوں کی غفلت اور نادانی پر افسوس کرتے ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے محلِّ اعتراض ٹھہرایا۔ اب آپ کی جماعت پر بھی خدا تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ جیسے قرآن کریم کے معارف آپ کی جماعت کے لوگ بیان کر سکتے ہیں وہ باقی دنیا کے لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔

قرآن کریم دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی پیش کرتا ہے

حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ جن قرآنی علوم اور معارف کا انکشاف ہوا ان میں سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم جو دعویٰ کرتا ہے اس کی دلیل بھی خود ہی دیتا ہے وہ اپنی امداد کے لئے انسانوں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ ورنہ وہ کتاب کس کام کی جو دعویٰ ہی دعویٰ کرتی جائے اور کوئی دلیل نہ دے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ وہی کتاب خدا تعالیٰ کی طرف سے

ہوسکتی ہے جو دوسروں کی امداد کی محتاج نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ دعویٰ تو خود کرے اور دلیل دوسروں پر چھوڑ دے جو زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ دعویٰ تو ہر ایک کرسکتا ہے لیکن دلیل دینا اور اس دعویٰ کو ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔

اخلاق کے متعلق قرآن کریم کی بے نظیر تعلیم

دوسری بات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم نے اخلاق کے متعلق جو تعلیم پیش کی ہے اس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ آپ نے قرآنی علوم کی روشنی میں اخلاق کے ایسے اصول بیان کئے کہ اس وقت کے ترقی یافتہ علم النفس کے ماہرین بھی ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کرسکتے۔ بلکہ اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی باتیں جن کی پہلے یہ لوگ مخالفت کیا کرتے تھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیان فرمانے کے بعد ان کی تائید کرنے لگ گئے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اخلاق کی تعلیم قرآن کریم سے نکالی اور ان سوالات پر روشنی ڈالی کہ اعلیٰ اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے حصول میں کون کون سی روکیں ہیں۔ ان کے پیدا کرنے کے کیا ذرائع ہیں۔ یہ سب باتیں قرآن کریم سے آپ نے پیش کیں اور دنیا پر اسلام کی فضیلت ثابت کی۔

حقیقت نبوت کا اثبات

تیسرے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم سے حقیقتِ نبوت ثابت کی۔ پہلی ساری کتابیں اس بارے میں خاموش ہیں۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق بڑے بڑے پادریوں کو چٹھیاں لکھیں کہ بائبل کی رُو سے نبوت کی کیا تعریف ہے؟ اس پر بعض کی طرف سے یہ جواب آیا کہ ہماری اس کے متعلق کوئی تحقیق نہیں۔ حالانکہ وہ مسئلہ جس پر مذہب کی بنیاد ہے اس کی حقیقت تو معلوم ہونی چاہئے۔ مگر بڑے بڑے پادریوں نے کہا ہمیں معلوم نہیں اور ایک نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ میں نبوت کی تعریف لکھتا ہوں مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حقیقت نبوت قرآن کریم سے ثابت کی اور بتایا کہ ان شرائط کے

ماتحت جن پر وحی نازل ہوا نہیں ہم نبی کہہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ جن پادریوں نے نبوت کے متعلق کچھ لکھا انہوں نے یہی لکھا کہ نبی وہ ہوتا ہے جو پیشگوئیاں کرے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ بائیبل میں ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جو پیشگوئیاں کرتے تھے۔ مگر نبی نہ تھے۔ وہ ان میں اور سچے نبیوں میں یہ فرق نہ بتا سکے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں اس فرق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

قرآن کریم میں اعلیٰ درجہ کی ترتیب

چوتھی بات حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم میں اعلیٰ درجہ کی ترتیب ہے اور اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ حالانکہ اس سے خود مسلمان کہلانے والے بھی انکار کر رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ قرآن کی آیات ایک دوسری سے کوئی جوڑ نہیں رکھتیں۔

قرآنی قِصص میں آئندہ زمانہ کے لئے پیشگوئیاں

پانچویں بات حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم میں کوئی قصہ نہیں۔ یہ ایسا عظیم الشان امر ہے کہ پرانی تفسیروں کا اس نے تختہ اُلٹ دیا۔ وہاں بات بات پر قصہ شروع ہو جاتا ہے اور اس میں ایسی ایسی مضحکہ خیز باتیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں عقل انسانی تسلیم ہی نہیں کر سکتی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ جس قدر واقعات کا قرآن کریم میں ذکر ہے وہ ساری پیشگوئیاں ہیں۔ کوئی قصہ نہیں۔ یہ آئندہ زمانہ میں رونما ہونے والے واقعات تھے جو پورے ہوئے۔

قُربِ قیامت والی پیشگوئیوں کا صحیح مفہوم

چھٹے آپ نے قرآن کریم سے قُربِ قیامت والی پیشگوئیوں کا صحیح مفہوم واضح کیا اور جو لغو باتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کو رد کیا۔

تمام مذاہب باطلہ کا ردّ

ساتویں بات جو نہایت عظیم الشان ہے اور جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ پیش کی کہ جتنے مذاہب نئے یا پرانے ہیں ان سب کا ردّ قرآن کریم میں موجود ہے۔ یہ کتنی آسان بات ہے جس سے قرآن کریم کی فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے۔ برہمو سماج والے کہہ سکتے تھے بتاؤ ہمارے مذہب کا قرآن میں کہاں رد ہے۔ پراٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ کہہ سکتے تھے بتاؤ قرآن ہمارے خلاف کیا دلیل دیتا ہے غرض ہر مذہب والے اس قسم کا مطالبہ کر سکتے تھے مگر کسی نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ چیلنج منظور نہ کیا۔ اب بھی یہ چیلنج موجود ہے۔ کوئی معقول آدمی اپنے مذہب کے متعلق مطالبہ کرے ہم اسی وقت قرآن کریم سے اس کے مذہب کا ردّ نکال کر دکھا دیں گے۔

اپنی ذات میں کامل کتاب

آٹھویں بات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بیان فرمائی کہ قرآن کسی اور کتاب کا محتاج نہیں بلکہ اپنی ذات میں کامل ہے اور تمام ضروری علوم اس میں موجود ہیں۔ یہ صرف جھوٹے مذاہب کا ردّ ہی نہیں کرتا بلکہ ہر ضروری چیز بھی پیش کرتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی ایسا ہے جس کا لوگ تجربہ کر سکتے تھے کیونکہ بعض نئے اخلاق اور نئی قابلیتوں کا علم ہوا تھا۔ ان کے متعلق وہ پوچھ سکتے تھے کہ بتاؤ قرآن میں کہاں ہیں مگر کوئی شخص مقابل میں نہ اُٹھا۔

اعلیٰ درجہ کی روحانی ترقیات عطا کرنے والی کتاب

نویں بات آپ نے یہ پیش کی کہ قرآن میں انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی ترقیات کے گُر موجود ہیں۔ اور اس کے لئے خدا تعالیٰ کے قُرب کے دروازے کھولے گئے ہیں اور ہر قسم کی تدابیر بتائی گئی ہیں جن سے وہ ترقیات حاصل کر سکتا ہے۔

بعث بعد الموت کی حقیقت

دسویں آپ نے بعث بعد الموت کی حقیقت ثابت کی۔ دوزخ کا کیا نقشہ ہوگا۔ کون لوگ اس میں جائیں گے، کیا کیا تکالیف ہونگی۔ اسی طرح یہ کہ جنّت میں کون لوگ ہونگے، اس کی لذات کیسی ہونگی، جنّت دائمی ہوگی یا نہیں۔ غرض ساری باتیں بیان کردیں۔ اس وقت میں ان انکشافات کی مثالیں پیش نہیں کرسکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتابوں میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ بالخصوص ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' اور میری کتاب ''احمدیت'' میں ان کا ذکر ہے۔

مطہّر کی تعریف

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ میں مُطَهَّر کا لفظ استعمال ہوا ہے نہ کہ طَاهِر کا لفظ۔ اس کی وجہ یہ کہ طَاهِر وہ شخص ہوتا ہے جو زُہد و ورع سے ایک پاکیزگی حاصل کرلیتا ہے اور مُطَهَّر وہ ہوتا ہے جو کسی اندرونی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف کھینچا جاتا ہے اور مُطَهَّر کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے قول یا فعل سے ہی ہوتا ہے نہ کہ اس کے کسی عمل یا لوگوں کے کہنے سے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ لوگ جنہوں نے قرآن کریم کی صحیح تفاسیر لکھیں وہ وہی لوگ تھے جو خدا تعالیٰ کے الہام اور اس کے قرب سے مشرّف تھے اور خدا تعالیٰ کی نصرت ان کے شامل حال تھی۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ دلائل سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ قرآن کریم دوسری انسانی کتابوں سے منبع کے لحاظ سے فضیلت رکھتا ہے مگر یہ کیونکر ثابت ہوا کہ دوسری الہامی کتابوں سے بھی افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ الہامی کتب سے بھی قرآن کریم افضل ہے اس لئے کہ گو وہ کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں لیکن بعض صفات کا ظہور ان کے زمانہ میں نہ ہوا تھا۔ مثلاً ایک زمانہ میں اگر خیانت زیادہ پھیلی ہوئی تھی تو اس زمانہ کے نبی پر اس بدی کو دُور کرنے کی صفت ظاہر ہوئی۔ اگر لوگوں میں خشونت اور سختی زیادہ پائی جاتی تھی تو اس زمانہ کے نبی پر رحم اور محبت اور نرمی اور شفقت کی

صفت کا ظہور ہوا۔ لیکن کوئی پہلی کتاب ایسی نہیں جو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کی مظہر ہو۔ کوئی کتاب دو صفات کی یا چار صفات کی یا پانچ صفات کی مظہر تھی مگر کوئی کتاب رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کی مظہر نہ تھی۔ اسی طرح کوئی کتاب قرآن کریم کی طرح اکملیت کی مظہر نہ تھی۔ کوئی کتاب خدا تعالیٰ کی صفت قیوم کی مظہر نہ تھی کیونکہ قرآن کریم سے پہلی ہر ایک کتاب منسوخ ہونے والی تھی لیکن قرآن کریم چونکہ ہمیشہ رہنے والی کتاب تھی اس لئے یہ تینوں صفات قرآن کریم میں ظاہر ہوئیں۔ جو صفات پہلی کتب میں ظاہر ہو چکی ہیں وہ بھی سب کی سب تمام کتب میں ظاہر نہ ہوئی تھیں بلکہ بعض ایک میں اور بعض دوسری میں بیان کی گئی تھیں لیکن قرآن کریم میں وہ بھی سب جمع ہیں۔ پس قرآن کریم منبع کے لحاظ سے بھی افضل ہے۔

اس مضمون کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [۴۳] یعنی آسمان اور زمین کے کمالات ظاہر کرنے والے خدا کا شکر اور اس کی حمد ہے۔ وہ اپنے ملائکہ کو اظہار کمالات کے لئے نازل کرتا رہتا ہے اور ان کے کئی پر ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کئی رنگ کی پناہیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جَنَاحٌ عربی زبان میں پناہ اور حمایت کو بھی کہتے ہیں۔ اور فرشتے جو نازل کئے جاتے ہیں وہ دو دو تین تین چار چار پروں والے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس قدر چاہے اپنی پیدائش میں اضافہ کر دیتا ہے۔ یعنی جیسا موقع ہوتا ہے اتنے ہی پر زیادہ کر دیتا ہے۔

یہاں بتایا کہ سب تعریفیں اللہ کی ہیں جو زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول میں آسمان و زمین کے کمالات کے ظہور کے سامان رکھے گئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ پس قرآن کریم کا نزول ان تمام صفات پر مشتمل ہے جن سے یہ دنیا وابستہ ہے اور فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی صفت کا ظہور اس کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ایک مرکز پر ساری دنیا جمع نہ ہو خدا تعالیٰ کی ہر لحاظ سے تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تبھی کہا جا سکتا ہے جب ساری دنیا کے لحاظ سے رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کی صفت کا اظہار ہو۔ اسی لئے فرمایا کہ اب جو تعلیم آئی ہے یہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ

مَایَشَآءُ کے مطابق آئی ہے۔ پہلے صرف دو دو تین تین چار چار کمالات ظاہر کرنے کے لئے آئی تھی پس قرآن کریم کے نزول میں زمین و آسمان کے کمالات کے ظہور کے سامان رکھے گئے ہیں۔

صفاتِ الٰہیہ اور ان کی مظہریت

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کسی کتاب میں کسی صفت کا ذکر ہونا یہ اور امر ہے اور اس کی صفت کا مظہر ہونا اور امر ہے۔ یوں تو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت اور کتب میں بھی ہے مگر وہ اس صفت کا مظہر ہونے کی مدعی نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرماتا ہے وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [۲۴] یہ کتاب رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کے ماتحت نازل ہوئی ہے۔ چونکہ یہ سارے جہان کو مخاطب کرتی ہے اس لئے ساری کی ساری صفات اس میں ظاہر کی گئی ہیں۔ پس قرآن کریم خدا تعالیٰ کی تمام صفات کا مظہر ہے۔

ظاہری حُسن میں برتری

ایک اور وجہ فضیلت (جسے مَیں نے بارہویں نمبر پر بیان کیا تھا) کسی چیز کا ظاہری حُسن میں دوسری اشیاء پر فائق ہونا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی قسم کی چیزوں میں سے انسان طبعی طور پر ظاہری حسن میں فائق چیز کو منتخب کرتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے یہی چیز انسان کی دلکشی کا موجب بنتی ہے۔ میں نے جب اس لحاظ سے دیکھا تو قرآن کریم کو ظاہری طور پر بھی خوبصورت پایا۔ بلکہ ایسا خوبصورت پایا کہ گو یورپ نے اس خوبصورتی کو مٹانے کے لئے اپنا سارا زور صَرف کر دیا مگر پھر بھی وہ ناکام رہا۔ اس خوبصورتی کو مٹانے کے لئے یورپ نے چار طریق اختیار کئے ہیں۔

عیسائیوں کے چار اعتراضات

اوّل۔ یہ کہا گیا کہ قرآن کریم کا سٹائل (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) نہایت بھدّا ہے۔

دوم۔ یہ کہا گیا کہ اس میں بہت سے غیر عربی الفاظ داخل ہیں۔

سوئم۔ یہ کہ اس میں فضول تکرار ہے یونہی ایک بات کو دُہراتا چلا جاتا ہے۔

چہارم۔ یہ کہ اس کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں۔ کہیں احکام شروع ہیں تو ساتھ ہی وعظ کیا جاتا ہے۔ پھر لڑائیوں کا ذکر آجاتا ہے تو ساتھ ہی منافقوں کو ڈانٹا جاتا ہے۔

لیکن یہ اعتراض جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا درست نہیں بلکہ قرآن کریم کا ظاہری حُسن بھی اسے کُل دنیا کی کتب پر افضل قرار دیتا ہے اور یہ فضیلت دس خوبیوں سے ثابت ہے۔

قرآنی زبان کی فصاحت

اوّل زبان کی فصاحت۔ قرآن کی یہ خوبی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ دشمن نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور عربوں نے تو اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور بڑے بڑے ادیب اس کے کمال کے آگے عاجز آگئے ہیں۔ میں اس کے متعلق دوستوں کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

لبید عرب کا ایک مشہور شاعر تھا جو سات بڑے مشہور شاعروں میں سے ایک تھا۔ پہلے وہ اسلام کا مخالف تھا مگر بعد میں ایمان لے آیا۔ اسلام لانے کے بعد وہ ہر وقت قرآن کریم پڑھتا رہتا۔ اور اس نے شعر کہنے ترک کر دیئے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے زمانہ خلافت میں کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کو چٹھی لکھی کہ اپنے علاقہ کے مشہور شاعروں سے اچھے اچھے اشعار لکھوا کر مجھے بھیجو۔ مغیرہ نے اس کام کے لئے دو شاعر اغلب اور لبید پسند کئے اور اُنہیں کہا گیا خلیفۂ وقت کا حکم آیا ہے کہ کچھ شعر لکھ کر بھیجو۔ اس پر اغلب نے تو قصیدہ لکھا لیکن لبید نے کہا جب سے میں اسلام لایا ہوں میں نے شعر کہنے چھوڑ دیئے ہیں۔ جب انہیں مجبور کیا گیا تو وہ سورۃ بقرہ کی چند آیتیں لکھ کر لے آئے اور کہا کہ ان کے سوا مجھے کچھ نہیں آتا۔ مغیرہ نے لبید کو سزا دی اور اغلب کی حضرت عمرؓ کے پاس سفارش کی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو لبید کی بات کی اتنی لذّت آئی کہ انہوں نے کہا لبید نے جو کچھ کہا ہے اس سے اس کے ایمان کا ثبوت ملتا ہے کہ اتنا قادر الکلام ہونے کے باوجود شرماتا ہے کہ قرآن کے سوا کچھ اور اپنی زبان سے نکالے۔

مسیحیوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ کیا لبید نے پہلے کبھی قرآن نہ سنا تھا جبکہ وہ اسلام کا مخالف تھا۔ وہ دراصل لالچ کے لئے اس طرح کہتا تھا لیکن اس دلیل سے عیسائیت پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایک انسان کئی بار انجیل پڑھتا اور عیسائیوں کے وعظ سنتا ہے مگر

عیسائیت کو نہیں مانتا۔لیکن پھر ایک وقت مان لیتا ہے تو کیا وہ لالچ سے ایمان لاتا ہے؟ یہ ایک طبعی بات ہے کہ انسان بعض اوقات ایک بات کا انکار کر دیتا ہے لیکن جب اس پر صداقت کھلتی ہے تو اسے مان لیتا ہے۔ایسا ہر مذہب میں ہوتا ہے۔کئی لوگ ہندو ہو جاتے ہیں۔اب کیا انہیں کہا جاتا ہے کہ اتنے سال تو تم ہندو مذہب کا ذکر سنتے رہے اور ہندو نہ ہوئے؟ اب جو ہندو ہوئے ہو تو کسی لالچ کی وجہ سے ہوئے ہو؟ دراصل یہ بہت بودی دلیل ہے اور سوائے اس کے جو خود لالچی ہو اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔

یوں تو دنیا میں بڑی اچھی اچھی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور ان کی قبولیت بھی ہوتی ہے۔مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہے جس کے لکھنے والے نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا ہو کہ یہ سب سے افضل اور اعلیٰ ہوگی اور اس کی قبولیت لوگوں میں پھیل جائے گی۔یوروپین لوگ کہتے ہیں شیکسپیئر جیسا کلام کوئی نہیں لکھ سکتا۔گو خدا کی قدرت ہے جب سے قرآن پر یوروپین اعتراض کرنے لگے ہیں ایسی سوسائٹیاں بھی بن گئی ہیں جو شیکسپیئر کی تحریروں پر اعتراض کرتی ہیں۔لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ اچھا لکھنے والا تھا تو دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا لکھتے وقت اس نے کہا تھا کہ اس کا کلام تمام کلاموں سے افضل رہے گا۔اس نے یقیناً ایسا نہیں کہا۔مگر قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کتاب کا مقابلہ کرنے سے دنیا عاجز رہے گی۔میں نے بینٹ کی ایک کتاب پڑھی ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ جب میں نے یہ کتاب لکھی تو سمجھا کہ بہت مقبول ہوگی مگر چھاپنے والوں نے اس کی اشاعت میں لَیت ولَعَل کیا اور پبلک نے بھی قدر نہ کی۔پس کوئی لکھنے والا نہیں جانتا کہ اس کی کتاب مقبول ہوگی یا نہیں۔مگر قرآن نے پہلے سے کہہ دیا تھا کہ یہ کتاب تمام کتب سے افضل ہے اور ہمیشہ افضل رہے گی۔

پھر عرب وہ ملک تھا جس کا تمام کمال زبان دانی پر تھا۔اس ملک میں قرآن آیا اور ان لوگوں کی زبان میں آیا۔اور پھر اس نے ایسا تغیر پیدا کر دیا کہ عربوں کا طرز کلام ہی بدل ڈالا اور انہوں نے قرآن کی طرز اختیار کر لی۔ان کی طرز تحریر بدل گئی۔پرانا سٹائل جاتا رہا اور قرآن کریم کے سٹائل پر ہی سب چلنے لگے۔

بعض لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو ماننے والوں نے ایسا کرنا ہی تھا۔میں کہتا

ہوں بائبل، انجیل اور ویدوں کے ماننے والوں نے کیوں ایسا نہ کیا۔ وہ بھی تو ان کتابوں کو خدا کی طرف سے مانتے تھے۔

قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ

یہ اعتراض کہ قرآن میں غیر زبانوں کے الفاظ آگئے ہیں یہ بھی درست نہیں۔ کوئی زبان خواہ وہ نئی ہو یا پرانی غیر زبانوں کے الفاظ سے پاک نہیں ہوسکتی۔ اعتراض تب ہوتا جب عربی زبان میں وہ الفاظ جاری نہ ہوتے اور عرب کہتے کہ ہم ان الفاظ کو سمجھ نہیں سکتے۔ جب عرب قرآن کے الفاظ کو سمجھ جاتے تھے اور مکہ والے سمجھ لیتے تھے عرب میں وہ الفاظ جاری تھے اور وہ الفاظ عربی زبان کا ایک حصہ ہو چکے تھے تو خواہ وہ غیر زبان کے ہی ہوں کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں اگر قرآن نے ہی وہ الفاظ عربی میں داخل کئے ہوں تب بھی یہ قرآن کی بہت بڑی طاقت کی علامت ہے کہ وہ الفاظ عربوں میں رائج ہو گئے کیونکہ جو قادر الکلام نہ ہو اس کی بات چل نہیں سکتی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی قادر الکلام اپنے کلام میں غلطی بھی کرے تو اسے ایجاد کہیں گے غلطی نہیں کہیں گے کیونکہ وہ زبان پر عبور رکھتا ہے۔ پس اگر قرآن میں نئے الفاظ آئے اور وہ عربی زبان کا جزو بن گئے تو یہ قرآن کا اور زیادہ معجزہ ہے۔ مگر یہ درست نہیں کہ غیر زبانوں کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں۔ دراصل یہ دھوکا اس وجہ سے لگا ہے کہ عربی اور عبرانی زبان کے بعض الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ بعض محاورات بھی آپس میں مل گئے ہیں۔ اس سے یہ غلط طور پر سمجھ لیا گیا کہ قرآن میں غیر زبانوں کے الفاظ آگئے ہیں۔ مثلاً فُرْقَان ایک لفظ ہے۔ اس کے تمام مشتقات عربی میں موجود ہیں۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ قرآن نے یہ لفظ باہر سے لیا ہے غلط ہے۔ اسی طرح رَحْمٰن کے متعلق اعتراض کرتے ہیں حالانکہ یہ بھی عربی لفظ ہے۔

لفظ رَحْمٰن کی حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ محققین یورپ کو یہ دھوکا قرآن کریم کی اس آیت سے لگا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ۔ [۴۵] یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ

خدائے رحمٰن کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ تو وہ کہتے ہیں ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ معترضین کہتے ہیں۔ یہ آیت اس بات کی سند ہے کہ غیر زبان کے الفاظ قرآن میں آئے ہیں کیونکہ عرب کے لوگ کہتے ہیں ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ اگر یہ غیر زبان کا لفظ نہ ہوتا تو وہ کیوں ایسا کہتے حالانکہ معترضین اس آیت کے معنے ہی نہیں سمجھے۔ کفار کا اعتراض لفظ رَحْمٰن پر نہیں تھا بلکہ اس اصطلاح پر تھا جو قرآن نے رَحْمٰن کے لفظ کے ذریعہ پیش کی تھی۔ قرآن نے یہ نئی اصطلاح پیش کی تھی جو عربوں میں رائج نہ تھی۔ جیسے صَلٰوۃ عربی لفظ ہے مگر اصطلاحی صلوٰۃ قرآن نے پیش کی ہے۔ اس کے متعلق بھی کفار کہہ سکتے تھے کہ ہم نہیں جانتے صلوٰۃ کیا ہوتی ہے۔

پس ان لوگوں کا اعتراض درحقیقت اسلامی اصطلاح پر تھا اور انہوں نے یہ کہا کہ اس کا جو مطلب قرآن پیش کرتا ہے وہ ہم نہیں جانتے اور اصطلاحِ جدید علم جدید کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ایک طرف تو قرآن میں آتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ [۲۶] یعنی ہم نے ہر ایک رسول کو اس کی قوم کی زبان میں ہی وحی دیکر بھیجا ہے۔ اور دوسری طرف سورۃ ہود میں آتا ہے۔ مخالفین نے حضرت شعیبؑ سے کہا۔ یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ [۲۷] اے شعیب! ہماری سمجھ میں تیری اکثر باتیں نہیں آتیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام کسی ایسی زبان میں باتیں کرتے تھے جسے وہ لوگ سمجھ نہ سکتے تھے بلکہ یہ ہے کہ جو دینی باتیں وہ بیان کرتے تھے اور جو جو مسائل وہ پیش کرتے تھے انہیں وہ لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

اہلِ عرب میں رَحْمٰن کا استعمال

وہ الفاظ جو قرآن نے استعمال کئے ہیں وہ ان لوگوں میں پہلے سے موجود تھے۔ چنانچہ رَحْمٰن کا لفظ بھی ان میں استعمال ہوتا تھا۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ [۲۸] یعنی وہ کہتے ہیں کہ اگر رَحْمٰن کا یہی منشاء ہوتا کہ ہم شرک نہ کریں تو ہم شرک نہ کرتے۔ غرض رَحْمٰن کا لفظ وہ بولا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے رَحْمٰن اس ہستی کو قرار دیا ہے جو بغیر محنت کے انعام دیتی ہے۔ اور یہ بات وہ لوگ نہیں مانتے تھے کیونکہ اس کے ماننے سے ان کا

شرک باطل ہو جاتا تھا۔ غرض وَمَا الرَّحْمٰن کے یہ معنی نہیں کہ عرب کے لوگ رَحْمٰن کا لفظ نہیں جانتے تھے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس اصطلاح کے قائل نہ تھے جو قرآن نے پیش کی۔ بہر حال قرآن کریم کی فصاحت اس کے حسن کا ایک روشن ثبوت ہے۔ اور پھر قرآن کریم کی یہ فصاحت ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ آج تک علمِ ادب پر اس کا اثر ہے اور زبانِ عربی کی ترقی کو اس نے ایک خاص لائن پر چلا دیا ہے۔ حتٰی کہ عرب مسیحی مصنف بھی قرآن کی تعریف کرتے تھے اور ان کے مدارس میں قرآن کریم کے ٹکڑے بطور ادب کے رکھے جاتے تھے۔ ایک جاہل ملک میں ایک کتاب کا لوگوں کو والہ و شیدا بنا دینا اور انہیں جاہل سے عالم کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

قرآن کی اعلیٰ درجہ کی ترتیب

قرآن کریم کی دوسری ظاہری خوبی اس کی اعلیٰ درجہ کی ترتیب ہے۔ ترتیب کا اعلیٰ ہونا بذات خود روحانیت سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ مجرد ترتیب انسانی کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترتیب ایک ظاہری خوبی ہے جو کسی کلام کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ اور اس خوبی کے لحاظ سے بھی قرآن کریم تمام دوسری کتب سے افضل ہے۔ بظاہر وہ ایک بے ترتیب کلام نظر آتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب موجود ہے بلکہ جہاں سب سے بڑھ کر بے ترتیبی نظر آتی ہے وہاں سب سے زیادہ ترتیب ہوتی ہے۔ اور یہی اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسی کتاب نہیں لکھ سکتا جو بظاہر تو بے ترتیب ہو مگر غور کرنے سے اس میں اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہو۔ پس اس حُسن میں بھی قرآن کریم نہ صرف دوسری کتب کے مشابہ ہے بلکہ ان سے افضل ہے۔ اس وجہ سے کہ معروف ترتیب کی اتباع کرنا ایک عام بات ہے۔ ہر عقلمند ایسا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم کی ترتیب میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو دوسری کتب میں نہیں اور وہ خصوصیات یہ ہیں۔

ترتیبِ قرآن کی چند خصوصیات

اوّل۔ اس کی ترتیب بظاہر مخفی ہے مگر غور اور تامّل سے ایک نہایت لطیف ترتیب معلوم ہوتی

ہے اور کسی انسانی کتاب میں اس قسم کی ترتیب کی مثال نہیں ملتی کہ بظاہر ترتیب نہ ہو لیکن غور کرنے پر ایک مسلسل ترتیب نظر آئے جو نہایت لطیف اور فلسفیانہ ہو۔

اس وقت میں قرآن کریم کی ترتیب کے متعلق مثالیں دینے سے معذور ہوں کیونکہ جس مقام کی بھی میں ترتیب بیان کروں گا کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقام خاص طور پر چُن لیا گیا ہے۔ میں نے بعض دوستوں سے کہا تھا کہ وہ کوئی مثال ایسی چُن دیں جس کی ترتیب عام لوگوں کو معلوم نہ ہو اور جو بے جوڑ فقرے نظر آتے ہوں مگر افسوس ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع نہ تھا اس لئے وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکے اور میں خود سردرد کی وجہ سے ایسا مقام نہ نکال سکا ورنہ بتاتا کہ قرآن کریم میں کیسی اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔

دوم۔ قرآن کریم بغیر اس کے کہ ترتیب کی طرف اشارہ کرے علم النفس کے ماتحت اپنے مطالب کو بیان کرتا ہے اور جو سوال یا جو ضرورت کسی موقع پر پیش آتی ہے اس کا اگلی عبارتوں میں جواب دیتا ہے۔ گویا اس کی ہر اگلی آیت میں پچھلی آیات کے مطابق جو سوال پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ اور یہ باریک ترتیب اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔ بائیبل کے متعلق لوتھر لکھتا ہے:-

"The Gospels do not keep order in their account of miracles and deeds of jesus. This is of small moment. When there is dispute about Holy Writ and no comparison is possible let the matter drop. ۲۹

Emile Ludwidg in his book " son of man" says, "Almost all the contradictions arise out of the disorderly nature of the reports."۳۰

The Gospels, the four main sources of knowledge, contradict one another in many respects and are upon some points contradicted by the scanty non-Christians authoriteis."۳۱

Moreover there is confusion in serial arrangement, a confusion which has been deplored through- out centuries.۳۲

یعنی بائیبل میں ترتیب واقعات کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس اس کے بیانات کے بارہ میں جب کوئی جھگڑا پیدا ہو اور سلجھاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دے تو اسے چھوڑ دینا چاہئے۔

اِیمل لُڈ وِگ (Emil Ludwidg) نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ موجودہ انجیل ہمیں بالکل بے ترتیب نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کتاب ''ابن آدم'' میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انجیل میں ہمیں جو بھی تضاد نظر آتا ہے وہ واقعات کے بے ترتیبی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اناجیل جو ہمارے علم کے چار بڑے چشمے ہیں کئی امور میں ایک دوسرے کے مخالف بیانات کی حامل ہیں اور غیر عیسائی محققین نے بھی انہیں متضاد قرار دیا ہے، اس کے علاوہ ان کی ترتیب میں اس قدر اُلجھنیں ہیں کہ صدیوں سے خود مسیحی اس پر افسوس کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔

اسی طرح ویدوں کو پڑھا جائے تو وہاں بھی ترتیب کا کچھ پتہ نہیں لگتا اور یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ سے کیا جوڑ ہے۔

مختصر آیات میں حقائق ومعارف کی کثرت

تیسری خوبی جو قرآن کریم کے ظاہری حُسن کو نمایاں کرتی ہے وہ اس کے مضامین کا باوجود اختصار کے مفصّل ہونا ہے۔ چنانچہ ایک ایک آیت کئی کئی مطالب بیان کرتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر اس میں علم کلام، علم تاریخ، علم اوامر اور علم نواہی سب ایک ہی وقت میں کام کررہے ہوتے ہیں اور آئندہ کے لئے پیشگوئیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس خوبی کی وجہ سے ایک طرف تو قرآن کریم نہایت مختصر ہے اور دوسری طرف جو اس میں عظیم الشان مطالب بیان ہیں وہ بائیبل اور دوسری الہامی کتب میں مل ہی نہیں سکتے۔ اس کی ایک مثال میں نے ابھی دی ہے کہ ایک چھوٹی سی آیت میں تین عظیم الشان پیشگوئیاں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کے علاوہ قرآن کریم کا کوئی مقام لے لو یہ بات واضح ہوجائے

گی۔ میں اس کے مزید ثبوت کے لئے پھر پہلی آیت کو ہی لے لیتا ہوں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کی لطیف تفسیر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔ ان چند آیات میں پہلے تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ فرمایا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ پڑھ اس کلام کو۔ مگر جب پڑھنے لگو تو یہ کہہ لینا کہ میں اللہ کا نام لے کر اسے پڑھتا ہوں۔ اس میں استثنا باب ۱۸ کی آیت ۱۸، ۱۹ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ:-

> ''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا۔ وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لونگا۔'' [۳۳]

پس بِاسْمِ رَبِّكَ میں موسیٰ کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ پیش کیا گیا ہے اور نبوت کے تسلسل کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اِقْرَاْ میں تبلیغ کے واجب ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کئی کلام ایسے ہوتے ہیں جو خود پڑھنے والے کے لئے ہوتے ہیں، دوسروں کو سنانے کے لئے نہیں ہوتے مگر اس کلام کے متعلق فرمایا یہ ساری دنیا کے لئے ہے، جا اور اُسے سنا۔ اس میں تبلیغ اسلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسری بات رَبِّکَ الَّذِيْ خَلَقَ میں یہ بتائی کہ اس کلام کے پیش کرنے میں تمہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی مگر تُو اس ربّ کا نام لے کر پڑھ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں یہ اشارہ کیا کہ یہ کلام صرف بنی اسرائیل کے لئے یا اہل ہنود کیلئے نہیں یہ اَلْاِنْسَان کے لئے ہے اور جب ایک قوم کو مخاطب کرنے والوں کو دکھ اور تکالیف اُٹھانی پڑیں تو تم جو ساری دنیا کو مخاطب کر رہے ہو تمہیں کس قدر مشکلات پیش آئیں گی۔ مگر کسی بات سے ڈرنا نہیں یہ کلام تیرے رب کی طرف سے آیا ہے اور باوجود اس کے کہ ساری دنیا اس کی مخاطب ہے اور اس وجہ سے ساری دنیا

تیری مخالف ہوگی تیرا رب تیرے ساتھ ہوگا۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا کہ تیری آہستہ آہستہ ترقی ہوگی کیونکہ رب آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ ترقی دینے والے کو کہتے ہیں۔

چوتھی بات یہ بیان کی کہ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اس میں ایک تو اس طرف توجہ دلائی کہ اے انسان! دیکھ تیری پیدائش کتنی ادنیٰ ہے پھر تو خیال بھی کس طرح کر سکتا ہے کہ اپنی کامیابی کے ذرائع خود معلوم کرلے گا۔ دوسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرف توجہ دلا دی کہ انسان کو عَلَق سے پیدا کیا گیا ہے یعنی اس میں قدرتی طور پر تعلق باللہ کا مادہ رکھا گیا ہے اور یہ بات تمہاری معاون ہوگی۔ پس تمہیں گھبرانا نہیں چاہئے اور مایوسی کو کبھی اپنے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہئے۔

غرض ایک چھوٹی سی آیت میں تاریخ، علم کلام، تبلیغ، انسان کی پیدائش اور انسان کی مخفی طاقتوں کا ذکر کر دیا۔ اور ابھی یہ باتیں ختم نہیں ہوئیں اور بھی کئی علوم کا اس میں ذکر ہے۔

قرآن کریم کی مقفّٰی عبارت

چہارم قرآن کریم کی عبارت مقفّٰی ہوتی ہے۔ قافیہ بندی کے ساتھ اگر مضمون خراب ہو جائے تو وہ مقفّٰی عبارت بُری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کی عبارت باوجود مقفّٰی ہونے کے ایسی ہے جس سے صرف مضمون کی عظمت ہی قائم نہیں ہوتی بلکہ نئے نئے معارف بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر سورۃ جمعہ کو لے لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ۔ وَّاٰخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ [۳۴]

دیکھو کس طرح ان آیات میں توازن کو قائم رکھا گیا ہے۔ یہ ہے تو نثر مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اشعار ہیں۔ مگر باوجود اس کے کوئی لفظ زائد نہیں۔ شاعر تو مضمون کے لحاظ سے الفاظ کو آگے پیچھے

کرنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر یہاں ایسا نہیں کیا گیا۔

یہ آیتیں اس زمانہ کے متعلق ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ شعر ہیں۔ وزن قائم رکھنے کے لئے ان میں توازن کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور مقفّٰی عبارت ہے مگر ترتیب خراب نہیں ہوئی۔ نہ کوئی زائد چیز آئی ہے، ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر ہے۔

سورۃ جمعہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر

خدا تعالیٰ فرماتا ہے یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ہر ایک چیز خواہ وہ آسمانوں میں ہے خواہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ یعنی ہر چیز ثابت کرتی ہے کہ خدا بے عیب ہے۔ اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ وہ مَلِک ہے، قدوس ہے، عزیز ہے، حکیم ہے۔ یہاں قافیہ کے لحاظ سے حکیم پیچھے آیا ہے۔ اگر ملک پیچھے آتا تو وزن قائم نہ رہتا۔ آگے اسی ترتیب سے مضمون چلتا ہے۔ پہلی صفت خدا تعالیٰ کی یہ بیان کی تھی کہ وہ اَلْمَلِكُ یعنی بادشاہ ہے۔ اور بادشاہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ رعایا کی بہتری اور بہبودی کے احکام جاری کرے۔ اس لئے فرمایا هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ جب خدا تعالیٰ ساری دنیا کا بادشاہ ہے تو اس نے اپنی رعایا کو احکام پہنچانے کے لئے امیین میں ایک رسول بھیجا اور اپنا نائب مقرر کیا مگر یہ نائب باہر سے مقرر نہیں کیا بلکہ تم میں سے ہی بھیجا۔

دوسری صفت یہ بیان کی تھی کہ وہ اَلْقُدُّوْس ہے اس کے متعلق فرمایا يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہر ایک چیز پاکیزہ ہو اس لئے اس نے رسول کو اپنی آیات دے کر بھیجا تا کہ وہ آیات لوگوں کو سنائے اور ان میں دماغی اور روحانی پاکیزگی پیدا کرے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی آیات سکھا کر انسانی دماغ کو پاک کرے اور پھر يُزَكِّيْهِمْ ان کے اعمال کو پاک کرے۔

تیسری صفت یہ بیان کی تھی کہ اَلْعَزِيْز وہ غالب ہے۔ اس کے لئے فرمایا۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ ان کو کتاب سکھائے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ کوئی بات وہی سکھا سکتا ہے جس کے شاگرد ہوں۔ چونکہ عَزِيْز کے معنی غالب کے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں یہ رکھا کہ اس

رسول کو ہم ایک جماعت دیں گے جسے یہ سکھائے گا اور اسے دنیا پر غلبہ بخشے گا کیونکہ میں اسے اپنی صفت عزیز کے ماتحت بھیج رہا ہوں۔

چوتھی صفت اَلْحَکِیْمِ بیان کی تھی۔اس کے متعلق فرمایا وَالْحِكْمَةَ کہ وہ حکمت سکھائے گا۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اور گو اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے مگر پھر بھی یہ رسول اس کتاب کو منوالے گا۔

اس کے بعد فرمایا وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ یہ رسول کچھ اور لوگوں کو بھی سکھائے گا جو ابھی ان سے نہیں ملے۔ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ قرآن کی عبارت تو مقفّٰی بتائی جاتی ہے لیکن یہ ترتیب کیسی ہے کہ انہیں الفاظ کو پھر دُہرا دیا گیا ہے جو پہلے آ چکے ہیں اور بغیر ضرورت کے صرف قافیہ بندی کے لئے لائے گئے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہی الفاظ آنے چاہئیں تھے۔ اس کی وجہ ہے کہ جب کہا گیا وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ کہ یہ رسول ایک اور جماعت کو بھی سکھائے گا جو ان لوگوں سے نہیں ملی تو گویا بتایا کہ ان لوگوں میں اور اس جماعت میں ایک وقفہ ہوگا۔ اور دوسرے لوگ کچھ مدت کے بعد آئیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد مسلمانوں میں سے قرآن مٹ جائے گا اور پھر بعد میں آنے والوں کو سکھایا جائے گا۔ ورنہ اگر وقفہ نہیں پڑنا تھا تو یہ بات بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پیچھے آنے والے آخر پہلوں سے ہی سیکھا کرتے ہیں۔ اس کے ذکر کی یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا تھا جس میں قرآن دانی مٹ جانی تھی۔ اور پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو قرآن سکھایا جانے والا تھا۔

اب یہ صاف بات ہے کہ درمیانی وقفہ کسی نقص کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس نقص کے ازالہ سے ہی اس امر کو دوبارہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ پس دوبارہ عَزِیْزٌ وَحَكِیْمٌ کہہ کر بتایا کہ یہ وقفہ دشمنانِ اسلام کے غلبہ ظاہری اور ان کی علمی اور فلسفی اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے ہوگا۔ اور مسلمان ان سے متاثر ہو کر قرآن کو چھوڑ دیں گے۔ مگر پھر خدا تعالیٰ ان کو غلبہ عطا فرمائے گا کیونکہ وہ عزیز ہے۔ چونکہ دوسروں کو حکومت ملنی تھی اور اس سے مسلمانوں پر رُعب چھا جانا تھا اور ایسے علوم نکل آنے تھے جن کی وجہ سے اسلام پر حملہ کیا جاتا اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس وقت بھی

اپنی صفات عزیز اور حکیم کا اظہار کریں گے اور مسلمانوں کو دوسروں کے مقابلہ میں غلبہ دیں گے۔ اور ان علوم کا بھی رد کریں گے جو قرآن کے مقابلہ پر آئیں گے کیونکہ اصل غلبہ اللہ تعالیٰ کو ہے اور علوم اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ پس وہ باوجود ان فتن کے رسول کریم ﷺ کی تعلیم کو دوبارہ دنیا میں قائم کر دے گا۔

غرض ان الفاظ کا تکرار صرف مقفّی عبارت کے لئے نہیں بلکہ عین اس ترتیب کے ماتحت ہے جس کی یہاں ضرورت تھی۔

قرآنی آیات کا لطیف توازن

(۵) پھر قرآن کریم کی ایک ظاہری خوبی اس کے الفاظ کا لطیف توازن ہے کہ بظاہر نثر ہے مگر نظم کے مشابہ ہے اور یہ امر اس کی عبارت کو ایسا خوبصورت بنا دیتا ہے کہ کوئی اور کتاب اب تک اس کی نقل نہیں کر سکی خواہ وہ ناقص نقل ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی قرآن کریم کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ چونکہ قرآن کریم حفظ کیا جانا تھا اس لئے ضروری تھا کہ یا تو اشعار میں ہوتا یا اشعار سے ملتا جلتا ہوتا۔ قرآن کریم کو خدا تعالیٰ نے ایسے انداز میں رکھا کہ جس قدر جلدی یہ حفظ ہو سکتا ہے اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ توازن الفاظ ہی ہے اور پڑھتے وقت ایک قسم کی ربودگی انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم میں ذکر الٰہی کی کثرت

(۶) چھٹی خوبی قرآن کریم کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ذکر کی اس میں اتنی کثرت ہے کہ جب انسان قرآن کھولتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سارے کا سارا قرآن ہی خدا تعالیٰ کے ذکر سے پُر ہے۔ چنانچہ مکہ کے کئی مخالف جو سخت دشمن ہوا کرتے تھے جب کبھی رسول کریم ﷺ کی مجلس میں بیٹھ جاتے تو کہتے وہاں تو اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہوتا رہتا ہے۔ غرض قرآن کریم نے اس طرح عظمت الٰہی کو بار بار بیان کیا ہے کہ انسان اس امر کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ اور ہر خدا تعالیٰ سے

ff17

محبت رکھنے والا دل اس کثرت سے ذکر الٰہی کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے۔ محمد کے متعلق خواہ کچھ کہو لیکن اس کے کلام میں خدا ہی خدا کا ذکر ہے۔ وہ جو بات پیش کرتا ہے اس میں خدا کا ذکر ضرور لاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کا عاشق ہے۔ یہ مخالفین کی قرآن کریم کے متعلق گواہی ہے کہ وہ ذکر الٰہی سے بھرا ہوا ہے۔ اور ذکر الٰہی ہی مذہب کی جان ہے۔ لیکن دوسری کتب اس سے عاری ہیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت کو ضائع کرتی ہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں بندوں کے قصّے کہانیاں زیادہ ہیں اور اللہ کا ذکر کم ہے۔

سخت کلامی سے مبرّا کتاب

ساتویں خوبی قرآن کریم کی یہ ہے کہ وہ سخت کلامی سے مبرّا ہے اور یہ بھی حسن کلام کی ایک قسم ہے۔ کوئی نہیں جو یہ کہہ سکے کہ اس میں گالیاں ہیں۔ پھر نہ صرف قرآن سخت کلامی سے مبرّا ہے بلکہ نہایت لطیف اور دلنشیں پیرایہ میں یہ نصیحت کرتا ہے کہ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ [۳۵] یعنی تم ان معبودانِ باطلہ کو گالیاں مت دو جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو گالیاں دو گے تو وہ اللہ کو گالیاں دیں گے بغیر یہ سمجھنے کے کہ اللہ تو سب کا ہے۔

پھر فرماتا ہے كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ [۳۶] اسی طرح ہم نے ہر ایک قوم کے لئے اس کے عمل خوبصورت کر کے دکھائے ہیں۔ یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ چونکہ ان لوگوں کے معبود جھوٹے ہیں اس لئے انہیں بُرا بھلا کہنے میں کیا حرج ہے۔ یہ لوگ اب شرک کے عادی ہو چکے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے اس بُرے کام کو بھی اچھا سمجھنے لگ گئے ہیں اس لئے اگر تم انہیں گالیاں دو گے تو فتنہ پیدا ہو گا اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کو گالیاں دینے لگ جائیں گے۔

کیا ہی لطیف نکتہ قیام امن کے متعلق بیان کیا کہ کسی کے بزرگوں اور قابل تعظیم چیزوں کو بُرا بھلا نہ کہا جائے کیونکہ اس سے آپس کے بہت سے جھگڑے اور فساد رُک سکتے اور بہت اچھے تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔

فحش کلامی اور ہر قسم کی بداخلاقی سے منزّہ کتاب

آٹھویں ظاہری خوبی قرآن کریم میں یہ ہے کہ وہ فحش کلامی اور ہر قسم کی بداخلاقی کی تعلیم سے منزّہ ہے۔ یعنی اس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے پڑھ کر طبیعت منغض ہو جائے یا شرمائے یا بداخلاقی معلوم ہو۔ قرآن کریم ایک شریعت کی کتاب ہے۔ اور بوجہ شریعت ہونے کے اسے ایسے مضامین پر بھی بحث کرنی پڑتی ہے جو نہایت نازک ہوتے ہیں مگر وہ اس طرح ان کو بیان کرجاتا ہے کہ جن کو پڑھ کر جو واقف ہے وہ تو سمجھ جائے اور جس کی عمر ابھی سمجھنے کی نہیں اسے خاموش گذار دیا جائے۔ مثلاً اس میں مرد اور عورت کے تعلقات کا ذکر ہے۔ طہارت اور پاکیزگی کے متعلق احکام بیان ہیں۔ مگر ان احکام کو ایسی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ بات بھی کہہ دی گئی ہے اور عُریاں الفاظ بھی استعمال نہیں کئے گئے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں دوسری کتابوں میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے شرم آجاتی ہے۔ جیسا کہ پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۱ تا ۳۸ میں حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ایک گندے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہاں عورتیں بھی بیٹھی ہیں اس لئے میں اس حوالہ کو نہیں پڑھتا۔ احباب بائیبل سے اس حوالہ کو خود پڑھ لیں۔ انجیل میں فحش تو نہیں مگر ایک بات اس میں بھی ایسی ہے جو بچوں کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ اور وہ یہ کہ متی باب ۱۲ میں لکھا ہے۔

> ”جب وہ (مسیح) بھیڑ سے یہ کہہ ہی رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا۔ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا۔ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔“[۲۷]

حضرت مریمؑ حضرت مسیحؑ پر ایمان لانے والی تھیں مخالف نہ تھیں مگر باوجود اس کے انجیل کے بیان کے مطابق آپ نے ان کی پروانہ کی۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ ماں باپ خواہ مخالف ہوں، ان کی عزت و توقیر کرنا تمہارا فرض ہے۔

پھر رگوید جلد اوّل کتاب ۴ دُعا ۱۸ میں اِندر دیوتا کی پیدائش کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

Not this way go I forth: hard is the passage.
Forth from the side obliquely will I issue. Much
that is yet undone must I accomplish. [۳۸]

یعنی اندر نے اپنی پیدائش کے وقت کہا میں ماں کی پسلیوں میں سے نکل کر جاؤں گا۔

اسی طرح اتھر وید جلد اوّل کتاب ۳ دُعا ۲۵ میں عملِ حُبّ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اے عورت تُو چوری چُھپے اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل کر بھاگ چل۔

اتھر وید جلد اوّل کتاب ۵ دُعا ۲۵ صفحہ ۲۲۹۔۲۳۰ میں لڑکا پیدا ہونے کے متعلق نہایت فحش دُعا درج ہے۔ پھر مرد عورت کے تعلقات کا ایسا گندہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کوئی ماں باپ اپنے لڑکے لڑکیوں کو پڑھنے کے لئے ایسی کتاب نہیں دے سکتے۔ لیکن قرآن کریم شروع سے لے کر آخر تک ایسی پاک زبان میں ہے کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

ظاہر سے باطن کی طرف لے جانے والا کلام

نویں خوبی قرآن کریم کی یہ ہے کہ وہ ظاہر سے باطن کی طرف لے جاتا ہے۔ کہیں چلتے پانیوں سے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہیں برستے بادلوں کا ذکر کر کے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہیں چمکتی بجلی میں خدا تعالیٰ کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہیں دفن ہونے والے مُردوں کا ذکر کر کے خدا تعالیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہیں پیدا ہونے والے بچوں کا حوالہ دیکر قدرتِ خدا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہیں نجاستوں اور گندوں کا ذکر کر کے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ کہیں پاکیزگی کی ترغیب اور تحریص دلانے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ غرض قرآن پڑھ کر انسانی فطرت بول اُٹھتی ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے انسانی قلب کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ لیکن دوسری کتب میں اس طرح قانونِ نیچر کی طرف توجہ نہیں دلائی گئی۔

جذباتِ انسانی سے اپیل

دسویں خوبی قرآن کریم کی یہ ہے کہ وہ انسان کے اعلیٰ جذبات سے اپیل کرتا ہے۔ انسانی

پیدائش کی خوبیاں بتاتا ہے۔انسانی طاقتوں اور قوتوں کا ذکر کرتا ہے اور تحریک کرتا ہے کہ ان سے کام لو اور ترقی کرو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتاتا ہے کہ ان باتوں سے بچو ورنہ ترقی سے محروم رہ جاؤ گے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہر سلیم الفطرت انسان متاثر ہوتا ہے۔

غرض ظاہری حسن میں بھی قرآن کریم ایک افضل کتاب ہے اور اس کی عبارت کو پڑھ کر انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہاں جو لوگ قصوں کے شیدا ہیں ان پر اس کی عبارت بیشک گراں گذرتی ہے۔

قرآن کریم میں تکرار پائے جانے کا اعتراض

قرآن کریم کی ظاہری خوبیوں کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے میں جواب دے چکا ہوں۔ اب ایک اعتراض باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ قرآن ایک ایک فقرہ کو بار بار دُہراتا ہے۔اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ دہرانے کا اعتراض قرآن کریم پر عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرف سے کیا جاتا ہے لیکن خود ان کی الہامی کتابیں اس کی زد میں آتی ہیں۔ بائیبل میں کئی باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ چاروں اناجیل میں تکرار موجود ہے۔ وہی بات جو متی کہتا ہے مرقس، لوقا اور یوحنا بھی اسی کو دُہراتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کی کتابوں میں تکرار پایا جاتا ہے۔ مثلاً اتھر وید جلد اوّل کتاب ۲ دُعا ۷ ۲ اور رِگ وید جلد اوّل کتاب اوّل دُعا ۹۶ میں تکرار موجود ہے۔ اگر تکرار قابلِ اعتراض بات ہے تو ان پر بھی کیوں اعتراض نہیں کیا جاتا۔

قرآن کریم پر یہ اعتراض محض نا سمجھی اور نادانی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ میں اسے واضح کرنے کے لئے ایک آیت لے کر اس کا مطلب بیان کر دیتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ سورۃ الرحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ[۹] کا بار بار تکرار ہے اور ایسے موقع پر بھی اسے لایا گیا ہے جہاں اس کا کوئی جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اُلٹ پڑتا ہے جیسے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ[۱۰] کے ساتھ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ آتا ہے۔ پادری اکبر مسیح نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کا ہر آدمی فنا ہونے والا ہے اور یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ

کے یہ معنی ہیں کہ صرف خدا ہی باقی رہنے والا ہے جو جلال اور اکرام والا ہے۔ مگر آگے آتا ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ تم خدا کی کون کونسی نعمت کا انکار کرو گے۔ اب اس موقع پر کس نعمت کا ذکر تھا؟ کہ یہ کہا گیا۔ کیا مرنا اور فنا ہونا بھی ایک نعمت ہے؟

موت کا فلسفہ

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ فنا بھی انسان کے لئے ایک انعام ہے۔ جہاں دیگر مذاہب نے فنا کو سزا قرار دیا ہے وہاں قرآن نے اسے انعام ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ آتا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۔ نِ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۔ لے یعنی سب برکتوں والا خدا ہی ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور یہ ہر بات پر قادر ہے۔ وہ برکتوں والا خدا ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ یہ اس لئے کہ انسانوں کے اعمال کا امتحان لے اور ان کے نیک نتائج پیدا کرے وہ غالب ہے اور غفور ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ پس موت ضروری تھی کیونکہ موت کے بغیر انسانی اعمال کے نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ زندگی میں ایک انسان جو اچھے عمل کرتا ہے اگر اسے ان کا بدلہ اسی دنیا میں مل جائے اور جو بدیاں کرتا ہے ان کی اسے یہاں ہی سزا دے دی جائے تو پھر کوئی نبیوں کا انکار کیوں کرے۔ بلکہ فوری جزا سزا کو دیکھ کر سب مان لیں۔ لیکن انعام مشقت اومحنت کے بعد ملا کرتا ہے۔ اگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اسی دنیا میں موجود ہوں اور خدا تعالیٰ نے مرنے کے بعد جو درجات انہیں دیئے ہیں وہ اسی دنیا میں مل گئے ہوں تو پھر ان کا کون منکر رہ سکتا ہے۔ یا فرعون اور ابو جہل اگر کفر کی وجہ سے اسی دنیا میں آگ میں جل رہے ہوتے تو کون انکار کرتا۔ اس طرح تو ایمان لانے والوں کو کوئی محنت اور کوشش ہی نہ کرنی پڑتی۔ لیکن انعام محنت اور کوشش کے بعد ہی ملا کرتا ہے۔ پس ضروری تھا کہ انعام دینے کے لئے ایک اور دنیا ہو اور وہ ان آنکھوں کے سامنے نہ ہو جس کی وجہ سے لوگ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔ پس فرمایا خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ

اَحۡسَنُ عَمَلًا ۔ حیات کی غرض یہ ہے کہ انسان اس زندگی میں کام کرے اور موت کی غرض یہ ہے کہ اس زندگی میں جو کام کرے موت کے بعد ان کے انعام پائے ۔ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ اور خدا غالب اور بخشنے والا ہے وہ انعام بھی دے سکتا ہے اور کمزوریوں کو معاف بھی کر سکتا ہے ۔

اس آیت میں چونکہ پہلے موت کو رکھا ہے ۔ اس لحاظ سے عَزِیۡز کو پہلے رکھا ۔ اور حیات میں چونکہ کمزوریاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں اس کے لئے غَفُوۡر کی صفت کو رکھا کہ انسان سے غلطیاں ہونگی جنہیں خدا معاف کر دے گا ۔

پس یہ تکرار نہیں بلکہ بہت بڑی حکمت کے ماتحت اسے رکھا گیا ہے ۔

افضلیّت کی تیسری وجہ

(۳) افضلیّت کی تیسری وجہ ایک الہامی کتاب کے لئے یہ ہے کہ وہ ان ضرورتوں کو پورا کرے جن کے لئے اسے اختیار کیا جاتا ہے ۔ مثلاً اگر ایک چیز پیاس بجھانے کے لئے پی جاتی ہے تو اس کا کام ہے کہ پیاس بجھائے ۔ لیکن چونکہ کتاب مذہب کے متعلق ایک معلّم کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ان ضرورتوں کے دو حصّے ہو جائیں گے ۔

اوّل ۔ ان ضرورتوں کی تشریح کرے جن کو پورا کرنے کا وہ مدعی ہے کیونکہ ضرورت کا احساس بھی وہی کرتا ہے ۔

دوم ۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان کرے ۔

مذہب کی پانچ ضرورتیں

سو یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کی قرآن کریم سے پانچ ضرورتیں ثابت ہوتی ہیں ۔

اوّل :۔ وجودِ باری تعالیٰ کا ثبوت اور اس کی صفات کا علم ۔

دوم :۔ انسان کی روحانی طاقتوں کا بیان اور ان کا ثبوت ۔

سوم :۔ ان امور کا بیان جو روحانی طاقتوں کی تکمیل اور امداد کے لئے ضروری ہیں ۔

چہارم :۔ انسانی زندگی کے مآل کا بیان اور اس کا ثبوت ۔

پنجم:۔ مذکورہ بالا امور میں نہ صرف علمی طور پر روشنی بخشنا بلکہ عملاً بھی خدا تعالیٰ سے وصال کرانا اور روحانی طاقتوں کو مکمل کرانا اور حیاتِ اُخروی کے فوائد سے بہرہ ور کرانا۔

یہ ضرورتیں جو اسلام نے بیان کی ہیں باقی مذاہب بھی اس امر میں اس سے متفق ہیں گو اس مقصد کے پورا کرنے میں قرآن کریم منفرد ہے۔ کوئی مذہبی کتاب اس بارہ میں اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی۔ تورات کو شروع سے آخر تک پڑھ جاؤ، انجیل کو پڑھ جاؤ، وید کو پڑھ جاؤ بس یہ معلوم ہوگا کہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب دنیا مانتی ہے اور اس کی ذات میں کسی شک کی گنجائش نہیں مگر اس کا ثبوت وہ کوئی نہیں دیتیں۔ اسی طرح اس کی صفات کے متعلق اس قدر قلیل روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسانی نفس اس سے قطعاً تسلی نہیں پا سکتا۔ پس ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا علم دیا جائے اور پھر اس کے دلائل دیئے جائیں۔ زیادہ سے زیادہ دوسری کتب نے کوئی ثبوت دیا ہے تو معجزات سے دیا ہے۔ بیشک اس سے اللہ تعالیٰ کا وجود تو ثابت ہو جاتا ہے مگر اس کی ہر صفت ثابت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی کتاب خدا تعالیٰ کو غَفُوْر کہتی ہے تو ضروری ہے کہ وہ خدا کے غَفُوْر ہونے کا ثبوت بھی پیش کرے۔ اگر رَحِیْم قرار دیتی ہے تو اس بات کا ثبوت دے کہ وہ رَحِیْم ہے۔ غرض باقی مذاہب نے اس اصل الاصول کو جس پر مذہب کی بنیاد ہے بالکل مہمل چھوڑ دیا ہے اس کے مقابل پر قرآن کریم کو دیکھو۔ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کو پیش کرتا ہے بلکہ اس کے ثبوت بھی دیتا ہے۔ اور نہ صرف اس کا ثبوت دیتا ہے بلکہ اس کی سب صفات کا ثبوت دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک نیا اصل پیش کرتا ہے۔ جو یہ ہے کہ جس قدر صفاتِ الٰہیہ بندہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہیں ان کا الگ ثبوت ضروری ہے ورنہ خدا تعالیٰ کا وجود تو ثابت ہوگا مگر اس کی صفات کا ثبوت نہ ہوگا۔

بندوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی صفاتِ الٰہیہ کا ثبوت

میں اس وقت اس کی ایک مثال دے دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ [۴۲] یعنی یہ ہے تمہارا اللہ جو تمہارا رب بھی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہر ایک چیز کا خالق ہے اسی کی تم عبادت کرو۔ وہ ہر چیز

پر نگران ہے۔ اور یہ یاد رکھو کہ تمہاری یہ مادی آنکھیں اس تک نہیں پہنچ سکتیں نہ تمہاری عقلیں پہنچ سکتی ہیں۔ یعنی تمہاری آنکھیں اور عقلیں اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ خود ایسے سامان بہم پہنچا دیتا ہے کہ جن کے نتیجہ میں وہ بندہ کے پاس آجاتا ہے یعنی اپنی صفات کے ظہور کے ذریعہ۔ کیونکہ وہ نہایت لطیف اور خبیر ہے۔ غرض ان صفات کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے ثبوت میں بتایا ہے کہ وہ لطیف اور خبیر ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو ان آنکھوں سے دکھا دو، وہ غلط کہتے ہیں۔ اس لئے کہ جو لطیف چیز ہوتی ہے وہ نظر نہیں آیا کرتی۔ لطیف کی تو تعریف ہی یہی ہے کہ نظر نہ آئے۔ ورنہ جو چیز نظر آجائے وہ لطیف نہیں کہلا سکتی۔ پھر خدا تعالیٰ ان آنکھوں سے کس طرح نظر آسکتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ خدا ہے یا نہیں۔ سو اس کا ثبوت اس کی صفت خبیر سے مل جاتا ہے۔ وہ بندہ کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس کی رُوحانی اور جسمانی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کسی کے خبردار ہونے کا آخر کیا ثبوت ہوا کرتا ہے۔ یہی کہ جس قسم کی ضروریات اسے پیش آئیں ان کا انتظام کرے۔ مثلاً ایک شخص کسی کے ہاں مہمان جاتا ہے۔ اس کے لئے اگر مکان اور مکان میں بستر وغیرہ موجود ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بستر خود بخود آ گیا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ میزبان بہت خبردار ہے جس نے پہلے سے ہی بستر کا انتظام کر دیا۔ اسی طرح مہمان کے آگے کھانا چنا جائے لیکن میزبان خود اس وقت نظر نہ آئے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ کھانا خود بخود آ گیا ہے۔ اگر مہمان کی ضروریات پوری ہوتی جاتی ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے والا ایک وجود موجود ہے خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ پس جسمانی اور روحانی ضرورتیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے پوری ہوتی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا تعالیٰ ہے۔ اور جب وہ ان ضروریات کے پورے ہوتے ہوئے نظر نہیں آتا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ لطیف ہے۔

خدا تعالیٰ کی بعض صفات جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں

یہاں یہ نہایت عجیب نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بعض صفات جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح مرد و عورت کے ملنے سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح ان دو صفات کے ملنے سے نتیجہ

پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً خبردار رہنا اور ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر کو بھی غائب نہ ہونے دینا یہ لطیف ہستی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یعنی ایسی ہستی جو موجودات کے ہر ذرّہ سے ایک کامل اتصال رکھتی ہو۔ اور ایسے اتصال کے لئے لطیف ہونا شرط ہے۔ پس خَبِیْر کی صفت لَطِیْف کے لئے بمنزلہ جوڑے کے ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اس کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ یا ان دونوں کا آپس میں روح اور جسم کا تعلق ہے کہ ایک نہ ہوتو دوسری صفت بھی ثابت نہیں ہوتی اور دوسری نہ ہوتو پہلی ثابت نہیں ہوتی۔ اگر خَبِیْر کی صفت وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے ثابت نہ ہوتی تو لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ بھی ثابت نہ ہوتا بلکہ عدم ثابت ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں اگر لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ثابت نہ ہوتا یعنی اس کا لَطِیْف ہونا تو خَبِیْر کی صفت بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ جو وجود کامل اتصال نہیں رکھتا وہ خَبِیْر بھی نہیں ہوسکتا۔ غرض لَطِیْف ہستی وہ ہوتی ہے جو باریک در باریک اور ہر ذرّہ میں موجود ہو۔ اور جو ایسی لَطِیْف ہو وہ نظر کبھی نہیں آسکتی، ضرور ہے کہ وہ مخفی ہو۔

پھر لَطِیْف ہونا خَبِیْر ہونے کا بھی ثبوت ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک ہستی ہے جو لَطِیْف ہونے کی وجہ سے ہر ذرّہ سے تعلق رکھتی ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ خَبِیْر ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی صفت لَطِیْف اس کے خَبِیْر ہونے پر شاہد ہے۔ اور خَبِیْر ہونے کی صفت اس کے لَطِیْف ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔

خدا تعالیٰ کی صفت رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کا مادی ثبوت

ایک اور صفت خدا تعالیٰ کا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہونا ہے اس کے روحانی اور جسمانی دو ثبوت پیش کئے گئے ہیں۔ جسمانی ثبوت تو یہ دیا کہ فرمایا۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ [۳۱] یعنی زمین اور آسمان اور انسان اور اس کی طاقتیں (یعنی ترقی کی قابلیتیں جن سے وہ زمین و آسمان پر حکومت کرتا ہے اور جو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ پر جو ترقیات کا سرچشمہ ہے شاہد ہیں) اور اَغْذِیَه وغیرہ جو ان طاقتوں کو قائم رکھتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اس سال جب میں کشمیر گیا تو وہاں ایک ایم۔اے مجھے ملنے کے لئے آئے۔اور کہنے لگے میں خدا کو تو نہیں مانتا لیکن اگر کوئی خدا ہے تو اس نے ہمیں دنیا میں پیدا کر کے خواہ مخواہ مصیبت میں ڈال دیا۔ہم نے کب اس سے کہا تھا کہ ہمیں پیدا کر کے دنیا میں بھیج دو؟ میں نے کہا۔اگر دنیا کی زندگی مصیبت ہے اور آپ اس مصیبت سے نکلنا چاہتے ہیں تو یہ کونسی مشکل بات ہے۔زہر کھالو اور مر جاؤ۔کہنے لگے یہ بھی تو نہیں ہو سکتا مرنے کو دل نہیں چاہتا۔میں نے کہا۔اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ دنیا کی زندگی کو اچھا سمجھتے ہیں اور صرف منہ سے اس کی برائی بیان کرتے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے زمین کو انسانوں کے لئے قرار کی جگہ بنایا ہے۔ہندو کہتے ہیں۔دنیا مصیبت کی جگہ ہے مگر جب بیمار ہوں تو ڈاکٹروں کو سب سے زیادہ فیس وہی دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے منہ سے جتنا چاہو کہو کہ دنیا مصیبت کی جگہ ہے لیکن یہاں سے تم ہلنا نہیں چاہتے کیونکہ خدا نے تمہارے لئے اس زمین کو قرار گاہ قرار دیا ہے۔

پھر وَالسَّمَآءَ بِنَآءً آسمان بھی تمہاری حفاظت کا موجب ہے۔جو چیزیں زمین کے ذریعہ پوری نہ ہو سکتی تھیں ان کو ہم تمہارے لئے آسمان سے نازل کرتے ہیں کیونکہ آسمان بناء کا موجب ہے۔وَصَوَّرَكُمْ پھر اس خدا نے تمہیں شکل دی۔فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔اور بڑی اعلیٰ درجہ کی اور مکمل قابلیتوں والی شکل بنائی۔وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور تمہارے لئے نہایت اعلیٰ درجہ کی چیزیں پیدا کی ہیں۔اگر چیزیں خراب ہوتیں تو تمہاری قابلیتیں بھی اعلیٰ درجہ کی نہ ہوتیں۔مگر ان قابلیتوں کو خرابی سے بچانے کے لئے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے رزقِ طیب پیدا کیا۔فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔پس اے لوگو! یہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔اگر وہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ نہ ہوتا اور سورج کوئی اور پیدا کرتا اور زمین کوئی اور پیدا کرتا تو سورج اور زمین کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہوتا۔مگر اب دیکھو سورج زمین کی حفاظت کر رہا ہے اور زمین سورج کی۔یہ سب باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ ایک ہی خدا ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا اور وہی رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔

صَوَّرَكُمْ میں یہ بھی بتایا ہے کہ بندہ ایسا بنایا گیا ہے کہ باقی سب مخلوق پر حکومت کرتا ہے۔یہ جسمانی ثبوت ہے خدا تعالیٰ کے رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہونے کا۔

خدا تعالیٰ کے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہونے کا روحانی ثبوت

روحانی ثبوت سورۃ شعراء میں اس طرح دیا کہ بہت سے نبیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو مختلف اقوام کی طرف آئے تھے فرمایا وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ۔ [۴۴] یعنی یہ قرآن رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ خدا کی طرف سے اُتارا گیا ہے اور اس کا روحانی ثبوت یہ ہے کہ یہ کلام سب دُنیا کو مخاطب کر کے نازل ہوا ہے۔ جب کہ پہلے کلام صرف مختص القوم اور مختص الزّمان تھے اور جب کہ وہ کلام صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ثبوت تھے۔ یہ کلام ربوبیت عالمین کا ثبوت ہے۔

غرض یہ قرآن کسی ایک قوم کی طرف نہیں آیا کیونکہ اسے خدا تعالیٰ کی رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کے ماتحت نازل کیا گیا ہے اور تمام دنیا اس کی مخاطب ہے۔ پھر اس کلام کو روح الامین لے کر نازل ہوا ہے۔ یعنی پہلے نبیوں کے کلام میں خرابیاں آ گئی تھیں کیونکہ بندوں نے ان کی حفاظت نہ کی۔ پس خدا تعالیٰ نے اس روح کے ذریعہ سے جو امین ہے محفوظ طور پر وہ پہلے کلام آپ پر نازل کئے ہیں اور چونکہ کلام کے پہنچانے کے لئے اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے تا کہ پہنچانے میں کوئی نقص نہ رہ جائے اس لئے یہ کلام تیرے دل پر نازل کیا گیا ہے۔

غرض بائبل اور وید وغیرہ کتابیں سب خراب ہو چکی تھیں مگر خدا تعالیٰ کے پاس اصلی تعلیم محفوظ تھی۔ چنانچہ اس نے روح الامین کے ذریعہ اس کلام کو تیرے دل پر نازل کیا تا کہ لوگوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ یہ کلام عربی زبان میں ہے جو تمام مضامین کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔ اور اس کے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی طرف سے ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ یہ کلام پہلی کتب میں بھی موجود ہے۔ اس رنگ میں بھی کہ ان کے اصول اس میں پائے جاتے ہیں اور اس رنگ میں بھی کہ ان سب کو اکٹھا کر کے اس میں بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا اس میں تمام غیر مسلم اقوام کی ذہنیت کا خیال رکھا گیا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی طرف سے ہے۔ اگر یہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کی طرف سے نہ ہوتا تو یہ ساری دنیا کی فکر کیوں کرتا۔

پہلی کتب میں قرآن کریم کی موجودگی کے معنی

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کی ساری تعلیم وہی ہے جو پہلی کتابوں میں تھی بلکہ یہ ہیں کہ پہلی کتابوں کی صحیح تعلیم قرآن کریم میں موجود ہے اور اس سے زائد بھی ہے۔ پھر پہلی کتب میں اس کلام کی موجودگی سے یہ بھی مراد ہے کہ ان میں ایک کتاب کی پیشگوئی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح تمام صفاتِ الٰہیہ کا قرآن کریم میں مبسوط بیان ہے مگر اور کتابوں میں اس طرح ذکر نہیں ہے۔ انجیل میں صرف پانچ سات صفات کا ذکر آتا ہے۔ تورات میں نسبتاً زیادہ صفات کا ذکر ہے مگر قرآن نے جتنی صفات پیش کی ہیں اتنی تورات نے بھی پیش نہیں کیں۔ پھر پہلی کتابیں ان صفات کو بطور دلیل پیش نہیں کرتیں بلکہ صرف دُعاؤں میں ان کا ذکر آجاتا ہے۔ حالانکہ ضروری ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کا نہ صرف بالاستیعاب ذکر ہو بلکہ ان کے الگ الگ کام اور ان کے ثبوت بھی دیئے جائیں مگر یہ کام صرف قرآن کریم نے کیا ہے۔

صفاتِ الٰہیہ کی تشریح بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونی چاہئے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صرف صفات کے نام بھی کافی نہیں جب تک ان کے صحیح معنی بھی بیان نہ کئے جائیں کیونکہ خالی نام صرف شدتِ محبت کے اظہار کے لئے بھی جمع کئے جاسکتے ہیں جب کہ ان ناموں کے لینے والا ان کی حقیقت سے کچھ بھی واقف نہ ہو۔ جیسے پیار کے وقت انسان بہت سے نام لے لیتا ہے لیکن ان کی حقیقت کا اسے علم نہیں ہوتا۔ پس صرف کسی صفت کا ذکر کردینا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک صفت کا ذکر ہو اور پھر اس کی تشریح اور توضیح بھی خدا تعالیٰ ہی کے الفاظ میں ہو۔ جیسے گورنمنٹ ایک قانون بناتی ہے تو ساتھ ہی بعض الفاظ کی تشریح بھی کردیتی ہے کہ فلاں لفظ کے یہ معنی ہیں تاکہ اس میں اختلاف نہ شروع ہوجائے۔ اسی طرح خدائی کلام کا یہ بھی کام ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات بیان کرے اور خود ہی ان کی تشریح کرے۔ چنانچہ دیکھ لو رَحْمٰن کا لفظ عربوں میں موجود تھا۔ اور وہ اسے استعمال کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے وَقَالُوْا لَوْشَآءَ الرَّحْمٰنُ مَاعَبَدْنٰهُمْ [۴۵] یعنی وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر رَحْمٰن خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا

دوسرے معبودوں کی پرستش نہ کرتے۔ خود مسیلمہ کذاب بھی رحمٰن یمامہ کہلاتا تھا۔ لیکن جب رَحْمٰن کے معنوں کو قرآن کریم نے بیان کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اور چونکہ ان معنوں کے رو سے ان کے مذہب پر زد پڑتی تھی صاف کہہ اُٹھے کہ ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَھُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۱﴾ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رَحْمٰن کی عبادت کرو۔ تو وہ کہتے ہیں رَحْمٰن کون ہے۔ کیا ہم اس کے آگے سجدہ کریں جس کے آگے سجدہ کرنے کا تُو حکم دیتا ہے۔ اور یہ بات ان کو نفرت میں اور بڑھا دیتی ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہی کہ وہ رَحْمٰن کے اور معنی کرتے تھے۔ چنانچہ آگے اللہ تعالیٰ نے اس کے معنی بھی کر دیئے اور بتا دیا کہ ان معنوں میں ہم رَحْمٰن کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور ان معنوں سے رد کرتے ہیں۔ فرماتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْھَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا۔ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ ﴿۶۲﴾

یعنی رَحْمٰن تو وہ ہے جس نے آسمانوں میں بروج بنائے اور ان میں چمکتا ہوا سورج اور نور دینے والا چاند بنایا۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا۔ مگر ان کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہیں یا شکر گذار بندے بننا چاہیں۔ یہاں رَحْمٰن کی تشریح کر دی۔ اور مطلب بیان کر دیا کہ رَحْمٰن سے مراد خدا تعالیٰ کی وہ صفت ہے جو انسان کے عمل سے بھی پہلے اس کے لئے کام شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ بتایا۔ دیکھو ہم نے چاند اور سورج کو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے بنایا۔ اور پھر اس کی ضرورت بھی بیان کر دی۔ اور وہ یہ کہ انسان کو عمل کرنے کے لئے اسباب کی ضرورت ہے۔ اگر اسباب نہ ہوں تو وہ عمل کس طرح کر سکے۔ مثلاً بڑھئی ہو لیکن لکڑی نہ ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ پس ضروری تھا کہ انسان پر اس کے اعمال شروع کرنے سے قبل انعام ہوتا۔ اور انعام کے طور پر اس کے لئے اسباب مہیا کئے جاتے تاکہ وہ عمل کر سکتا۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے کیونکہ عمل ہو ہی نہیں سکتا جب تک پہلے کچھ انعام نہ ہو۔ پھر یہ وجہ بتائی کہ رحمانیت کی ضرورت انسان کے شُکُوْر بننے کے لئے ہے۔ شُکُوْر کے لئے عمل کی شرط ہے۔ اور عمل بغیر رحمانیت کے نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی یہ صفت نہ ہوتی

اور وہ بلا مزد انعام نہ کرتا تو انسان اپنے پیدا کرنے والے کا شکر بھی ادا نہ کر سکتا اور ایک بِلا عمل ہستی رہ جاتا۔

شُکُوْر کے لفظ میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلانے کے لئے قلب میں شکریہ کے احساسات کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ احساسات بغیر رحمانیت کی صفت کے پیدا نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ رحمانیت کے بغیر وہ اعلیٰ مُحرّکِ عمل جو بے نفسی کا موجب ہوتا ہے پیدا نہ ہو سکتا کیونکہ سب کچھ نتیجہ عمل میں ملتا تو ہر عمل لالچ کی وجہ سے ہوتا۔ مگر چونکہ احسان موجود ہے اور خدا تعالیٰ نے ہر انسان پر اس کے عمل کرنے کے قابل بننے سے پہلے نعمتیں نازل کی ہیں۔ اس لئے اعلیٰ انسان اپنے اعمال کو طلبِ صلہ کی بجائے شکرِ ماضی کے ماتحت لے آتا ہے۔ اور وہ خدا تعالیٰ کی شکر گذاری کرتا اور اس کے احکام بجالاتا ہے۔ نہ اس لئے کہ اب اسے کچھ ملے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کے پہلے احسانات کا شکر ادا کرے۔ اس طرح مومن کے دل میں لالچ اور طمع کو نکال دیا اور محض خدا تعالیٰ کی شکر گذاری کا جذبہ اس میں پیدا کیا۔

غرض تکمیل صفات اور دلائل صرف قرآن کریم نے دیئے ہیں۔ باقی کتب صرف دُعا میں بطور ایک ٹونے کے خدا تعالیٰ کے اسماء کو استعمال کرتی ہیں اور وہ ذرّہ بھر بھی متشابہ صفات کے فرق اور ان کے دلائل پر روشنی نہیں ڈالتیں۔

انسان کی روحانی طاقتوں کا بیان

دوسرا امر جس کا بیان ایک الہامی کتاب کے لئے ضروری ہے انسان کی روحانی طاقتوں کا بیان ہے۔ اس مضمون پر بھی قرآن کریم نے بلکہ صرف قرآن کریم نے ہی روشنی ڈالی ہے دوسری کتابوں میں یہ بات نہیں ملتی۔ یا تو اس لئے کہ جس وقت وہ نازل ہوئیں اس وقت اس قدر روحانی ارتقاء نہ تھا۔ یا پھر ان کے بگاڑ کے زمانہ میں جو بھی تعلیم ان میں تھی وہ ضائع ہو گئی۔ مگر قرآن کریم کو دیکھو اس میں ایک اعلیٰ طریق سے ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ کی لطیف تفسیر

خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا - وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا - اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا - قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا - وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا - [۴۸]

ان آیات سے پہلے قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے۔ وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ کچھ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کیوں نہ یہ تسلیم کیا جائے کہ روح اپنے اندر یہ ذاتی قابلیت رکھتی ہے کہ اس سے اعلیٰ درجہ کا کلام نکلنے لگ جاتا ہے۔ یہاں سوال نقل نہیں کیا گیا۔ اس لئے اس موقع کے لحاظ سے جتنے سوال کے پہلو نکل سکتے ہوں وہ سب جائز ہونگے۔ ایک سوال یہ ہوسکتا ہے کہ روح کو کس طرح پیدا کیا گیا ہے دوسرا سوال یہ ہوسکتا ہے کہ روح میں کیا کیا طاقتیں رکھی گئی ہیں۔ تیسرا سوال یہ ہوسکتا ہے کہ روح کا انجام کیا ہوگا؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا۔ روح مادیات سے بالا ہے اس لئے یہ تمہارے تصرف میں نہیں آسکتی۔ اس کی پیدائش اس کا قیام اور اس کا انجام سب اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے کیونکہ وہ خود روح کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا رد کیا گیا ہے جو کہتے ہیں کہ روح آپ ہی کمال حاصل کرسکتی ہے۔ فرمایا جب تک خدا کا کلام روح کو حاصل نہ ہو وہ کوئی کمال ظاہر نہیں کرسکتی۔ پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ روح فنا کیوں نہیں ہوتی؟ ان کے متعلق فرمایا کہ زندہ رکھنے والا جو موجود ہے تو فنا کیوں ہو۔ جیسے آگ جلانے والا جب تک آگ میں لکڑیاں ڈالتا جائے گا وہ نہیں بجھے گی۔ غرض نہ یہ سوال درست ہے کہ روح ہمیشہ کس طرح رہے گی اور نہ یہ کہ اگر زندہ رہے گی تو حادث نہیں ہے کیونکہ اس کی زندگی خدائی اذن سے ہے نہ کہ اپنی ذاتی

قابلیت کی وجہ سے۔ بہرحال روح کی پیدائش بھی امر یعنی کُن کہنے سے ہے اور اس کی ترقی بھی امر یعنی کلامِ الٰہی سے ہے اور اس کا ابدی قیام بھی امر یعنی قضائے الٰہی سے وابستہ ہے۔

پھر فرمایا کہ انسانی روح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آپ ہی کمال حاصل کر سکتی ہے اور آپ ہی تعلیم بیان کر سکتی ہے مگر یہ غلط ہے وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا روح کے متعلق جو انسانی معلومات ہیں وہ نہایت ناقص اور ناتمام ہیں جس طرح اور غیر مادی اشیاء مثلاً ذات باری یا ملائکہ کے متعلق اس کے معلومات ناقص ہیں۔ اس کے لئے خدا تعالیٰ کا الہام ضروری ہے جس کے امر سے یہ سب کچھ ہے۔ اسی طرح اس کی مخفی طاقتوں کا ابھارنا بھی امر پر ہی منحصر ہے۔ تم خود اپنے طور پر اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

یہ سوال اس زمانہ میں بڑے زور سے پیدا ہو رہا ہے کہ انسان یا تو خود روحانیت میں کمال پیدا کر کے روحانی تعلیم بنا سکتا ہے یا پھر دوسری روحوں سے تعلق پیدا کر کے ان کی امداد سے ایسی تعلیم ایجاد کر سکتا ہے۔ اس وہم میں اس زمانہ کے بڑے بڑے لوگ مبتلا نظر آتے ہیں کہ روحیں انسان کو روحانیت کا اعلیٰ رستہ بتا دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی روح میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ مُردوں کی روحیں پوری کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارا خیال ہے کہ تم خود روحانی طاقتوں کو ترقی دیکر اعلیٰ درجہ کی روحانی تعلیم بنا سکتے ہو۔ اسی طرح تمہارا خیال ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ ہی آپ یہ کتاب بنالی ہے اس پر خدا کی طرف سے الہام نازل نہیں ہوا۔ اس کی اپنی روحانی طاقت اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ اس سے خود بخود ایسی باتیں صادر ہونے لگ گئیں۔ مگر یہ درست نہیں کیونکہ انسانی طاقتیں اتنی نہیں ہیں کہ ایسا کلام بنا سکیں۔ انسانی عقل کا اپنے آپ روحانی رستہ تجویز کرنا تو الگ رہا وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا۔ اگر یہ قرآن جو نازل شدہ ہے اسی کو ہم تمہاری نظر سے اوجھل کر دیں تب بھی تم اپنی روحانی قوتوں کو نشوونما دے کر ایسی کتاب نہیں بنا سکتے۔ یعنی اگر ہم یہ بنی بنائی تعلیم ہی دنیا سے غائب کر دیں تو پھر بھی انسان اس جیسی تعلیم نہیں بنا سکتے۔

کہا جا سکتا تھا کہ یہ قرآن کا محض ایک دعویٰ ہے کہ اگر قرآن کریم کی تعلیم غائب ہو جائے تو انسان اس جیسی تعلیم نہیں لا سکتے، اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ ثبوت بھی اللہ تعالیٰ نے پیش کر دیا ہے۔

m17

چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ قرآن دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ اس کی تحریر تو رہ جائے گی مگر تعلیم پر عمل کرنے والے نہ ہوں گے۔ چنانچہ جب ایسا زمانہ آیا تو نہایت ہی لغو باتیں اسلام اور قرآن کی طرف منسوب ہونے لگ گئیں۔ اور اس کی بے نظیر اخلاقی اور روحانی تعلیم پر پردہ پڑ گیا۔

اس کے بعد فرماتا ہے اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ سوائے اس کے کہ تیرے رب کی خاص رحمت اسے دنیا میں پھر واپس لے آئے اور کوئی صورت اس کی واپسی کی نہیں ہوگی۔ چنانچہ آخری زمانہ میں رسول کریم ﷺ کی پیشگوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی رحمت کا ہاتھ لوگوں کی طرف لمبا کیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ دوبارہ قرآن کریم کا دنیا میں نزول ہوا۔ اب دیکھ لو۔ وہی قرآن ہے جو پہلے تھا مگر اس سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ کیسے کیسے معارف اور حقائق نکل رہے ہیں اور کس طرح قرآن ساری دنیا پر غالب آرہا ہے۔ درحقیقت اس آیت میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کی خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ قرآن اس وقت دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ مگر پھر خدا تعالیٰ کے ایک فرستادہ کے ذریعہ اسے زمین پر قائم کر دیا جائے گا۔

سپر چولزم اور ہپناٹزم والوں کو چیلنج

پھر فرماتا ہے قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا۔ تُو ان لوگوں سے کہہ دے کہ اگر جنّ وانس بھی مل جائیں تب بھی وہ اس قرآن کی مثل یعنی روحانی ترقیات کا راستہ بتانے والی تعلیم لانے سے قاصر رہیں گے۔ یہاں جنّ سے مراد وہ جنّ نہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے سروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ ایسے جنّوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کو بھی اپنے ساتھ ملا لو بیہودہ بات ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے کہا جائے کہ تم خواہ فلاں درخت سے مدد لے لو یا فلاں بھیڑ سے امداد حاصل کر لو تو بھی فلاں شاعر جیسے شعر نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح یہ بات لغو ہے اسی طرح ایسے جنّوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان سے مدد لے لو لغو بات ہے پس یہاں جنّ سے مراد کوئی اور وجود نہیں ہیں۔

بلکہ وہ وجودِ مخفیہ ہیں جن کا نام سپر چولزم والے ارواح اور ہپناٹزم والے قوائے روحانیہ رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس لئے ان کو جنّ کہا گیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی عقلمند کا دعویٰ نہیں تھا کہ جنّات سے مل کر وہ اعلیٰ روحانی تعلیم بنا سکتا ہے۔ پس جس چیز کا دعویٰ ہی نہیں تھا اور جس اجتماع کا امکان ہی نہیں تھا اس کا چیلنج عقل کے خلاف ہے۔ پس اس جگہ جنّ سے مراد وہ روحانی افعال ہیں جو سبجیکٹو مائنڈ (Subjective Mind) سے ظاہر ہوتے ہیں یا وہ اتحاد ہے جو بقول بعض ارواح غیر مرئی سے انسانوں کا ہو جاتا ہے اور ان سے وہ بعض روحانی علوم دریافت کر لیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے تم ان سے بھی مدد لے لو وہ بھی تمہاری مدد کریں تب بھی تم اس قرآن کی مثل نہیں لا سکتے۔ پس یہاں جنّ سے مراد وہ ارواح ہیں جن کی مدد سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نئے روحانی علوم معلوم کر سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم ان سے بھی مدد لے لو اور قرآن کی مثل بنا دو۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ بغیر کلام الٰہی کے کام چل سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو یہ کس قدر زبردست معجزہ قرآن کریم کا ہے کہ وہی زمانہ جس کے متعلق احادیث نبویہؐ سے ثابت ہے کہ قرآن کریم کے اُٹھنے کا ہے۔ اور جس زمانہ میں رَحْمَةٍ رَبِّيْ سے دوبارہ قرآن آنے کا ذکر ہے۔ اس زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہیں جو ارواح سے مل کر حقائق روحانیہ کے دریافت کرنے کے مدعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں اگر ارواح کے اندر یہ قابلیت ہے کہ وہ آپ ہی آپ اپنی ترقی کے ذریعہ علوم کو معلوم کر لیں تو وہ قرآن کی مانند کوئی تعلیم پیش کر کے دکھائیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مثل میں کن کن امور کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ سو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ ہم نے قرآن میں دو خوبیاں رکھی ہیں۔ ان کی مثال روحوں سے تعلق رکھنے والے اور خود روحانیات میں ترقی کرنے کا دعویٰ کرنے والے پیش کریں۔ ایک تو یہ کہ ہر ضروری امر جس کی روح کو ضرورت ہے قرآن کے اندر بیان کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ہر ضروری امر کی ہر ضروری شق بیان کر دی گئی ہے۔ یعنی مختلف متفاوت فطرتوں کا اس میں پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور

ہر حکم ایسے رنگ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ سب کے لئے کار آمد ہو۔ یہاں فلسفیوں اور سپر چولزم والوں کو چیلنج دیا گیا ہے کہ تم ایسی کتاب بنا کر دکھاؤ جس میں وہ ساری باتیں آجائیں جن کی تکمیلِ روحانیت کے لئے ضرورت ہے اور پھر اُس کتاب میں ایسی تعلیم ہو جس میں ساری فطرتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ ایسی باتوں کی وہ کوئی مثال نہیں لا سکتے۔ یہ لوگ بہت مدت سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں مگر ابھی تک تو کچھ نہیں کر سکے اور نہ آئندہ کر سکیں گے۔ اوّل تو وہ قرآن جیسی جامع تعلیم ہی نہیں پیش کر سکتے اور اگر فرض کر لیا جائے کہ پیش کریں گے تو یا تو وہ قرآن کے مطابق ہو گی اور یا پھر قرآن کے خلاف۔ اگر قرآن کے مطابق ہو گی تو اس کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن موجود ہے۔ اور اگر قرآن کے خلاف ہو گی تو اس کا رَدّ قرآن میں موجود ہو گا۔ گویا کوئی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی جو قرآن کا مقابلہ کر سکے۔ کیا دنیا میں کوئی کتاب ایسی ہے جو روحانی امور کے متعلق ایسا عظیم الشان دعویٰ پیش کر سکتی ہو؟

فطرت انسانی کی روحانی طاقتوں کا اظہار کلام الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتا

اب ایک اور سوال ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر روح کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے تو وہ قرآن کریم کی تعلیم کو کس طرح سمجھ سکتی ہے۔ یہ بات ایک اور آیت سے حل ہو جاتی ہے جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روحانی طاقتوں کو فطرت انسانی سے بھی وابستہ قرار دیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ روح میں بھی کلام الٰہی موجود ہوتا ہے مگر مخفی طور پر۔ اور وہ اپنے ظہور کے لئے بیرونی کلامِ الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ پس تھوڑا علم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ فطرتِ انسانی کو روحانی طاقتوں سے لگاؤ نہیں۔ لگاؤ ہے مگر ان طاقتوں کا ظہور سوائے کلامِ الٰہی کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ یعنی قرآن کریم میں جو تعلیمات ہیں وہ فطرتِ انسانی میں جو مظہرِ روح ہے موجود ہیں کیونکہ انسان اسی شئے سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اس کے اندر بھی موجود ہو۔ غیر جنس اسے نفع نہیں دے سکتی۔ جیسے اگر کان نہ ہوں تو سُننا ناممکن ہے اور آنکھیں نہ ہوں تو دیکھنا ناممکن ہے۔ یا اس کی مثال پانی کی سی ہے کہ جب اُوپر سے پانی برستا ہے تو چشمے بھی جاری ہو جاتے ہیں اور اگر آسمان سے پانی نہ برسے تو چشمے بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کی

وحی کا پانی نازل ہوتا ہے تو روح انسانی سے بھی روحانی پانی اُبلنے لگتا ہے کیونکہ الٰہی کلام اور انسانی فطرت ایک دوسرے کے لئے بطور جوڑے کے ہیں۔ ایک لفظوں میں کتاب الٰہی ہوتی ہے اور دوسری فطرت میں مرکوز ہوتی ہے۔ اور وہی کتاب الہامی ہوسکتی ہے۔ جو انسانی فطرت کے مطابق ہو پس انسانی فطرت میں بھی کلام الٰہی ہوتا ہے۔ مگر اسے اُبھارنے کے لئے الہام کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے کلام کا ایک حصہ انسان کے دماغ میں رکھ دیا اور دوسرا حصہ اس نے اپنے نبی کو دے کر بھیج دیا۔ جب یہ دونوں حصّے ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ جاتے ہیں تو اسے خدا کی طرف سے سمجھ لیا جاتا ہے۔

سفرِ ولایت کے ایام کا ایک واقعہ

اس موقع پر میں ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ جب میں ولایت سے واپس آیا تو جس جہاز پر ہم سوار ہوئے اس کا چیف انجینئر ایک دن جہاز کی مشینری دکھانے کے لئے مجھے لے گیا۔ اور دکھانے کے بعد کہنے لگا کہ آپ اپنے سیکرٹریوں کو واپس بھیج دیں۔ میں آپ کے ساتھ ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ میں نے ساتھیوں کو بھیج دیا۔ جب وہ چلے گئے تو کہنے لگا۔ آپ کے پاس مختلف ممالک کے خطوط آتے ہونگے۔ اگر آپ مجھے ان خطوط کے ٹکٹ بھجوا دیا کریں تو میں بہت ممنون ہونگا۔ میں نے کہا اچھا اگر کوئی غیر معمولی ٹکٹ ملا تو بھیج دیا کروں گا۔ کہنے لگا میں بھی آپ کی خدمت کروں گا۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں اور مجھ سے کام لیں۔ پھر کہنے لگا۔ آپ جس غرض کے لئے ولایت گئے تھے وہ مجھے معلوم ہے اور وہ یہی ہے کہ آپ نے حکومت کے خلاف وہاں مشنری رکھے ہوئے ہیں انہیں آپ مخفی ہدایات دینے گئے تھے۔ اب آپ جو مخفی تحریریں بھیجنا چاہیں وہ میں لے جایا کروں گا۔ آپ اس طرح کریں کہ کارڈ کا ایک ٹکڑا آپ اپنے مشنریوں کو دیں اور دوسرے میرے ذریعہ بھیجیں۔ جب دونوں ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ فٹ (Fit) ہو جایا کریں گے تو آپ کے مشنری سمجھ لیں گے کہ آپ نے جو ہدایات ان کو بھیجی ہیں وہ اصلی ہیں۔ اس طرح وہ آپ کی ہدایت پہچان لیا کریں گے۔ اس کا یہ قیاس تو غلط تھا اور میں نے اس کی تردید بھی کی اور کہا کہ ہم اپنی حکومت کے وفادار ہیں۔ مگر جس طرح اس نے کہا تھا کہ ایک ٹکڑا آپ اپنے مشنری کو

دے دیں اور دوسرا ٹکڑا مجھے بھجوا دیں جب وہ دونوں ٹکڑے مل جائیں گے تو مشتری سمجھ لے گا کہ آپ نے جو ہدایات بھیجی ہیں وہ اصلی ہیں۔ یہی حالت انسان کی روحانیت کے متعلق ہوتی ہے۔ ایک ٹکڑا کلام الٰہی کا انسان کے دماغ میں ہوتا ہے اور دوسرا ٹکڑا نبی کے پاس ہوتا ہے جب وہ دونوں فٹ ہو جاتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر فٹ نہ ہوں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسا کلام پیش کرنے والا دھوکا باز ہے۔

کتابِ مبین اور کتابِ مکنون کا اتحاد

غرض روحانی ترقیات کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہی تعلیم نازل ہو جو روحانی قابلیتوں کے مشابہ ہو۔ پس اس طرح ایک رنگ میں کلام الٰہی انسانی دماغ میں بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن وہ مخفی ہوتا ہے اور اس کا ابھارنا ایک کتاب واضح کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا نام اسی جہت سے کتاب مبین آیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۵۰۔ اے لوگو! تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور اور واضح کتاب آچکی ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔

پس روحانی قابلیتیں بمنزلہ زمین کے پانی کے ہیں جو آسمانی پانی کے قرب کے ساتھ اونچا ہوتا ہے۔ اور جس طرح بارش نہ ہونے پر کنوؤں کے پانی سوکھنے لگتے ہیں اسی طرح الہام کے نازل نہ ہونے پر فطرت کا سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے۔ پس باوجود اس کے کہ فطرت میں کلام مخفی طور پر موجود ہے وہ آسمانی پانی کی عدم موجودگی میں گدلا اور خراب ہو جاتا ہے اور اس پر بھروسہ کرنا کافی نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب آسمانی پانی نازل ہو تو دونوں ایک دوسرے پر گواہ ہوتے ہیں۔ آسمانی پانی فطرت کے پانی کی صفائی کی گواہی دیتا ہے اور فطرت کا پانی آسمانی پانی کی صفائی پر گواہی دیتا ہے۔ گویا وہ ایک چیز کے دو ٹکڑے ہیں کہ دونوں مل کر ایک وجود پورا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک ٹکڑا انسان کے دماغ میں اس لئے رکھا ہے کہ جب آسمانی پانی نازل ہو تو فطرتِ صحیحہ اس کے لئے بطور شاہد ہو۔ پس کتابِ مبین اور کتابِ مکنون کا اتحاد کتابِ مبین اور کتابِ مکنون دونوں کی سچائی پر شاہد ہوتا ہے۔ اور دھوکے بازوں کے دھوکا سے بچاتا ہے اور ان میں آپس میں ایسا ربط ہے کہ جب ایک

قریب ہوتو دوسری خود بخود قریب ہونے لگتی ہے۔ الہام ہوتو فطرت ابھرنے لگتی ہے جیسا کہ سورۃ انعام میں بطور کلامِ الٰہی کی تمثیل کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ[۵] یعنی الٰہی کلام کی مثال پانی کی طرح ہے۔ جس طرح پانی نازل ہونے سے سبزیاں اُگنے لگتی ہیں اسی طرح کلام الٰہی کے نازل ہونے سے ہر قسم کی قابلیتوں میں اُبھار شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے جوہر کو ظاہر کرنے لگتی ہیں۔ اسی طرح فطرت کے اُبھرنے سے بھی کلام الٰہیہ کھنچ آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّاشَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں لیمپ ہو اور لیمپ چمکدار گلوب میں ہو جو ستارہ کی طرح چمکے۔ جس کی وجہ سے اس کی روشنی کا فوکس فائدہ اُٹھانے والوں پر پڑ رہا ہو۔ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ اور اس میں اعلیٰ درجہ کا مصفّٰی تیل زیتون کے مبارک شجر کا ہو۔ لَّاشَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ اور وہ شجر ایسا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ۔ ایسا تیل اپنی اعلیٰ درجہ کی صفائی کی وجہ سے قریب ہو کہ بغیر آگ کے آپ ہی آپ روشن ہو جائے۔ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ اس لئے کہ جب اس تیل یعنی فطرتِ صحیحہ میں ایسی جلا پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا نور جو اس فطرتی نور کو روشن کر دینے کی وجہ سے نار سے مشابہ بھی ہے نازل ہو جاتا ہے اور آسمانی نور زمینی نور سے آکر مل جاتا ہے۔

اب دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح کھول کر بیان فرما دیا ہے کہ فطرت کا نور جب کامل جلا پا جائے اور ایسا مصفّٰی ہو جائے کہ گویا خود ہی جل اُٹھنے والا ہو تو اس وقت وہ آسمانی نور کو

جذب کر لیتا ہے یعنی موردالہام ہوجاتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ کامل اور مصفّٰی دماغ آپ ہی تعلیم کو معلوم کرے گا درست نہیں۔ اگر وہ کامل ہے تو الہام خود بخود اس پر نازل ہوگا۔ اور اگر وہ ناقص ہے تو پھر تعلیم بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

غرض اس آیت میں روحانی طاقتوں اور ان کے ارتقاء کے مسئلہ پر سیر کُن بحث کی گئی ہے۔ جس پر عقل اور مشاہدہ دونوں شاہد ہیں۔ اور یہ بحث دنیا کی اور کسی کتاب میں نہیں مل سکتی۔

آگے بتایا کہ یہ نور کہاں ہے؟ فرماتا ہے۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ [52] یہ نور ایسے گھروں میں ہے جن کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ انہیں اونچا کیا جائے گا اور حکومت دی جائے گی۔ گویا نور سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ انہیں دنیا کا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔

پس بے شک انسانی فطرت میں بھی نور ہے اور وہ خدا کے نور کے مشابہ ہے مگر قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک فطرت جلا پا جائے یعنی اس قدر مکمل ہو جائے کہ الہام پانے کی طاقت اس میں پیدا ہو جائے تو آسمان سے الہام اس پر نازل ہوتا ہے گویا انسانی فطرتِ صحیحہ الہام کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ جب فطرت کامل ہو جائے تو ضرور ہے کہ الہام نازل ہو۔ لیکن اگر الہام نازل نہیں ہوتا تو فطرت کامل نہیں ہوگی۔ پس بغیر الہامِ الٰہی کے کام نہیں کیا جا سکتا۔

روحانی طاقتوں کی تکمیل کے لئے کامل تعلیم

(۳) تیسری چیز جس کا بیان کرنا ایک مذہب کے لئے نہایت ضروری ہے۔ وہ ان امور کا بیان کرنا ہے جو روحانی طاقتوں کی تکمیل اور ان کی امداد کے لئے ضروری ہیں۔ یہ مضمون ایسا وسیع ہے کہ اس میں شریعت کے تمام احکام آسکتے ہیں۔ اور مذہب کے تمام اصول اور جزئیات پر بھی اس میں بحث ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی غرض یہی ہوتی ہے کہ روحانی طاقتوں کا ارتقاء ہو۔ لیکن چونکہ اس لیکچر کے یہ مناسب حال نہیں اس لئے میں اختصاراً اس کے متعلق صرف ایک ریویو کر دیتا ہوں کہ اسلام چونکہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ (۱) روح انسانی جسمانی تغیرات کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے

وہ جسمانی تغیّرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جیسے فرمایا يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا [۵۳]

اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور مناسب حال اعمال بجالاؤ۔ یعنی طیبات کے کھانے سے نیک اعمال کی توفیق عطا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ قرار دیتا ہے کہ مذہب کو ایک حد تک انسان کی غذاؤں اور اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں اور اس کی قوتِ حاسّہ پر بھی حد بندی کرنی چاہئے تا کہ معدہ اور حواس کے ذریعہ سے دماغ اور دل پر بد اثرات نہ پہنچیں اور اس کی روح مُردہ نہ ہو اور اس نے اس کے متعلق دو اصول مقرر کئے ہیں۔

اوّل ضروری اور اصولی امور اس نے خود بتا دیئے ہیں اور ہر مسئلہ کے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں مگر باوجود اس کے (۲) اس نے تسلیم کیا ہے کہ بعض امور میں انسان کی بدلنے والی ضرورتیں یا مختلف ممالک کے لوگوں کے لئے بدلتے رہنے والے قوانین کی بھی ضرورت ہوگی کیونکہ زمانہ کے تغیّرات کے لحاظ سے ایسی ضرورتیں پیش آسکتی ہیں جن کے متعلق اپنے طور پر قوانین بنانے پڑیں۔ چنانچہ اس کے لئے وہ یہ قاعدہ مقرر فرماتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ [۵۴] فرمایا۔ اے مومنو! تم آپ ہی آپ یہ سوال نہ کیا کرو کہ ہم فلاں کام کس طرح کریں اور فلاں کس طرح کیونکہ بعض باتیں اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر اس حکمت کے ماتحت چھوڑ دی ہیں کہ اگر انہیں بیان کر دیا جائے تو وہ تمہارے لئے دائمی طور پر مقرر ہو جائیں گی حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آئندہ ان میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ پس دوسرا اصل قرآن کریم نے یہ بتایا کہ کامل تعلیم کے بعد بھی بعض ہدایتوں میں وقتی طور پر تغیّر کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ ان کو قرآن نے انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے۔ اور فیصلہ کرنے کا یہ طریق بتا دیا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [۵۵] یعنی مومنوں کا یہ طریق ہے کہ وہ قومی معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کیا کرتے ہیں۔ پس اسلام میں یہ نہیں کہ ہر فرد اپنی اپنی رائے پر چلے بلکہ مشورہ کرنے کے بعد جو بات طے ہو اُس پر چلنا چاہئے۔ مگر باوجود ان باتوں کے چونکہ انسان پھر بھی غلطی کر سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے بعض غیبی سامان بھی مہیا کئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ اس

نے ملائکہ کو پیدا کیا ہے جن کا کام یہ ہے کہ انسان کو نیکی کے رستہ پر چلاتے رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ[۵۶] یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی ملائکہ کی ایک جماعت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے شریعت نازل کی اور اسے تفصیلی ہدایات دیں۔ مگر پھر بھی انسان چونکہ غلطی کر سکتا ہے اس لئے اس کی حفاظت پر ملائکہ لگا دیئے گئے۔ ملائکہ کے ایسے اعمال کے متعلق باقی کتب خاموش ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ باقی کتب نے ملائکہ کے متعلق تفصیلی بحث کی ہی نہیں۔ بلکہ ایسے رنگ میں بحث کی ہے کہ ایک طبقہ ان کو خدا کی بیٹیاں کہنے لگ گیا۔ دنیا اس امر پر ہنستی ہے مگر تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان احسانوں میں سے ایک احسان ملائکہ کا وجود ہے مگر یہ موقع اس پر تفصیلی بحث کرنے کا نہیں ہے۔

روحانی نتائج کا اظہار

(۳) تیسرا اصل یہ بتایا کہ چونکہ انسان اگر ایک ہی رنگ میں کام کرتا چلا جائے اور اس کے نتائج نہ دیکھے تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اس لئے نتائج کے اظہار کا بھی کوئی طریق ہونا چاہئے۔ سکولوں میں طلباء کا امتحان لینے کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ نتائج دیکھ کر ان کی ہمت بڑھے اور وہ تعلیم میں ترقی کریں۔ اسی رنگ میں خدا تعالیٰ نے روحانی نتائج کے اظہار کے لئے بھی ایک طریقہ بیان فرما دیا۔ چنانچہ فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[۵۷] تم مجھے ساتھ کے ساتھ بلاؤ میں تمہاری پکار سنوں گا۔

غیر مذاہب کا بے اصولاپن

اب یہ تینوں باتیں اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں بھی ملیں گی تو سہی مگر بے اصولے طور پر۔ مثلاً (۱) وہ مذاہب جو احکام دیتے ہیں ان کی حکمت نہیں بتاتے۔ (۲) احکام تو دیتے ہیں مگر ایسے کہ جو انسانی حریّت کو کچلنے والے ہیں۔ (۳) دوسری کتابیں بعض احکام تو بیان کرتی ہیں لیکن

بے جوڑ۔ یعنی وہ نہ تو یہ بتاتی ہیں کہ جو احکام وہ بیان کرتی ہیں انہیں کیوں بیان کرتی ہیں اور نہ یہ بتاتی ہیں کہ جن کو نہیں بیان کرتیں انہیں کیوں چھوڑتی ہیں۔ دانستہ چھوڑا گیا ہے یا نادانستہ۔ جیسے وید ہیں کہ بڑے بڑے اہم امور کے متعلق کچھ بیان نہیں۔ حتّٰی کہ قصاص اور عفو اور محرمات تک کے متعلق بھی کوئی حکم نہیں۔ انجیل نے تو غضب کیا ہے کہ ایک طرف تو وہ شریعت کو لعنت قرار دیتی ہے اور دوسری طرف احکام بھی دیتی ہے۔ حالانکہ اگر یہ درست ہے کہ شریعت لعنت ہے تو چاہئے تھا کہ انجیل میں کوئی بھی حکم نہ ہوتا۔ مگر حکم ہیں۔ جیسا کہ متی باب ۵ آیت ۳۲ میں آتا ہے:-

پھر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے۔ وہ اس سے زنا کراتا ہے۔ اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔ [۵۸]

اگر شریعت لعنت ہے تو معلوم نہیں اس لعنت سے لوگوں کو کیوں حصّہ دیا گیا ہے۔ اور اگر کہو کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے تو باقی ضروری باتیں کیوں چھوڑ دی گئیں۔ وہ بھی بتا دی جاتیں۔ غرض ان مذاہب نے ایک بے جوڑ سی بات کر دی ہے۔ کہیں کوئی بات چھوڑ دی اور یہ نہ بتایا کہ جن احکام پر خاموشی اختیار کی ہے ان پر خاموشی کیوں اختیار کی ہے اور کہیں بیان کر دی اور اس کی حکمت نہ بتائی۔ مگر قرآن اصولی بات کہتا ہے۔ جو حکم دیتا ہے اس کی حکمت بتاتا ہے۔ اور جن احکام کو اس نے چھوڑا ہے ان کی وجہ بھی بیان کر دی ہے مگر دوسری کتابوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ ویدوں میں بہن بھائی کی شادی کی کہیں ممانعت نہیں ہے۔ لیکن ویدوں کے ماننے والے اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے مکمل ہونے کا ایک واضح ثبوت

میں ان روحانی ہدایت ناموں کی پرکھ کے متعلق ایک موٹا نسخہ بتاتا ہوں۔ ہر ایک کتاب جو قرآن کریم کے سوا ہے۔ اس میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں ان کے علاوہ ضرور ایسے مسائل نکلیں گے کہ جن پر عمل کرنے کو اخلاقی بُرائی سمجھا جائے گا۔ لیکن ان کی ممانعت اس کتاب میں نہیں ملے گی۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کریم میں ایک بھی امر ایسا نہیں جس پر عمل اخلاقی بُرائی سمجھا جائے اور

اس سے اسلام نے نہ روکا ہو۔ یا اس کے متعلق خاص طریق عمل کا ارشاد نہ کیا ہو۔ یہ مختصر گر اس کی تعلیم کے مکمل ہونے کا ایک اہم ثبوت ہے۔

عالمِ معاد کے متعلق اسلام کی جامع تعلیم

(۴) چوتھا امر جس کے متعلق ہدایت دینا مذہب کا اہم فرض ہے وہ معاد کے متعلق ہے یعنی وہ بتائے کہ مرنے کے بعد انسان کی کیا حالت ہوگی؟ اسلام اس بارہ میں بھی مفصّل بحث کرتا ہے۔ جسے اس موقعہ پر تفصیلاً تو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دو آیتیں اس کی تائید میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔[۵۹] یعنی کیا تم لوگ یہ خیال کرتے ہو کہ تمہاری پیدائش عبث اور فضول ہے اور تم لوٹ کر ہماری طرف نہیں آؤ گے۔ یہ آیت زمین اور آسمان کی پیدائش اور احیاء اور اماتت اور اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے ذکر کے بعد آئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ انسان میں ہم نے کتنی طاقتیں رکھی ہیں۔ کس طرح زمین اور آسمانوں کو اس کے لئے مسخر کیا۔ اس کے لئے چاند اور سورج پیدا کئے۔ ان کے اثرات رکھے۔ پھر انسان کے اندر قابلیتیں ودیعت کیں۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان دنیا میں کھائے پیئے اور مر کر ختم ہو جائے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ انسان کے لئے بہرحال ایک اور زندگی ہونی چاہئے جس میں وہ اپنے اعمال کا جوابدہ ہو اور جو اس کی پیدائش کی غرض کو تکمیل تک پہنچانے والی ہو۔

پھر سورۃ قیامہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَاۤ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ وَلَاۤ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ۔[۶۰] یعنی میں مرنے کے بعد پھر دوبارہ زندہ ہونے کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اس پر کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کی دلیل دینی تھی اسی کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ذرا آگے پڑھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں قیامت سے مراد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ ہے کیونکہ نبی کی بعثت بھی ایک قیامت ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اسی سورۃ میں فرماتا ہے۔ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ۔ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ۔[۶۱] یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ قیامت کا دن کب ہوگا ان سے کہہ دو کہ یہ وہ

زمانہ ہوگا جب نظر پتھرا جائیگی۔ یعنی نئے نئے علوم نکلیں گے اور انسان حیران رہ جائیں گے وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ اور چاند اور سورج کو گرہن لگے گا۔ اس وقت انسان کہے گا کہ اب میں بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔ یہاں قیامت سے مراد مسیح موعود کا زمانہ ہے اور اسے قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب مسلمانوں کی تباہی اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی ہوگی اس وقت خدا تعالیٰ پھر ان کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ پیشگوئی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کے متعلق ہے کہ مسلمان تباہ و برباد ہونے کے بعد پھر ترقی کریں گے اور اس بات کا پورا ہونا بتادے گا کہ قرآن ایسے منبع سے نکلا ہے جہاں سے کوئی بات غلط نہیں نکلتی۔ جب یہ بات پوری ہو جائے گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد کے متعلق بھی قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ انسان کے اندر جو نفسِ لوّامہ رکھا گیا ہے وہ بھی قیامت کا ثبوت ہے۔ انسان جب کوئی گناہ کی بات کرتا ہے تو اس پر اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ بھی جب جھوٹ بول رہا ہوتا ہے تو سمٹتا اور سکڑتا جاتا ہے کیونکہ نفسِ لوّامہ جو اس کے اندر موجود ہے وہ اسے شرم دلا رہا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہی نفسِ لوّامہ جس کے نتیجہ میں انسان محسوس کرتا ہے کہ اخلاق کیا ہیں اور بداخلاقی کیا ہے۔ گناہ کیا ہے اور ثواب کیا ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ قیامت کا بھی ایک دن مقرر ہے ورنہ اس کے اندر ندامت کا یہ احساس کیوں پیدا ہوتا۔ اسی طرح قرآن کریم عذاب اور انعام کی تمام تفصیلات بتاتا ہے اور ان کی حکمتیں بتاتا ہے اور سزا اور اس کی غرض اور انعام اور اس کا مقصد اور طریقِ سزا اور طریقِ انعام غرض ہر ایک پہلو پر مفصل روشنی ڈالتا ہے جس کی مثال دوسری کتب میں بالکل نہیں ملتی اور اگر ملتی ہے تو ناقص طور پر۔ پس ضرورتِ مذہب کے بیان کرنے میں بھی اسلام دوسرے مذاہب سے افضل ہے۔

خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا کرنے اور روحانی طاقتوں کو تکمیل تک پہنچانے والا مذہب

(۵) اب میں پانچویں بات بیان کرتا ہوں کہ جو ضرورتیں کوئی مذہب پیش کرے اس کا فرض ہے کہ وہ انہیں پورا بھی کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سوائے قرآن کریم کے اور کوئی کتاب

پوری نہیں اُترتی۔ صرف قرآن کریم ہی ہے جو اس امر کا مدعی ہے کہ جب تک کوئی مذہب خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا نہیں کراتا اور روحانی طاقتوں کو مکمل نہیں کراتا اور اُخروی بھلائی کی ضمانت اسے نہیں دیتا اس کی خالی تعلیم اسے نفع نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ وہ اس دنیا سے آواز دیتا ہے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا [۱۲] یعنی یہ یاد رکھو کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی غرض یہ ہے کہ انسان خدا کو پالے کیونکہ مذہب کا مدعا یہ ہے کہ انسان خدا کو دیکھ لے۔ اور اگر اس دنیا میں خدا کسی کو نظر نہیں آتا تو اگلی دنیا میں بھی نظر نہیں آئے گا۔ خدا کو دیکھنے کی اس دنیا میں بھی ضرورت ہے۔ اگر ایک انسان سب عبادات بجالاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے نظر نہیں آتا تو صاف معلوم ہوا کہ عبادت کا جو اصل مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوا۔ اور جو شخص اس دنیا میں خدا کو دیکھنے سے اندھا رہا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا اور اسے وہاں بھی خدا نظر نہیں آئے گا۔ اَضَلُّ سَبِيْلًا کے معنی یہ ہیں کہ اگلے جہان میں اس کی نابینائی اور بھی بھیانک ہوگی کیونکہ وہاں توبہ کا کوئی موقع نہ ہوگا۔

آخرت سے آواز

پھر وہ آخرت سے آواز دیتا ہے کہ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ - يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ۔ [۱۳] یعنی اس روز تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے بھی اور ان کے دائیں طرف بھی بھاگتا جائے گا۔ اس میں بتایا کہ اگلے جہان کی ترقیات بہت جلدی جلدی ہونگی نور تیز بھی ہوگا جبکہ ساتھ چلنے والے بھی تیز ہونگے۔ وہ نور بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ رہے گا یعنی ان کے دائیں بائیں بھی نور ہوگا اور آگے بھی۔ گویا اس میں ترقیات کی رفتار کی تیزی اور اس تیزی میں مومنوں کے ہم قدم رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ خدا تعالیٰ کے فرشتے انہیں

کہیں گے کہ آج تمہارے لئے بشارت ہے۔ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ان جنات اور قسم قسم کے باغوں کی جن میں نہریں بہہ رہی ہیں۔ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں مومنوں سے کہیں گے کہ تم تو دوڑے جارہے ہو ذرا ہمارا بھی انتظار کرو۔ ہم بھی تم سے نور لے لیں۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا تمہیں یہاں سے نور نہیں مل سکتا۔ اگر طاقت ہے تو تم پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ۔ اور وہیں جاؤ جہاں سے تم آئے ہو اور وہاں جاکر نور کی تلاش کرو۔ اس میں بتایا کہ وہ نور جو اگلے جہان میں کام آئے گا اسی دنیا میں ملتا ہے۔ وہاں جانے کے بعد نہیں ملے گا۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ انسان اسی دنیا میں نیکیاں کرے تب اگلے جہان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ مگر دیکھو رحمت الٰہی بھی کس قدر وسیع ہے۔ کہا جاسکتا تھا کہ جب دنیا میں کسی کو نور نہیں ملا تو کیا پھر اسے کبھی نور نہ مل سکے گا اور وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائے گا اور اگر اسے نور مل سکتا ہے جس کی طرف فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا میں ایک مخفی اشارہ ہے تو کیسے۔ اس کے متعلق فرمایا۔ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ۔ منافقوں اور مومنوں کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی۔ اور اس میں ایک دروازہ رکھا جائے گا۔ یہ تو صاف بات ہے کہ جنت والے تو جنت سے باہر نہیں جائیں گے اس لئے یقیناً یہ دروازہ اسی لئے رکھا جائے گا کہ باہر والے اندر آجائیں۔ پس بتایا کہ گو نور اسی دنیا میں حاصل ہوسکتا ہے لیکن جو اس سے محروم رہیں گے انہیں بعض حالتوں میں سے گذارنے کے بعد معاف کردیا جائے گا۔ اور وہ اس دروازہ میں سے گذر کر جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ جنتی حواس اور قوتوں سے ہی دوزخ پیدا ہوتی ہے۔ یعنی حواس حقیقی تو نیک ہی ہیں لیکن ان کے غلط استعمال سے دوزخ پیدا ہوتی ہے۔ غرض اس دعویٰ میں بھی قرآن کریم کے ساتھ اور کوئی کتاب شریک نہیں ہے۔

ایفائے وعدہ کا ثبوت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُوپر جو کچھ بیان ہوا یہ تو دعویٰ ہے۔ کیا ایفائے وعدہ بھی ہوگا سو اس کے متعلق فرمایا۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْکٰفِرِیْنَ۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ [64] یعنی اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ کر افتراء کرے۔ یا اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوسکتا ہے جو اس سچائی کا انکار کر دے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس آئے۔ کیا ایسے کافروں کی جگہ جہنم نہیں ہونی چاہئے؟ ہاں وہ جو ہماری تعلیم قرآن کے مطابق ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہیں ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشیں گے اور اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ محسنوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اس آیت میں بتایا کہ ایسے لوگ جتنا ہماری طرف چل کر آسکیں گے اتنا اگر چلیں گے۔ تو جب ان کے پیر چلنے سے رہ جائیں گے ہم خود جا کر انہیں لے آئیں گے کیونکہ ہمارا یہ طریق ہے کہ کچھ بندہ آتا ہے اور کچھ ہم اس کی طرف جاتے ہیں۔

یہاں وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا الخ میں یہ بتایا کہ قرآن خدا پر افتراء نہیں۔ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو اس کے بنانے والا عذاب میں مبتلا کیا جاتا۔ پھر وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا میں یہ بتایا کہ جھوٹ کوئی اس وقت بولتا ہے جب سچائی سے اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ لیکن جب ہم نے کلام نازل ہونے کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور ہم نے کہہ دیا ہے کہ محسن بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاؤ گے تو کیوں سچی کوشش کر کے سچا کلام حاصل نہ کیا جائے۔ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

رضائے الٰہی حاصل کرنے والا کامیاب گروہ

اس آیت کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ایسا کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا خدا تعالیٰ نے ایسا کیا بھی ہے یا نہیں؟ سو اگرچہ اس سوال کا جواب اسی آیت میں آجاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے اتصال اس کا ہوگا جو مناسب روحانی تکمیل حاصل کر چکا ہو اور وہ جنّت بھی پائے گا۔ لیکن علیحدہ علیحدہ بھی ان باتوں کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ

سے کامل تعلق رکھنے والے آخر قرآن پر چل کر اپنی مراد کو پہنچ گئے اور انہوں نے جنت پالی۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ [۶۵] فرمایا۔ ان مومنوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے جو عہد کیا تھا اسے انہوں نے پورا کر دیا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کو پورا کر دیا اور وہ خدا سے مل گئے۔ نَحب کے معنی نذر اور مَا اَوْجَبَ عَلٰى نَفْسِهٖ کے بھی ہوتے ہیں۔ پس اس سے مراد مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [۶۶] کے عہد کو پورا کرنے کے ہیں۔ لیکن فرماتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو ابھی اس خلش میں لگے ہوئے ہیں کہ خدا سے مل جائیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے جدو جہد کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ سو خدا ایسے صادقوں کو بھی ان کے صدق کا ضرور بدلہ دے گا۔

اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن نے یہ امر تسلیم کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو قرآن پر چل کر خدا کو مل گئے۔

ملائکہ سے مومنوں کا تعلق

پھر ملائکہ چونکہ اخلاق فاضلہ کی محرک ہستیاں ہیں۔ اس لئے مزید ثبوت کے لئے فرمایا کہ ان کی روحانی درستی کی علامتیں بھی ظاہر ہونے لگتی ہیں اور روحانی تکمیل کے موکّل ان سے ملنے لگتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۔ [۶۷]

یعنی وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر استقامت سے قائم رہتے ہیں

یعنی اپنے اعمال سے اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہم ان پر فرشتے نازل کرتے ہیں جو انہیں کہتے ہیں ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی غلطی کا غم کرو۔ تمہیں جنّت کی بشارت ہو۔ تم خدا سے جاملو گے اور وہاں تمہیں وہ چیز مل جائے گی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے مددگار رہوں گے اور تم اس دنیا میں اور اگلے جہان میں جو کچھ چاہو گے اور جو کچھ مانگو گے وہ تمہیں مل جائے گا۔ اس میں بتایا کہ تمہاری قلبی اصلاح بھی ہو جائے گی اور عملی بھی۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کے متعلق فرمایا کہ اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ [۶۸] تم جو چاہو کرو۔ یعنی اب تم بدی کر ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح یہاں بھی یہی مراد ہے کہ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ تمہارے نفس ایسے پاکیزہ ہو گئے ہیں کہ اب جو کچھ تم چاہو گے پاک چیز ہی چاہو گے۔ یعنی تمہارے دل میں نیک تحریکیں ہی ہونگی بُری نہیں ہونگی۔ اور ہمیشہ پاک چیزیں ہی مانگو گے بُری نہیں مانگو گے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ پچھلے زمانہ پر ہی ختم ہو گیا یا آگے بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔ سو اس کا جواب بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَالْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یعنی وہی خدا ہے جس نے ایک اَن پڑھ قوم کی طرف اسی میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا جو اُن کو خدا کے احکام سناتا اور ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے گو وہ اس سے پہلے بڑی بھاری گمراہی میں مبتلا تھے۔ اسی طرح ان لوگوں کے سوا اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم میں بھی اس رسول کو بھیجے گا جو ابھی تک ان سے ملی نہیں اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو کچھ اس رسول کے زمانہ میں ہوا وہی اِس زمانہ میں بھی ہوگا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا بند نہ ہوگا۔

فائدہ کی شدت کے لحاظ سے قرآن کریم کی فضیلت

(۴) فضیلت کی ایک اور وجہ فائدہ کی شدت کے لحاظ سے ہوتی ہے یعنی گو فائدہ تو اور چیزوں

میں بھی ہوتا ہے مگر جس چیز کا فائدہ اپنی شدت میں بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اسے دوسروں پر فضیلت دی جاتی ہے۔ قرآن کریم کے متعلق جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو اس بارے میں بھی فضیلت حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۔[69] یعنی اے مسلمانو! تم ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے رہو کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا رستہ دکھا اور اس رستہ پر چلا جس پر چل کر پہلے لوگوں نے تیرے انعامات حاصل کئے۔ گویا جس قدر انعامات تُو نے پہلے لوگوں پر کئے ہیں وہ سب کے سب ہم پر بھی کر۔ اور پہلے لوگوں کے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ [70] یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہداء کا درجہ پانے والے ہیں۔ اس آیت میں بتایا کہ تمام اُمتوں میں شہداء اور صدیقوں کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر جہاں رسول کریم ﷺ کا ذکر کیا وہاں فرمایا۔ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ۔[71] یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں میں شامل ہونگے جن پر خدا تعالیٰ کے انعامات نازل ہوئے یعنی نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحین میں۔ گویا پہلے نبیوں کی اطاعت سے تو صرف صدیق اور شہداء بنتے تھے مگر اس نبی کی اطاعت سے نبوت کا درجہ بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے نبوت ملی ہے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس بات پر زور دیا اور بار بار اس کا اعلان کیا کہ مجھے محض رسول کریم ﷺ کی غلامی میں درجہ نبوت حاصل ہوا ہے۔

انبیاء اور صدّیقین وغیرہ کی معیّت کا مفہوم

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہاں مَعَ الَّذِیۡنَ آیا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ اور اس رسول کی اطاعت سے کوئی نبی بن سکتا ہے بلکہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اسے انبیاء کی معیّت حاصل ہوگی۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر نبی بننے کی نفی کی جائے گی تو اس کے ساتھ ہی صدیق، شہید

اور صالح بننے کی نفی بھی کرنی پڑے گی۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ امت محمدیہ میں اب کوئی صدیق، شہید اور صالح بھی نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر صالحیت، شہادت اور صدّیقیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو پھر نبوت کا انعام بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن کریم کا کوئی لفظ حکمت کے بغیر نہیں ہے تو پھر یہاں مَعَ کا لفظ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ جیسا کہ دوسری جگہ مَعَ الَّذِیْنَ نہیں رکھا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ وہ صدیق اور شہید ہونگے۔ اسی طرح یہاں بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَعَ رکھ کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اس رسول کی اطاعت کرنے والے صرف صدیق ہی نہیں ہونگے بلکہ سب اُمتوں کے صدیقوں کی خوبیاں ان میں آ جائینگی۔ صرف شہید ہی نہیں ہونگے بلکہ پہلے سب شہیدوں کی صفات کے جامع ہونگے۔ صرف صالح ہی نہیں ہونگے بلکہ پہلے صالحین کی سب خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہوں گے اسی طرح جو نبی آئے گا وہ پہلے سب نبیوں کی خوبیوں اور کمالات کا بھی جامع ہوگا۔ پس مَعَ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے نتیجہ کو بڑھا دیا ہے گھٹایا نہیں۔ اور بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ پہلے لوگوں کے مراتب سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔

ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک کلام

(۵) ایک اور وجہ فضیلت یہ ہوتی ہے کہ جو چیز پیش کی جائے اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ قرآن کریم کی فضیلت اس لحاظ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس کے متعلق لوگ بحث کرتے رہتے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ آج میں یہ بتاتا ہوں کہ وہ اپنے مطالب کے لحاظ سے کیسی ضروری اور اہم ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ [۴۲] صرف یہی ایک کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں باقی سب میں ملاوٹ ہے۔ تورات کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کا ہے بلکہ اس میں ایک جگہ تو یہاں تک لکھا ہے کہ

''خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا۔ اور اس

نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیتِ فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔'' [۳۱]

اسی طرح انجیل کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے بندے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پس موٹی اور واضح ضرورت اس آیت کی یہی ہے کہ اس میں دنیا کو یہ بتایا گیا ہے کہ باقی کتابوں میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں لیکن صرف یہی ایک کتاب ہے جس میں کوئی ملاوٹ نہیں۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ یہ تو قرآن کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے جو اُس وقت کیا گیا ہے جب قرآن نازل ہوا۔ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ بعد میں بھی اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہو سکی۔ سو اس کے متعلق فرماتا ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ [۳۲] ہم نے ہی اس قرآن کو اُتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ گویا آئندہ کے متعلق بھی ہم اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ کوئی شخص اس میں تغیر و تبدّل نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب تک اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

ربوبیت عالمین کا بلند تصور

(۶) فضیلت کی چھٹی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی ہو کیونکہ اپنی چیز ہمیشہ دوسروں کی چیزوں سے پیاری لگتی اور افضل نظر آتی ہے۔ قرآن کریم کو جب ہم اس نکتہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ بھی اپنی چیز نظر آتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ کا خیال لوگوں میں پیدا کیا اور اس طرح قومی خداؤں کا تصور باطل کیا۔ بائیبل پڑھ کر دیکھو تو اس میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا خدا۔ تیری قوم کا خدا۔ فلاں قوم کا خدا۔ ویدوں کو پڑھ کر دیکھو تو برہمنوں کا خدا الگ معلوم ہوتا ہے اور دوسروں کا الگ۔ مگر قرآن کی ابتداء ہی اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ سے ہوتی ہے۔ اس طرح دنیا کو یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ساری دنیا کے ربّ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے اور سب کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ غرض اسلام نے سب لوگوں کو جو علیحدہ علیحدہ تھے ماں کی طرح اکٹھا کیا اور کہہ دیا کہ ایک خدا کے پاس آجاؤ۔ پہلے لوگوں میں شرک پیدا ہونے کی یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ

الگ الگ خدا سمجھتے تھے۔ ہندو کہتے تھے کہ ہمارا خدا ایسا ہے، یہود کہتے تھے ہمارا خدا ایسا ہے، پارسی کہتے تھے کہ ہمارا خدا ایسا ہے۔ پھر بعض لوگوں نے کہا کہ چلو سب کے خداؤں کو پُوجو تا کہ سب سے فائدہ حاصل ہو۔ اس طرح شرک پیدا ہو گیا۔ مگر اسلام نے بتایا کہ مومن اور کافر سب کا خدا ایک ہی ہے۔ اور اسلام کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ یعنی اسلام کا چراغ ایک ایسے برکت والے تیل سے جلایا جا رہا ہے جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی۔ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔ سب کے لئے اس میں ترقیات کے دروازے کھلے ہیں۔ اس طرح اسلام نے قومیت کے امتیاز کو مٹا دیا اور بڑائی کا معیار یہ رکھا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[۵] اسلام میں بڑائی کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ خواہ کوئی کیسی ہی ادنیٰ قوم کا فرد ہو اگر وہ متقی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہے۔ پس اسلام نے ذات پات کو مٹا دیا اور مختلف مذاہب کے نتیجہ میں جو تفرقے پیدا ہوتے تھے، ان کو دُور کر دیا۔

دوستوں کو چاہئے کہ قرآن کریم کو اپنا دستور العمل بنائیں

میں نے فضیلت قرآن کی ۲۶ وجوہات میں سے اِس وقت صرف چھ کا ذکر کیا ہے اور ان کی بھی ایک ایک مثال دی ہے۔ خدا تعالیٰ نے توفیق دی تو باقیوں کے متعلق پھر بحث کرونگا۔ فی الحال اسی پر بس کرتا ہوں۔ اور دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ ایسی افضل اور بے نظیر کتاب پر عمل کرنے اور اس کے احکام کو حرزِ جان بنانے کی کوشش کرو۔ اس وقت میں قرآن کریم کے جن مطالب کو واضح کر سکا ہوں ان کے مقابلہ میں اور کوئی کتاب ایسے مطالب پیش نہیں کر سکتی۔ دوستوں کو چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی اس کتاب کی طرف خاص طور پر توجہ کریں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر کسی انسان کے پاس بہتر سے بہتر چیز ہو لیکن وہ استعمال نہ کرے تو اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کنواں موجود ہو لیکن ہم پانی نہ پئیں تو کس طرح پیاس بجھ سکتی ہے۔ پس یہ اعلیٰ درجہ کی کتاب جو تمہارے پاس موجود ہے یہ اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب کہ تم اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔

پس اپنے اندر تغیر پیدا کرو اور اپنی اصلاح کی کوشش کرو۔ اور ہر معاملہ میں قرآن کریم کی

ff17

اقتداء کرو تا کہ قرآنی حسن دنیا پر نمایاں ہو۔ اور انہیں بھی اس پاک کتاب کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی طرف توجہ پیدا ہو کیونکہ اس کے بغیر اور کہیں نور اور ہدایت نہیں۔

۱ النور:۳۶تا۳۹ ۲ الشعراء:۱۹۳تا۱۹۵
۳ الزمر:۲۴ ۴ القلم:۴۵
۵ الشعراء:۶ ۶ البقرة:۱۰۷
۷ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء
۸ المزّمّل:۱۶
۹ یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲، ۱۳ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء
۱۰ المائدة:۴ ۱۱ هود:۱۸
۱۲ بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۱۳ العلق:۲تا۶
۱۴ پیدائش باب ۱ آیت ۱، ۲ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء
۱۵ یوحنا باب ۱ آیت ۱، ۲ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء
۱۶ متی باب ۱۲ آیت ۲۶ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء
۱۷ صٓ:۲ ۱۸ الزمر:۴
۱۹ الواقعة:۸۰ ۲۰ الانبیاء:۸۸
۲۱ تفسیر ابن عربی جلد ۲ صفحہ ۸۸ مطبوعہ بار دوم بیروت ۱۹۷۸ء
۲۲ فتوحاتِ مکیہ (مؤلفہ حضرت محی الدین ابن عربی) جلد ۱ صفحہ ۱۲۱ مطبوعہ مصر
۲۳ فاطر:۲ ۲۴ الشعراء:۱۹۳ ۲۵ الفرقان:۶۱
۲۶ ابراهیم:۵ ۲۷ هود:۹۲ ۲۸ الزخرف:۲۱
۲۹
۳۰

۳۱

۳۲

۳۳ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸،۱۹ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء

۳۴ الجمعۃ:۲تا۵ ۳۵ الانعام:۱۰۹ ۳۶ الانعام:۱۰۹

۳۷ متی باب ۱۲ آیت ۴۶ تا ۵۰ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۳۸ The Hymns of the Rigveda Vol:1 Book IV Hymn XVIII, P.416 Benares,1920.

۳۹ الرّحمٰن:۱۴ ۴۰ الرّحمن:۲۷،۲۸

۴۱ الملک:۲،۳ ۴۲ الانعام:۱۰۳،۱۰۴

۴۳ المؤمن:۶۵ ۴۴ الشعراء:۱۹۳تا۱۹۷

۴۵ الزخرف:۲۱ ۴۶ الفرقان:۶۱

۴۷ الفرقان:۶۲،۶۳ ۴۸ بنی اسرائیل:۸۶تا۹۰

۴۹ الواقعہ:۷۸،۷۹ ۵۰ المائدۃ:۱۶

۵۱ الانعام:۱۰۰ ۵۲ النور:۳۷

۵۳ المؤمنون:۵۲ ۵۴ المائدۃ:۱۰۲

۵۵ الشوریٰ:۳۹ ۵۶ الرعد:۱۲

۵۷ المؤمن:۶۱

۵۸ متی باب ۵ آیت ۳۲ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء(مفہوماً)

۵۹ المؤمنون:۱۱۶ ۶۰ القیمۃ:۲تا۴

۶۱ القیمۃ:۷تا۱۱ ۶۲ بنی اسرآئیل:۴۳

۶۳ الحدید:۱۳،۱۴ ۶۴ العنکبوت:۶۹،۷۰

٦٥ الاحزاب:۲۴، ۲٦　　　٦٦ الذّٰریٰت:۵۷

٦٧ حٰمٓ السجدۃ:۳۱ تا ۳۳

٦٨ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ مصر ۱۳۱۳ھ

٦٩ الفاتحۃ:٦، ۷　　　۷۰ الحدید:۲۰

۷۱ النسآء:۷۰　　　۷۲ البقرۃ:۳

۷۳ استثناء باب ۳۴ آیت ۵، ٦ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء

۷۴ الحجر:۱۰　　　۷۵ الحجرات:۱۴

فضائل القرآن

نمبر...... ۳

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھُوَ النَّاصِرُ

ہر خوبی اور ہر وصف میں یکتا کتاب

صدقہ وخیرات اور مرد وعورت کے تعلقات کے متعلق اسلام کی جامع تعلیم

(فرمودہ ۲۸ ردسمبر ۱۹۳۰ء برموقع جلسہ سالانہ قادیان)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے سورۃ عَبَسَ کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی۔اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی۔وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی۔اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی۔اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی۔فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی۔وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی۔وَھُوَ یَخْشٰی۔فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَہّٰی۔کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ۔فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ۔فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ۔مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ۔بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ۔کِرَامٍ بَرَرَۃٍ۔[1]

اس کے بعد فرمایا:

مجھے کھانسی تو پہلے ہی سے تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جلسہ کے پچھلے دو دن کام کی توفیق عطا فرمادی۔اس وقت بھی آواز اونچی نہیں نکلتی لیکن امید ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے جب حلق میں گرمی پیدا ہوگئی تو آواز بلند ہوجائیگی اور سب احباب تک پہنچنی شروع ہوجائیگی۔دوست

گھبرائیں نہیں بلکہ اطمینان سے بیٹھے رہیں۔

ایک دوست کے چند سوالات کے جوابات

پیشتر اس کے کہ میں آج کا مضمون شروع کروں میں ایک دوست کے چند سوالات کے جواب دینا چاہتا ہوں جو میری کل کی تقریر کے متعلق ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ اس تقریر سے پیدا ہوئے ہیں۔ سوال تو ایسے ہیں کہ بجائے خود لمبی تقریر چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ جس مضمون کو مَیں اس موقع پر بیان کرنے کا ارادہ کر کے آیا ہوں اسے نظرانداز کردوں اور ان سوالات کا اور ان کے علاوہ دوسرے سوالوں کا تفصیلی جواب دینا شروع کردوں۔ اگر میں ایسا کروں تو میری مثال اس ہردلعزیز کی سی ہو جائیگی جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دریا کے کنارے بیٹھا رہتا تھا اور جو لوگ اسے دریا سے پار اُتارنے کیلئے کہتے انہیں پار لے جاتا۔ ایک دفعہ وہ ایک شخص کو اُٹھا کر لے جارہا تھا اور ابھی دریا کے نصف میں ہی پہنچا تھا کہ ایک اور شخص نے اُسے آواز دی کہ مجھے بہت ضروری کام ہے مجھے جلدی لے جاؤ۔ اس نے پہلے شخص کو اسی جگہ دریا میں کھڑا کیا اور دوسرے کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔ جب اسے لے کر گیا تو ایک تیسرے نے کہا کہ مجھے بہت جلدی جانا ہے مجھے لے چلو۔ اس پر دوسرے کو بھی پانی میں کھڑا کر کے واپس آ گیا اور تیسرے کو لے کر چلا۔ ان میں سے تیرنا کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ اچانک پانی کا ایک ریلا آیا تو پہلے نے کہا۔ میاں ہردلعزیز مجھے بچانا۔ یہ سن کر اس نے جس شخص کو اُٹھایا ہوا تھا اسے پانی میں کھڑا کر کے پہلے کو بچانے کیلئے لپکا۔ اس تک ابھی پہنچا نہ تھا کہ تینوں ڈوب گئے۔

پس یہ طریق اختیار کرنا کہ مقررہ لیکچر سے ہٹ کر ہر قسم کے سوالات کا جواب دینا شروع کردیا جائے اپنے کام کو نقصان پہنچانا ہے۔ گو ممکن ہے اس طرح ہردلعزیزی تو حاصل ہو جائے لیکن فائدہ کسی کو نہیں پہنچے گا۔ پس میں اس وقت سوالات کا مفصل جواب نہیں دے سکتا۔ البتہ مختصر طور پر چند باتیں بیان کردیتا ہوں۔

مسلمان محکوم ہوسکتا ہے یا نہیں؟

سائل کا ایک سوال یہ ہے کہ مسلم کو کسی کا محکوم نہیں ہونا چاہئے۔ اگر احمدی حقیقی مسلمان ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی مسلمان بھی آزاد نہیں۔ یہ صورت حالات کیوں ہے؟

اس سوال کے پہلے حصّہ کا جواب تو یہ ہے کہ مسلم کے سوا کوئی محکوم ہوتا ہی نہیں۔ مسلم کے معنی ہی فرمانبردار کے ہیں۔ پس مسلم محکوم ہوتا ہے مگر اصول کا۔ مسلم محکوم ہوتا ہے مگر راستی کا۔ مسلم محکوم ہوتا ہے مگر حق کا۔ پس جب ہم کسی مسلم کی محکومی کو دیکھیں گے تو یہ معلوم کریں گے کہ اس کی محکومی اسلام کے مطابق ہے یا خلاف۔ اگر اس کی محکومی خلاف اسلام ہو تو ہم کہیں گے ایسا نہیں ہونا چاہئے لیکن اگر اسلام کے مطابق ہو تو ہم کہیں گے کہ سچا مومن یہی ہے۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت رہنا اسلام کے اصول کے خلاف ہے تو ماننا پڑے گا کہ انگریزوں کے ماتحت احمدیوں کا رہنا بھی خلاف شریعت ہے لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ غیر مسلم حکومت کے ماتحت رہنا اسلام کے خلاف نہیں تو ماننا پڑے گا کہ احمدیوں کا انگریزی حکومت کے ماتحت رہنا بھی خلافِ شریعت نہیں بلکہ ماتحت رہنا اسلام کے عین مطابق ہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس مذہب کا ہی نام نہیں جو رسول کریم ﷺ لائے بلکہ ہر نبی جو مذہب بھی لایا وہ اسلام ہی تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ [1] یعنی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اَسْلِمْ مسلمان ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں تو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے لئے پہلے ہی اسلام لا چکا ہوں۔ غرض پہلے تمام انبیاء جو دین لائے وہ بھی اسلام ہی تھا۔ ان ہی انبیاء میں سے ایک نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ماتحت اس کی حکومت میں رہے۔ حالانکہ فرعون کا نام اب گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پھر ان ہی انبیاء میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جو رومی حکومت کے ماتحت رہے جو مشرک تھی۔ پس جب ان انبیاءؑ کے اسلام کو غیر مسلموں کے ماتحت رہنے سے کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا تو ہم جن کے ماتحت رہتے ہیں وہ تو اہلِ کتاب ہیں جو ان لوگوں سے اقرب ہیں۔ رومی کسی شریعت کے پابند نہ تھے اور نہ فرعون کے پاس کوئی شریعت تھی۔ اب اگر ان کی اور ہماری محکومیت میں کوئی فرق ہے تو یہ کہ ہم کم محکوم ہیں اور وہ زیادہ محکوم تھے۔ اگر اس محکومیت سے ان کے اسلام میں فرق نہ آیا تو پھر

ہمارے اسلام میں بھی فرق نہیں آ سکتا۔ اسلام میں کہیں یہ حکم نہیں کہ کسی مسلمان کو کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت نہیں رہنا چاہئے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ سال تک مکہ میں مشرکوں کے قوانین کے ماتحت رہے۔

باقی رہا یہ کہنا کہ احمدی اگر حقیقی مسلمان ہیں تو گویا ایک مسلمان بھی دنیا میں آزاد نہیں ہے۔ میں اس کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ مومن کسی کا غلام نہیں ہوتا۔ بھلا اس شخص کو کون غلام کہہ سکتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ دنیا کی ساری حکومتیں اور بادشاہتیں بھی اسلام کے خلاف کچھ منوائیں گی تو میں نہیں مانوں گا، وہ غلام کس طرح کہلا سکتا ہے۔ اور جو شخص یہ کہے کہ میں بڑی سے بڑی طاقت کی اسلام کے خلاف بات مان لوں گا وہ احمدی نہیں۔ پس کوئی احمدی غلام نہیں بلکہ ہر احمدی آزاد ہے۔

عیسائیوں کو کیوں حکومت ملی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومتیں چھن گئیں لیکن عیسائی بھی حضرت مسیحؑ کی کتاب کے خلاف عمل کرتے ہیں پھر ان کو کیوں حکومتیں ملی ہوئی ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سزا اُسی کو دی جاتی ہے جو خزانہ کا محافظ ہو کر غفلت اور سُستی کرتا ہے۔ عیسائی روحانی خزانہ کے محافظ نہ تھے۔ رسول کریم ﷺ کے آنے کے بعد عیسائی اس خزانہ کی محافظت سے برخاست کر دیئے گئے۔ اور رسول کریم ﷺ کو قبول کرنے کی وجہ سے یہ محافظت مسلمانوں کے سپرد ہو چکی تھی۔ اب وہ غفلت کریں تو ان کو سزا دی جائے گی عیسائیوں کو نہیں۔

مسیح موعودؑ کی بعثت سے مسلمانوں کو کیا طاقت حاصل ہوئی؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے بُرے افعال کے نتیجہ میں مسلمانوں سے حکومت اور شوکت چھن گئی تو مسیح موعودؑ نے آ کر مسلمانوں کو کیا شوکت دی۔ ان کے دعویٰ پر چالیس سال کے

قریب گذر چکے ہیں مگر انہوں نے کوئی حکومت نہ دلائی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت اس لئے نہ ملی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کئی اور انبیاء کے زمانہ میں بھی حکومت نہیں ملی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تین سو سال تک ان کے ماننے والوں میں حکومت نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شرعی نبی ہوتے ہیں اور ایک غیر شرعی۔ شرعی نبی نے چونکہ شریعت کے احکام پر جو اُسے دیئے جاتے ہیں عمل کرانا ہوتا ہے اس لئے اس کی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ حکومت دے دیتا ہے۔ اور غیر شرعی نبی نے چونکہ کسی ایسے حکم پر عمل نہیں کرانا ہوتا جس پر پہلے عمل نہ ہو چکا ہو اس لئے اس کے زمانہ میں خدا تعالیٰ قلوب کی فتح رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی خدا تعالیٰ نے یہی فتح عطا کی ہے۔

علیؓ اور خالدؓ کے مثیل

چوتھا سوال یہ کیا گیا ہے کہ چالیس پچاس سال کے عرصہ میں احمدیت کیوں ایک بھی علیؓ یا خالدؓ پیدا نہ کر سکی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احمدیہ جماعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جماعت کی مثیل ہے۔ اور یہ وہی کام کرنے آئی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے کیا۔ اس لئے اس میں خالدؓ اور علیؓ کی مثال تلاش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ وہ شرعی نبی کے ماننے والے تھے۔ شریعت کے مغز کو جاری کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام آئے۔ اور اس کے لئے نفس کی قربانی کی ضرورت تھی جس میں جماعت احمدیہ خدا تعالیٰ کے فضل سے کامیاب ہوگئی ہے۔ پس ہم سے اگر کوئی مطالبہ ہو سکتا ہے تو یہ کہ چالیس سال میں کتنے پطرس پیدا کئے؟ اس کے جواب میں ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ پطرس کیا ان سے بڑھ کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں پیدا ہوئے۔ پطرس تو جب پکڑا گیا اس نے صاف کہہ دیا کہ میں مسیح کو جانتا بھی نہیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ماننے والا جب پکڑا گیا تو اس نے پتھروں کی بوچھاڑ کے نیچے جان دے دی لیکن ایمان ہاتھ سے نہ دیا۔ پھر ہم تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں سے ایسے

لوگ پیش کر سکتے ہیں جنہوں نے حضرت مسیحؑ کی طرح قربانیاں کیں۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے صداقت نہ چھوڑی اور صلیب پر چڑھنا گوارا کرلیا۔ اسی طرح ہماری جماعت کے پانچ آدمیوں نے کابل میں صداقت کے لئے اپنی جان قربان کردی۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی جماعت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں جیسے افراد پیدا نہیں کئے بلکہ ایسے افراد پیدا کئے جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام جیسی قربانی کے نظارے دکھائے۔

احمدیت کا پیغام ابھی تک ساری دنیا میں نہیں پہنچا

پانچواں سوال یہ کیا گیا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے بعد خلیفہ اوّل کا زمانہ بھی گذر گیا۔ اب خلیفہ دوم کا زمانہ ہے مگر ابھی تک ساری دنیا میں مرزا صاحب کا نام نہیں پہنچا لیکن گاندھی جی کا پہنچ گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نام پھیلنے میں حقیقی عظمت نہیں ہوتی۔ مشہور ہے کہ کسی شخص نے چاہِ زمزم میں پیشاب کردیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ کر خوب مارا۔ اس نے کہا خواہ کچھ کرو میری جو غرض تھی وہ پوری ہوگئی ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ تمہاری کیا غرض تھی؟ تو اس نے کہا۔ مجھے شہرت کی خواہش تھی۔ یہاں چونکہ ساری دنیا کے لوگ آئے ہوئے تھے اس لئے جب میری اس حرکت کا علم سب کو ہوگا تو خواہ مجھے گالیاں دیں لیکن جہاں جہاں بھی جائیں گے اس بات کا ذکر کریں گے اور اس طرح ساری دنیا میں میری شہرت ہوجائے گی۔ غرض نام اس طرح بھی پھیل جاتا ہے لیکن حقیقی نام وہ ہوتا ہے جو دنیا کی مخالفت کے باوجود پیدا کیا جائے۔ گاندھی جی نے کھڑے ہوکر کیا کہا؟ وہی جو ہر ہندوستانی کہتا تھا۔ قدرتی طور پر ہر ہندوستانی یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کا ملک آزاد ہو۔ یہی گاندھی جی نے کہا لیکن حضرت مرزا صاحب وہ منوانا چاہتے تھے جسے دنیا چھوڑ چکی تھی اور جس کا نام بھی لینا نہیں چاہتی تھی۔ گاندھی جی کی مثال تو اس تیراک کی سی ہے جو اُدھر ہی تیرتا جائے جدھر دریا کا بہاؤ ہو لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مثال اس تیراک کی سی ہے جو دریا کے بہاؤ کے مخالف تیر رہا ہو۔ اس وجہ سے آپ کا ایک میل تیرنا بھی بہاؤ کی طرف پچاس میل تیرنے والے سے بڑھ کر

ہے۔ دنیا الہام کی منکر ہو چکی تھی۔ حضرت مرزا صاحبؑ اسے یہ مسئلہ منوانا چاہتے تھے۔ دنیا مذہب کو چھوڑ چکی تھی۔ آپ مذہب کی پابندی کرانے کے لئے آئے۔ پھر آپؑ کا اور گاندھی جی کا کیا مقابلہ۔ ابھی دیکھ لو۔ میرے مضامین چونکہ عام لوگوں کی خواہشات کے خلاف ہوتے ہیں اس لئے دوسرے اخبارات میں نہیں چھپتے لیکن ابھی میں انگریزوں کے خلاف وہی رَوش اختیار کرلوں جو دوسرے لوگوں نے اختیار کر رکھی ہے تو تمام اخبارات میں شور مچ جائے کہ خلیفہ صاحب نے یہ بات کہی ہے جو بڑے عقلمند اور محب وطن ہیں لیکن چونکہ ان کے منشاء کے مطابق اور ان کی خواہشات کے ماتحت ہمارے مضامین نہیں ہوتے اس لئے خواہ ان میں کیسی ہی پختہ اور مدلّل باتیں ہوں انہیں شائع نہیں کرتے۔ سوال کرنے والے دوست نے شاید اس پوربی عورت کا قصہ نہیں سنا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب اس کا خاوند مر گیا تو وہ یہ کہہ کر رونے لگی کہ اس کا اتنا قرضہ فلاں فلاں کے ذمہ ہے وہ کون وصول کرے گا۔ اس کے رشتہ کے مردوں میں سے ایک نے اکڑ کر کہا اری ہم ری ہم۔ اسی طرح وہ وصولیاں گناتی گئی اور وہ کہتا چلا گیا۔ اری ہم ری ہم لیکن جب اس نے کہا کہ اس نے فلاں کا اتنا قرض دینا ہے وہ کون دے گا۔ تو کہنے لگا۔ ’’ارے میں ہی بولتا جاؤں یا کوئی اور بھی بولے گا۔‘‘ اسی طرح گاندھی جی تو وصولیوں کی بات کہہ رہے ہیں اور سارا ہندوستان ان کی آواز پر کہتا جاتا ہے۔ ’’ہم ری ہم‘‘ لیکن حضرت مرزا صاحب نے جو کچھ کہا اس پر اپنے پاس سے دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اس آواز پر لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ’’ارے ہم ہی بولیں یا کوئی اور بھی بولے گا‘‘ کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے کارنامے دنیا کو ان کی طرف متوجہ کر رہے ہیں اور حکومت ان کے نام سے کانپ رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت گاندھی جی سے نہیں بلکہ ہندوستان سے کانپ رہی ہے۔ وہ یہ دیکھ رہی ہے کہ ۳۳ کروڑ کی آبادی پر چند لاکھ افراد کی حکومت کس قدر مشکل ہے۔ انگریز اس بات سے ڈر رہا ہے نہ کہ گاندھی جی سے۔

سفارشات

سوالات کے جواب دینے کے بعد اب ایک تو میں سفارش بچوں کے متعلق کرتا ہوں۔ جامعہ احمدیہ اور ہائی سکول کے طلباء نے اپنے اپنے رسالوں کے سالنامے نکالے ہیں۔ چونکہ ملک میں

رسالوں کے سالنامے نکالنے کا مرض پیدا ہو چکا ہے اس لئے بچے بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انہوں نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں ان کے پرچوں کی خریداری کے متعلق سفارش کروں۔ جب یہ رسالے جاری کرنے لگے تھے تو میں نے انہیں کہا تھا کہ اگر سکول اور جامعہ ان کو چلائے تو شوق سے نکالو لیکن اگر کہو کہ جماعت میں ان کے متعلق تحریک کی جائے تو یہ خواہش نہ کرنا لیکن اب چونکہ یہ پٹھان والی بات ہوگئی ہے کہ اس کا بچہ اپنے اُستاد پر تلوار سے وار کرنے لگا۔ تو اس نے کہا کہ اس کا پہلا وار ہے کر لینے دو۔ اس لئے گو اس سے ہماری ہی جیبوں پر اثر پڑتا ہے لیکن چونکہ یہ ہمارے بچوں کا پہلا وار ہے اس لئے میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ ان کے رسالے خریدے جائیں۔ ایک تو اس لئے کہ یہ لڑکے پہلے وار کی وجہ سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے وار کی قدر کی جائے۔ دوسرے انہوں نے ایک رنگ میں احسان بھی جتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم جلسہ کے کاموں میں لگے رہے اور رسالے نہ بیچ سکے۔ اب تو گویا ایک وجہ بھی ان کے ہاتھ آ گئی ہے۔ دوست ان کے رسالے خرید کر ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

اب میں ان باتوں میں سے دو چار اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں جو کل بیان کی تھیں۔

احمدی تاجروں کے ساتھ ہر رنگ میں تعاون کی ضرورت

میں نے بیان کیا تھا کہ مومن کے لئے دینی اور دنیوی طور پر ہر قسم کی آگ سے بچنا نہایت ضروری ہے لیکن چونکہ وقت کم تھا میں نے اس آگ سے بچنے کے صرف اصول بیان کر دیئے تھے تفصیل چھوڑ دی تھی۔ اب میں ان میں سے ایک بات کی طرف جماعت کو خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ دنیا میں بہت سے کام جو انفرادی طور پر نہیں ہو سکتے باہمی تعاون سے ہو سکتے ہیں۔ ہم نے دنیا میں جو عظیم الشان کام کرنے ہیں ان کے متعلق جب تک ہم ہر رنگ میں جماعت کی نگرانی نہ کریں وہ صحیح طور پر سرانجام نہیں دیئے جا سکتے۔ رسول کریم ﷺ نے ان قیدیوں کا جو جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے یہ فدیہ مقرر فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم دیں۔ وہ لوگ کوئی دینی تعلیم نہ دے سکتے تھے بلکہ صرف مروّجہ علوم ہی سکھا سکتے تھے مگر رسول کریم ﷺ نے اس کا بھی انتظام فرمایا۔ اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی ضروری سمجھی۔ ہمیں بھی دین کے ساتھ

جماعت کی دنیوی ترقی کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ ہاں دین کو دنیا پر مقدم کرنا چاہئے اور جہاں دنیا دین میں روک ثابت ہو وہاں اسے ترک کر دینا چاہئے۔

دنیوی ترقی کے لئے بہترین چیز تعاون ہے۔ یورپ کے لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا اور ترقی حاصل کر لی لیکن مسلمان آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ جب سارا یورپ اکٹھا ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمان اس وقت بھی آپس میں لڑ رہے تھے۔ اس وقت عیسائیوں سے باطنی حکومت نے یہ سازش کی کہ ہم سلطان صلاح الدین کو قتل کر دیتے ہیں تم باہر سے مسلمانوں پر حملہ کر دو۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ پس تعاون سے جو نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں وہ کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسی طریق سے ہماری جماعت بھی ترقی کر سکتی ہے اور اس کے لئے بہترین صورت تاجروں کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ بیشک زمیندار بھی مالدار ہو سکتے ہیں لیکن بڑے بڑے مالدار مل کر بھی غیر ملکوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس کے مقابلہ میں تجارت سے غیر ممالک کی دولت پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ تجارت دور دور تک پھیل سکتی ہے اس لئے تاجروں کی امداد نہایت ضروری چیز ہے۔ اس کے لئے سرِ دست میری یہ تجویز ہے کہ کوئی ایک چیز لے لی جائے اور اس کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم نے وہ چیز صرف احمدی تاجروں سے ہی خریدنی ہے کسی اور سے نہیں۔ اس طرح ایک سال میں اس چیز کی تجارت میں ترقی ہو سکتی ہے اور دوسرے تاجروں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سیالکوٹ کا سپورٹس کا کام ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ باہر انگلستان، آسٹریا اور جرمنی وغیرہ میں بھی جاتا ہے۔ اور یہ ایسی انڈسٹری ہے جس سے دوسرے ملکوں کا روپیہ کھینچا جا سکتا ہے۔ سیالکوٹ میں چار پانچ احمدیوں کی فرمیں ہیں۔ اس لئے اس سال کے لئے ہم یہ کام اختیار کر سکتے ہیں کہ تمام وہ احمدی جو صاحبِ رسوخ ہوں، سکولوں میں ہیڈ ماسٹر یا ماسٹر ہوں، کھیلوں کی کلبوں سے تعلق رکھتے ہوں، کھیلوں کے سامان کی تجارت کرتے ہوں یا ایسے لوگوں سے راہ و رسم رکھتے ہوں۔ وہ یہ مدّنظر رکھیں کہ جتنا کھیلوں کا سامان منگوایا جائے وہ سیالکوٹ کی احمدی فرموں سے منگوایا جائے۔ میں ان فرموں کے مالکوں سے بھی کہوں گا کہ وہ سارے مل کر ایک مال فروخت کرنے والی کمیٹی بنالیں۔ جس کے صرف وہی حصہ دار ہوں جو یہ کاروبار کرتے ہیں تاکہ سب کو حصہ رسدی منافع مل سکے۔ اس وقت مَیں صرف یہ تحریک کرتا ہوں۔ جب تاجر ایسی

کمیٹی قائم کرلیں گے، اس وقت اخبار میں میں اعلان کردوں گا کہ اس کمپنی کے مال کو فروخت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ایک دو سال میں پتہ لگ جائے گا کہ کس قدر فائدہ ہو سکتا ہے اور اگر ان لوگوں نے کوئی ترقی کی تو وہ ہماری جماعت ہی کی ترقی ہوگی۔

تعاون باہمی کے اصول پر ایک کمپنی قائم کرنے کی تجویز

اسی طرح ایک کمپنی تعاون کرنے والی قائم کرنی چاہئے جس میں تاجر، زمیندار اور دوسرے لوگ بھی شامل ہوں۔ میں نے اس کے لئے کچھ قواعد تجویز کئے تھے جنہیں قانونی لحاظ سے چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے پسند کیا تھا۔ اب ان کو شائع کر دیا جائے گا۔ یہ اس قسم کی کمپنی ہوگی کہ اس میں شامل ہونے والے ہر ایک ممبر کے لئے ایک رقم مقرر کر دی جائے گی جو ماہوار داخل کراتا رہے۔ اس طرح جو روپیہ جمع ہوگا اُس سے رہن باقبضہ جائیداد خریدی جائے گی۔ اعلیٰ پیمانہ پر تجارت کرنا چونکہ احمدی نہیں جانتے اس لئے اس میں روپیہ نہیں لگایا جائے گا بلکہ رہن باقبضہ جائیداد خرید لی جائے گی۔ جیسا کہ انجمن کے کارکنان کے پراویڈنٹ فنڈ کے متعلق کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو نفع حاصل ہوگا اس کا نصف یا ثُلث اس ممبر کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ جو فوت ہو جائے اور اس کی جمع کردہ رقم بھی اس کے وارثوں کا حق ہوگی۔ میں فی الحال اس سکیم کا مختصر الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں۔ پھر مشورہ کر کے مفصّل سکیم اخبار میں شائع کر دی جائے گی۔ دوست اس کے لئے تیاری کر رکھیں۔

اب میں وہ مضمون شروع کرتا ہوں جسے میں نے اس سال کے لئے منتخب کیا ہے۔

فضائل القرآن کے مضمون کی اہمیت

میں نے پچھلے سال کے سالانہ جلسہ پر فضائل قرآن کریم کے متعلق ایک مضمون بیان کیا تھا۔ یہ مضمون جس قدر اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ احباب اس سے لگا سکتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ قرآن کریم دنیا کی ساری مذہبی اور الہامی کتابوں سے افضل ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض ہی کچھ نہیں ہو سکتی۔ آپ کی بعثت سے پہلے بھی دنیا میں مذاہب

موجود تھے اگر آپؐ ان سے کوئی افضل چیز نہیں لائے تو پھر آپؐ کے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی! لیکن اگر قرآن کریم کی افضلیت ثابت ہو جائے تو پھر دوسرے مذاہب کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ ان کی وہی مثال ہو جاتی ہے کہ ''آب آمد تیمم برخاست۔'' اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن آب کی حیثیت رکھتا ہے تو واضح ہو جائے گا کہ پہلی کتابیں متروک ہو چکی ہیں اور اب صرف قرآن ہی قابل عمل کتاب ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ اگر ایک ایک چیز کو لے کر ہم فضیلت ثابت کریں تو شُبہ رہ سکتا ہے کہ فلاں چیز جس کا ذکر نہیں کیا گیا اس کے لحاظ سے نہ معلوم وہ افضل ہے یا نہیں لیکن اگر اصولی طور پر ہم افضلیت ثابت کر دیں تو ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم کُلّی طور پر تمام کتب الٰہیہ سے افضل ہے۔

میں نے گذشتہ سال کے لیکچر میں قرآن کریم کی افضلیت کے متعلق چھبیس وجوہ بیان کی تھیں۔ مگر ان چھبیس میں سے صرف چھ کی رو سے ہی میں نے قرآن کریم کی افضلیت ثابت کی تھی۔ اور باقی بیس میرے ذمہ قرض رہ گئی تھیں بلکہ ان چھ میں سے بھی آخری دو، وقت کی قلت کی وجہ سے نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی تھیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آج ان دو کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر دوں۔

حضرت مسیح موعودؑ کے ایک ارادہ کو پورا کرنے کی کوشش

یہ مضمون دراصل اُس عہد کا ایفاء ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ میں قرآن کریم کی افضلیت کے متعلق تین سو دلائل پیش کرنے کے بارہ میں فرمایا تھا۔ [۳] اگرچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ کی چوتھی جلد کے آخر میں ہی لکھ دیا تھا کہ:

> ''ابتداء میں جب یہ کتاب تالیف کی گئی تھی اس وقت اس کی کوئی اور صورت تھی۔ پھر بعد اس کے قدرتِ الٰہی کی ناگہانی تجلّی نے اس احقر عباد کو موسیٰؑ کی طرح ایک ایسے عالم سے خبر دی جس سے پہلے خبر نہ تھی۔ یعنی یہ عاجز بھی حضرت ابن عمران کی طرح اپنے خیالات کی شب تاریک میں سفر کر رہا تھا کہ ایک دفعہ پردہ غیب سے اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ کی آواز آئی اور ایسے اسرار ظاہر ہوئے کہ جن تک عقل اور خیال کی رسائی نہ تھی۔

سو اب اس کتاب کا متولّی اور مہتمم ظاہراً و باطناً حضرت ربّ العٰلمین ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ کس اندازہ اور مقدار تک اس کو پہنچانے کا ارادہ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس قدر اس نے جلد چہارم تک انوار حقیّت اسلام کے ظاہر کئے ہیں یہ بھی اتمامِ حجّت کے لئے کافی ہیں۔''[۴]

پھر بعد میں آپ نے یہ بھی تحریر فرما دیا کہ:

''میں نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ اثبات حقیّت اسلام کے لئے تین سو دلیل براہین احمدیہ میں لکھوں لیکن جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ دو قسم کے دلائل (یعنی سچے مذہب کا اپنے عقائد اور تعلیم میں کامل ہونا اور اس کی زندہ برکات اور معجزات) ہزارہا نشانوں کے قائم مقام ہیں۔ پس خدا نے میرے دل کو اس ارادہ سے پھیر دیا اور مذکورہ بالا دلائل کے لکھنے کے لئے مجھے شرح صدر عنایت کیا۔''[۵]

چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کی افضلیت کے وہ دلائل جن کا براہین احمدیہ میں وعدہ کیا تھا اپنی دوسری کتابوں میں بیان فرما دیئے۔ مگر ہر ایک نظر اُن تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے میں نے انہیں ایک ترتیب سے بیان کرنا ضروری سمجھا۔

پچاس وجوہِ فضیلت

لیکن جب میں اس قرضہ کی ادائیگی کا سامان کرنے کے لئے بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ قرضہ اور بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ میں نوٹ کرنے لگا تو ۲۶ کی بجائے ۵۰ فضیلت کی وجوہات مجھے معلوم ہوئیں اور اس طرح ۲۰ کی بجائے ۴۴ میرے ذمہ نکلیں۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ جب گذشتہ سال لمبا وقت صرف کر کے بمشکل چھ وجوہات پیش کی جا سکی تھیں تو اس سال ۴۴ کس طرح بیان کی جا سکیں گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ بعض لوگوں کی طبیعت چونکہ وہمی ہوتی ہے اس لئے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصولی طور پر فضیلت کے گُر بیان کر کے جو قرآن کریم کی فضیلت ثابت کی گئی ہے اور تفصیل بیان نہیں کی گئی تو اس میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ اور یہ قرآن کریم کی افضلیت کو پوری طرح ثابت نہیں کر سکتے ہوں گے۔ اس وجہ سے مجھے خیال آیا کہ جو تفصیل بیان نہیں ہو سکی تھی اس کو

بھی لے لوں۔ اس طرح میرا کام اور بھی وسیع ہو گیا جسے اس سال تو میں یقینی طور پر ختم نہیں کر سکتا۔ اور اگلے سال کے متعلق میں نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ میرے دل میں کیا ڈالے۔ اس لئے جتنا ہو سکے گا اتنا بیان کر دوں گا۔

قرآن کریم اپنی ہر بات میں افضل ہے

میں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کو جو افضلیت حاصل ہے وہ انہی باتوں میں نہیں جو اس میں دوسری الہامی کتابوں سے زائد ہیں بلکہ جو باتیں پہلی کتابوں میں موجود ہیں ان کے لحاظ سے بھی قرآن کریم ان سے افضل ہے۔ میں غور کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر پہلی کتابوں میں کپڑے بدلنے کا کوئی طریق بتایا گیا ہے تو قرآن کریم نے اس سے بہتر اور عمدہ طریق پیش کیا ہے۔ اگر ان میں کھانا کھانے کے متعلق حکم دیا گیا ہے تو اس کا بھی قرآن کریم نے ان سے اچھا طریق پیش کیا ہے۔ گویا کوئی معمولی سے معمولی بات بھی قرآن کریم نے ایسی نہیں بتائی جس میں اس کے برابر کوئی اور کتاب ہو۔ اور خواہ کوئی موٹی سے موٹی بات لے لی جائے اس میں بھی قرآن کریم دوسری کتابوں سے افضل ثابت ہوگا۔ بلکہ بغیر سوچنے اور غور کرنے کے جو پہلی بات سامنے آئے اگر اسی کو لے لیا جائے تو میں اس کے متعلق بھی بتا دوں گا کہ کس طرح معمولی سے معمولی بات کے متعلق بھی پہلی کتابوں میں تعلیم موجود ہونے کے باوجود قرآن کریم نے ان سے اعلیٰ تعلیم پیش کی ہے۔ پس ان لوگوں کا شبہ دور کرنے کے لئے جنہیں یہ خیال ہو کہ شاید تفصیل کی رو سے قرآن کریم کی فضیلت ثابت نہ ہو سکتی ہو۔ میں دو مثالیں لے لیتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ قرآن کریم نے کس طرح انہیں نئے اور علمی رنگ میں پیش کیا ہے۔

صدقہ و خیرات کے بارہ میں اسلامی تعلیم کی جامعیت

پہلی مثال میں مَیں صدقہ و خیرات کی تعلیم کو پیش کرتا ہوں۔ یہ کوئی روحانی مسئلہ نہیں بلکہ ایک فطری امر ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ حیوانوں تک میں موجود ہے۔ ایک حیوان دوسرے حیوانوں سے ہمدردی کرتا ہے۔ ایک پرندہ دوسرے پرندہ سے ہمدردی کرتا ہے۔ اگر ایک

کوّا مارو تو بیس کوّے کائیں کائیں کر کے جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک کوّے کے مرنے پر غم بھی کریں گے۔ اور اگر کسی نے مرا ہوا کوّا اُٹھایا ہوا ہو تو اس پر حملہ بھی کریں گے تا کہ اُسے چھُڑا لیں۔ غرض ہمدردی اور ایک دوسرے سے احسان کا مادہ حیوانوں اور پرندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہوتا بلکہ چونچ اور زبان ہوتی ہے اس لئے وہ اسی سے اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ انسانوں کے پاس مال و دولت اور دوسری اشیاء ہوتی ہیں وہ ان کے ذریعہ دوسروں کی امداد کرتے ہیں۔ بہرحال صدقہ اور خیرات کا مسئلہ اتنا موٹا اور اتنا عام ہے کہ کسی مذہب میں اس کے متعلق نامکمل اور ناقص تعلیم نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ہر مذہب میں مکمل تعلیم ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر آدمؑ سے لیکر اس وقت تک لوگ عمل کرتے چلے آ رہے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگر اس کے متعلق اسلامی تعلیم افضل ثابت ہو تو باقی مسائل کی تفصیلات میں اس کی تعلیم افضل ثابت نہیں ہو سکتی۔

صدقہ کے متعلق انجیل کی تعلیم

صدقہ کے متعلق جب ہم مختلف مذاہب کی تعلیم کو دیکھتے ہیں تو عجیب وغریب باتیں نظر آتی ہیں۔ انجیل میں آتا ہے:-

''یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔''[۶]

گویا انجیل کی رُو سے جب تک کوئی شخص اپنا سب کا سب مال خدا تعالیٰ کی راہ میں نہ دے دے اس وقت تک اس کا دیا ہوا مال خدا تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آتا ہے۔

''اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔''[۷]

پھر صدقہ کے متعلق حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔

''جب تُو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تا کہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔''[۸]

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل نے صدقہ وخیرات کے متعلق یہ بتایا ہے کہ اوّل جو کچھ تمہارے پاس ہو سارے کا سارا دے دو۔ دوم جب خیرات دو تو ایسی پوشیدگی سے دو کہ تمہارے اپنے ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو۔ یعنی قریب ترین رشتہ داروں یا ماتحتوں یا افسروں کو بھی پتہ نہ لگے۔

یہ دونوں تعلیمیں بظاہر بڑی خوبصورت نظر آتی ہیں کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو وہ سارے کا سارا خدا کی راہ میں دے دو۔ گو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر ہر ایک کے پاس جو کچھ ہو وہ دے دے گا تو پھر لے گا کون۔ یہ تو ویسی ہی بات ہو گی جیسے مُلّانوں نے ایک رسمِ اسقاط بنائی ہوئی ہے۔ چند آدمی حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان میں سے ایک شخص ہاتھ میں قرآن لے کر دوسرے کو دیتا ہوا کہتا ہے۔ یہ میں نے تجھے بخشا اور وہ لے کر اگلے کو یہی الفاظ کہتا ہے۔ اس طرح پھرتا پھراتا وہ قرآن پھر پہلے ہی کے پاس آ جاتا ہے۔ پس انجیل کی اس تعلیم کی اگر تفصیل میں جائیں اور یہ فرض کر لیں کہ ساری دنیا اس پر عمل کرنے لگ جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ زید کا مال زید ہی کے پاس لوٹ کر آ جائے گا۔ پس یہ تعلیم عمل کے قابل ہی نہیں ہے۔ عمل کے قابل تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس پر ہر حالت میں عمل کیا جا سکے۔ اسی طرح یہ جو حکم ہے کہ:-

''جب تو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔''[۹]

یہ حکم بھی بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر عملی طور پر اس سے بھی فائدہ کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ مثلاً ایک باپ اور بیٹا کہیں جا رہے ہیں۔ انہیں ایک ایسا محتاج مل گیا جو بھوک کے مارے بیتاب ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر باپ اسے کچھ دینا چاہتا ہے لیکن بیٹے کے ساتھ ہونے کی وجہ سے دے نہیں سکتا۔ کیونکہ انجیل کی تعلیم یہ ہے کہ جو تیرا داہنا ہاتھ خیرات کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔ اب وہ کیا کرے۔ وہ بیٹے کو علیحدہ کرنے کے لئے اِدھر اُدھر بھیجتا ہے تا کہ اس کی عدم موجودگی میں محتاج کو کچھ دے سکے مگر بیٹا سمجھتا ہے یہ اپنا بُخل چھپانے کے لئے مجھے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس سے الگ نہیں ہوتا اور محتاج انسان بغیر امداد کے رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا

ایک یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ نیکی مفقود ہو جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر نقل کرتے ہیں اور خاص طور پر بیٹا اپنے باپ سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ایسی حالت میں کئی بیٹے ایسے ہونگے جو کہیں گے کہ ہمارا باپ بڑا سنگ دل اور بے رحم ہے۔ اور بہت سے بیٹے باپ کی اس حرکت کو دیکھ کر خود بخیل ہو جائیں گے۔ کئی ایسے ہونگے جو کہیں گے کہ ہمارے باپ نے اچھا کیا ہم بھی کسی کو کچھ نہیں دیں گے۔ خواہ کوئی ہمارے سامنے بھوکا مر جائے۔ غرض یہ ایسی تعلیم ہے کہ اگر اس کی تشریح کی جائے تو دنیا کے لئے سخت خطرناک اور نقصان رساں ثابت ہو سکتی ہے۔

صدقہ کے متعلق تورات کی تعلیم

اب تورات کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تورات نے یہ تو نہیں کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو وہ سارے کا سارا دے دو بلکہ صدقہ کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ مصیبت زدہ کو دیکھ کر اس کی تکلیف کو دور کرنا چاہیئے۔ گویا تورات صدقہ کی علت غائی یہ بتاتی ہے کہ مصیبت زدوں کی امداد کی جائے۔ پھر تورات صدقہ کی دو قسمیں قرار دیتی ہے ایک واجبی اور دوسری نفلی۔ یہ انجیل سے یقیناً اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے اور دونوں قسم کے صدقے ضروری ہیں۔ بیشک رحم کے ماتحت صدقہ دینا بھی ضروری ہے لیکن اگر رحم کے ماتحت ہی صدقہ دیا جائے تو اس کا بُرا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کبر اور نخوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب انسان یہ سمجھے کہ میں بڑا اور فلاں چھوٹا ہے اور میں چھوٹے کی امداد کرتا ہوں تو اس طرح کبر پیدا ہوتا ہے کیونکہ انسان خیال کرتا ہے کہ فلاں میرا محتاج ہے حالانکہ دنیا کا ہر انسان دوسرے کا محتاج ہے۔ دنیوی لحاظ سے سب سے بڑی ہستی بادشاہ کی سمجھی جاتی ہے لیکن بادشاہ بھی ماتحتوں کے ذریعہ ہی بادشاہ بنتے ہیں اور وہ ماتحتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ خیال کہ میں بڑا ہوں اور مجھے کسی کی احتیاج نہیں دوسرے لوگ میرے محتاج ہیں، اس کی روحانی زندگی کو کچل دینے اور اللہ تعالیٰ سے دُور کر دینے والا خیال ہے۔ اس کی بجائے ہمارے اندر یہ خیال پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم نے اگر کسی کی مدد کی تو اس کی مدد نہیں کی بلکہ اپنی مدد کی ہے۔ اور یہ خیال اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ جسے کچھ دیا جائے اس کے متعلق سمجھا جائے کہ یہ اس کا حق تھا۔ یا جو کچھ دیا گیا ہے اپنے فائدہ کے لئے دیا گیا ہے۔ دیکھو ماں اپنے بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو اس پر رحم کر کے نہیں پلاتی بلکہ فطرتی جذبہ

کے ماتحت پلاتی ہے۔ ہاں اگر کسی دوسرے بچہ کو پلاتی ہے تو رحم سے پلاتی ہے۔ کئی ایسی مائیں ہونگی جنہیں اگر یہ کہا جائے کہ تم نے اپنے بچہ کو چھ ماہ تک دودھ پلا لیا۔ یہ اس پر کافی رحم ہو گیا اب دودھ پلانا چھوڑ دو تو وہ لڑنے لگ جائیں گی۔ کیونکہ ماں بچہ کو فطرتی محبت سے دودھ پلاتی ہے، رحم کے طور پر نہیں پلاتی۔

صدقہ کے متعلق ویدوں کی تعلیم

اب ہم ویدوں کو لیتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے وید نہیں پڑھے وہ تو سمجھتے ہونگے کہ اتنی بڑی بڑی ضخیم جلدیں ہیں نہ معلوم ان میں کیا کیا احکام ہونگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں احکام بہت کم ہیں۔ تاہم صدقہ وخیرات کی تعلیم کا ضرور ذکر ہے۔ وید کہتے ہیں۔ جب برہمن کوئی گائے مانگے تو اسے دے دینی چاہئے۔ جو نہ دے وہ گنہگار رہوگا اور جو دینے سے روکے وہ بھی گنہگار رہوگا۔ گویا (۱) ایک طرف تو مانگنا سکھایا (۲) اور پھر ایک خاص قوم کو صدقہ دلایا۔ (۳) اور پھر کسی میں طاقت ہو یا نہ ہو اُسے برہمن کو گائے دینے پر مجبور کیا خواہ اس کے بال بچے بھوکے مر جائیں۔ یہ وید میں صدقہ کی تعلیم ہے۔ چونکہ ہندوؤں میں برہمنوں کا زور تھا اس لئے سارا صدقہ یہی قرار دیا کہ برہمن کو دیا جائے۔ چاہے کوئی کتنا غریب آدمی ہو، اس کی بیوی کا دودھ سوکھ گیا ہو اور اس کے بچے کی پرورش اسی گائے کے دودھ پر ہو رہی ہو جو اس کے گھر میں ہو پھر بھی اسے حکم ہے کہ جب برہمن گائے مانگے تو فوراً دے دے۔ اگر نہ دے گا تو سخت گنہگار رہوگا اور اس کا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ [۱۰]

ان ساری تعلیموں کو دیکھو۔ ان میں صدقہ جیسی عام اور موٹی تعلیم میں بھی مکمل طور پر راہنمائی نہیں کی گئی اور جو لوگ کسی مذہب پر نہیں چلتے ان کے لئے ان کی اپنی مرضی راہنما ہوتی ہے۔ کسی کو جی چاہا تو دے دیا نہ چاہا تو نہ دیا۔ گویا انسان نے اپنے تجربہ سے صدقہ وخیرات کے متعلق تو کوئی قانون نہیں بنایا۔ بعض مذہبوں نے قانون بنایا مگر ناقص بنایا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام یا حضرت مسیح علیہ السلام یا ہندوستان کے رشیوں نے ایسی نامکمل اور ناقص تعلیم دی تھی بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم ناقص ہے۔ اگر ان مذاہب کے بانیوں نے یہی تعلیم دی تو یہ ناقص ہے۔ اور اگر ان مذاہب کے پیروؤں نے بنائی تو ان کی مذہبی اور الہامی کتابیں ناقص

ہیں۔

اخلاقی معلّمین کا قول کہ نیکی کو نیکی کی خاطر کرنا چاہئے

صدقہ وخیرات کے متعلق جن لوگوں نے خود تعلیم بنائی ہے اور جو اخلاقی معلّمین کہلاتے ہیں انہوں نے یہ اصل بتایا ہے کہ نیکی کو نیکی کی خاطر کرنا چاہئے۔ سوائے اس کے اور کوئی بات صدقہ کے متعلق انہیں نہیں ملی۔ ہم ان کی اس بات کو پیش نظر رکھیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ اسلام نے اس سے بہتر تعلیم دی ہے یا نہیں۔ فی الحال ہم اس کے متعلق اتنا مان لیتے ہیں کہ یہ اچھی بات ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ تعلیم ہر جگہ چل سکتی ہے اور ہر انسان اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اب اگر یہ کہیں کہ صدقہ تبھی دو جب صدقے کی خاطر دے سکو تو جو لوگ اس طرح نہیں دے سکتے وہ نہیں دیں گے۔ اور اس وجہ سے غریب صدقہ نہ ملنے پر بھوکے مریں گے کیونکہ جو اس طرح صدقہ نہیں دے سکتے وہ نہیں دیں گے وہ کہیں گے جب ہم صدقہ، صدقہ کی خاطر نہیں دے سکتے تو پھر اپنا مال کیوں ضائع کریں اور جب وہ اس وجہ سے نہیں دیں گے تو غریب لوگ نقصان اُٹھائیں گے۔

صدقہ کے مختلف پہلوؤں پر اسلام کی روشنی

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ اسلام نے کس طرح صدقہ وخیرات کو ایک علمی مضمون بنا دیا ہے۔

صدقہ کی مقدار

پہلی چیز صدقہ کی مقدار ہے کہ کس قدر دینا چاہئے۔ انجیل نے اس کے متعلق کہا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو وہ سب کا سب دے دو۔ وید کہتا ہے برہمن جو کچھ مانگے وہ اسے بلا چوں وچرا دے دو۔ مگر اسلام نے اس کی حد مقرر کر دی ہے۔ اسلام کہتا ہے۔ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۔[اا] یعنی اے انسان ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ نہ تو اپنے ہاتھ کو تو بالکل باندھ کر رکھ کہ کچھ دے ہی نہیں۔ (مغلولہ ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ کر

گلے سے لگا لینے کو کہتے ہیں) اور نہ مٹھی کو اس طرح کھول کر رکھ دے کہ جس کی مرضی ہو لے جائے۔ گویا نہ تو ایسا ہو جیسا کہ انجیل میں کہا گیا ہے کہ سب کچھ دے دو اور نہ اس پر عمل ہو جو یورپ کے فلاسفروں کی تعلیم ہے کہ صدقہ دینے سے لوگوں میں سُستی پیدا ہوتی ہے اس لئے صدقہ دینا ہی نہیں چاہئے۔ گویا پادری تو یہ کہتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو وہ سب کچھ دے دو گو آپ کچھ بھی نہیں دیتا۔ اور فلاسفر کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں دینا چاہئے۔ بہر حال یہ دونوں قسم کی تعلیمیں موجود ہیں۔ قرآن ان دونوں کو دیکھتا ہے اور پھر کہتا ہے لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ نہ تو ہاتھ کو سمیٹ کر گلے سے باندھ رکھو۔ یہ کہتے ہوئے کہ صدقہ دینے سے لوگوں کی عادتیں خراب ہوتی ہیں۔ ان میں سُستی پیدا ہوتی ہے، وہ محنت و مشقت کرنے سے جی چُراتے ہیں اور نہ سب کچھ دیدو۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو اس کے دو نتائج ہوں گے۔ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ جو بات کہتا ہے ساتھ اس کے دلیل بھی دیتا ہے۔ فرمایا۔ اگر تُو صدقہ نہ دے گا اور کہے گا کہ فلاسفر کہتے ہیں صدقہ نہیں دینا چاہئے یہ لوگوں کے لئے نقصان رساں ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا تیرا دل اور تیرے بڑے چھوٹے سب تجھے ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ تُو نے بُرا کیا۔ بھوکے کو کچھ نہ دیا، محتاج کی مدد نہ کی، حاجتمند کی امداد نہ کی۔

اس کے بعد دوسری بات یہ بتائی کہ پھر یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ سب کچھ دے دو حالانکہ انجیل نے کہا تھا کہ سب کچھ دے دینا چاہئے، اس سے اختلاف کیوں کیا۔ اس کی دلیل یہ دی فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ حَسَرَ الشَّيْءَ کے معنی ہوتے ہیں كَشَفَهٗ [۱۲] اس نے کھول دیا۔ اور حَسَرَ الْغُصْنَ کے معنی ہیں قَشَرَهٗ [۱۳] ٹہنی کے اُوپر کا چھلکا اُتار دیا۔ گویا درخت کی چھال اُتار دینے کو حَسَرَ کہتے ہیں۔ اسی طرح حَسَرَ الْبَعِيْرَ کے معنی ہیں سَاقَهٗ حَتّٰى اَعْيَاهُ [۱۴] اُونٹ کو ایسا چلایا کہ وہ تھک کر چلنے کے قابل نہ رہا۔ جس طرح درخت کی اُوپر کی موٹی چھال اُتار دینے سے درخت سوکھ جاتا ہے اُسی طرح جانور کو اتنا چلایا جائے کہ اس میں چلنے کی طاقت نہ رہے تو وہ بھی نہیں چلے گا۔ پس فرمایا خواہ تم کتنا ہی دو دنیا میں محتاج پھر بھی رہیں گے۔ اگر آج تم سارے کا سارا دے کر تھکے ہوئے اُونٹ کی طرح بن جاؤ گے یا چھال اُترے ہوئے درخت کی طرح ہو جاؤ گے تو کل

کیا کرو گے۔ جس طرح روزانہ کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی اعمال کا حال ہے۔ پس جو شخص روزانہ نیکی اور تقویٰ میں حصہ لینا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے پاس بھی مال رکھے تا کہ بڑھے اور وہ پھر اس میں سے محتاجوں کو دے۔ پھر بڑھے اور پھر دے۔ یورپ میں ایسے ایسے تاجر موجود ہیں جو ایک کروڑ روپیہ تجارت میں لگا کر کئی کروڑ نفع کماتے ہیں۔ اور پھر بڑی بڑی رقمیں خیرات میں دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنا سارے کا سارا مال ایک ہی دفعہ دے دیتے اور سرمایہ تک بھی پاس نہ رکھتے تو پھر نفع کس طرح کماتے اور کس طرح بار بار بڑی بڑی رقمیں خیراتی کاموں میں دیتے۔ پس فرمایا کہ اتنا بھی نہ دو کہ آئندہ سرمایہ پاس نہ رہے اور دوبارہ سرسبز ہونے کے سامان نہ رہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے انگریزوں میں مثل مشہور ہے کہ کسی نے سونے کا انڈا حاصل کرنے کے لئے مرغی مار ڈالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کی مرغی روزانہ ایک سونے کا انڈہ دیتی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ اگر میں اسے زیادہ کھلاؤں تو ہر روز دو انڈے دے دیا کرے گی۔ اس طرح زیادہ کھلانے کی وجہ سے وہ مرغی مر گئی۔

پس اگر انسان اس تعلیم پر عمل کرے کہ اپنا سب کچھ ایک ہی دفعہ دے دے تو وہ آئندہ کے لئے محروم ہو جائے گا اور اپنی قابلیتوں سے کام نہ لے سکے گا۔

پھر حَسَرَ کے معنی ننگے ہو جانے کے بھی ہیں۔[15] اس لئے مَّحْسُوْرًا کے معنی یہ بھی ہوئے کہ وہ ننگا ہو جائے گا۔ اور جو ننگا ہو وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پس فرمایا اگر تم اپنا سارا مال دے دو گے تو پھر تمہیں گھر میں بے کار ہو کر بیٹھنا پڑے گا اور تم کسی کام کے قابل نہ رہو گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب دنیا میں لوگ ہمیں محتاج نظر آتے ہیں تو پھر کیا کریں۔ کس طرح کچھ حصہ دے کر باقی مال اپنے پاس رکھ لیں؟ اس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا جب کسی کے پاس دولت آتی ہے تو ہمارے مقررہ قانون کے ماتحت آتی ہے۔ ہم اسی کو دولت دیتے ہیں جس میں دولت کمانے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اگر ایسی قابلیت رکھنے والوں کو ناقابل کر دیا جائے تو دنیا میں تباہی آ جائے۔

جولوگ بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں ان میں بڑھنے کی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ اگر ان سے سارے کا سارا مال لے کر غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کمانے کی قابلیت رکھنے والے بھی روپیہ نہ کما سکیں گے اور ملک تباہ ہو جائے گا۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے ہم جسے دولت دیتے ہیں اسی قانون کے ماتحت دیتے ہیں کہ اس میں ترقی کرنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اور اسی لئے دیتے ہیں کہ وہ ترقی کرے۔ چونکہ ایسے لوگوں کا سارے کا سارا مال دے دینا قوم کی تباہی کا موجب ہو سکتا ہے اس لئے ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ لوگ قابلیت رکھتے ہیں انڈسٹری کی۔ وہ قابلیت رکھتے ہیں تجارت کی۔ وہ قابلیت رکھتے ہیں صنعت وحرفت کی۔ اگر ان کا سارے کا سارا مال فقیروں میں بانٹ دیا جائے تو پھر وہ ترقی نہ کر سکیں گے۔ غرباء اور مساکین کے پاس تو جو کچھ جائے گا وہ اسے کھا جائیں گے لیکن ایک تاجر کے پاس مال رہتا ہے تو وہ اس سے اور کماتا ہے۔ اور نفع میں سے اپنے اُوپر بھی خرچ کرتا ہے اور غریبوں کو بھی دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر بھی ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جن کو دیکھ کر رحم آتا ہے تو اس کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ہم اپنے بندوں کی حالت کو خوب جانتے ہیں اسی لئے ہم نے ایسا انتظام کیا ہے۔ تم ہم سے زیادہ بندوں پر رحم نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے بندوں کی حالت تم سے زیادہ جانتے ہیں اور ان کی حالت کے مطابق ہم نے قانون بنا دیئے ہیں۔

اسی طرح ہاتھ گردن سے باندھنے کا محاورہ بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ اگر بالکل کچھ نہ دیا جائے تو بھی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ یعنی اس طرح بھی قوت عملیہ ماری جاتی ہے کیونکہ ایسے محتاج بھی ہو سکتے ہیں جو کام کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہوں ان کو ضرور دینا چاہئے۔ پھر جب تک غرباء کو اُٹھایا نہ جائے امراء بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ گویا غرباء کے نہ اُبھارنے کی وجہ سے امراء بھی گر جاتے ہیں۔ اور امراء کو مار دینے سے غرباء لاوارث ہو جاتے ہیں۔ پس امراء کا رہنا بھی ضروری ہے گو اُن پر غرباء کی مدد کرنا بھی فرض ہے۔ اب دیکھو اسلام نے کس طرح خرچ کی مقدار بھی بتا دی اور اس کی دلیل بھی دے دی۔

اسراف اور بُخل سے بچنے کی نصیحت

دوسری جگہ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا[16] اس میں بتایا کہ ہمارے بندوں کی درمیانی حالت ہوتی ہے۔ جنہیں ہم مال و دولت دیں اُن کا فرض ہے کہ وہ نہ تو اپنی ذات پر ساری کی ساری دولت خرچ کر دیں اور نہ ساری دولت لوگوں کو دے دیں بلکہ ان کی درمیانی حالت ہو وہ کچھ لوگوں پر خرچ کریں اور کچھ اپنے اُوپر۔

اس میں اسلام نے کچھ اپنے اُوپر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ بعض دفعہ اپنی ذات پر خرچ نہ کرنا خدا تعالیٰ کے نزدیک گناہ ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ آپ بادام روغن، مشک اور عنبر وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ ان کے جواب میں سید عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق بیان فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایک ایک ہزار دینار کے کپڑے پہنتے۔ گویا ۱۶ ہزار روپیہ کا ان کا صرف ایک سوٹ ہوتا تھا۔ اس کے متعلق کسی نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا میری تو یہ حالت ہے کہ میں کبھی کھانا نہیں کھاتا جب تک خدا تعالیٰ مجھے نہیں کہتا کہ اے عبدالقادر! تجھے میری ذات ہی کی قسم تو کھانا کھا اور میں کوئی کپڑا نہیں پہنتا جب تک خدا تعالیٰ مجھے یہ نہیں کہتا کہ اے عبدالقادر! تجھے میری ذات ہی کی قسم تو فلاں کپڑا پہن۔[17] حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دماغی کام کرتے تھے اور دماغی کام کرنے والے کے لئے جتنی مقویات کی ضرورت ہوتی ہے اتنی کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتی۔ ایسا انسان اگر اپنے اُوپر خرچ نہ کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ کچھ لوگوں نے روزے رکھے ہوئے تھے اور کچھ نے نہ رکھے تھے جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا وہ تو منزل پر پہنچ کر لیٹ گئے لیکن جو روزہ سے نہ تھے وہ خیمے لگانے اور دوسرے کام کرنے لگ گئے۔ یہ دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج روزہ نہ رکھنے والے روزہ رکھنے والوں سے بڑھ گئے۔[18] پس اسلام کہتا ہے جہاں کھانا مفید ہے اور اس سے خدمت دین میں مدد ملتی ہے وہاں اگر کوئی عمدہ کھانا نہ کھائے گا تو گنہگار ہوگا۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو سوتے تو مختلف محلوں کے لوگوں نے باریاں تقسیم کی ہوئی تھیں، وہ باری باری رات کو آپ کے مکان کا پہرہ دیتے۔ اس کے لئے اجازت دینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا اور صحابہؓ کا یہ فرض تھا کہ رات کو آپؐ کی حفاظت کا انتظام کرتے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملہ ہونا اسلام کو نقصان پہنچانے والا تھا اس لئے کوئی نہیں کہہ

سکتا کہ نَعُوْذُ بِاللہِ رسول کریم ﷺ اپنی بادشاہت جتلاتے تھے اور اپنے لئے پہرہ مقرر کرتے تھے۔ پہرہ آپؐ کے لئے ضروری تھا اور اس کا مقرر نہ کرنا خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ گرفت ہوتا۔

صدقہ وخیرات کی تقسیم کے متعلق ہدایات

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔[19] اس میں مندرجہ ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

اوّل۔ انسان مال و دولت بالکل ہی نہ لٹا دے بلکہ اپنے اہل و عیال کے لئے بھی رکھ لے۔ گویا ساری کی ساری خیرات نہ کرے بلکہ اس میں سے کچھ خیرات کرے۔

دوم۔ اس طرح خیرات نہ کرے کہ اس سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے۔ تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا کے معنی ہیں بکھیر دینا۔ اگر دس بھوکے آئیں اور ایک روٹی دینے کے لئے ہو تو سب کو اس کا ایک ایک ٹکڑا دینے سے کسی کے بھی کام نہ آئے گی۔ وہی روٹی اگر ایک کو دے دو اور دوسروں سے کہہ دو کہ یہی ایک روٹی تھی تو یہ بہتر ہوگا۔ یا مثلاً بہت سے آدمی بیمار پڑے ہوں اور صرف پانچ گرین کونین ہو تو سب کو تھوڑی تھوڑی دینے سے کسی کو بھی فائدہ نہ ہوگا لیکن اگر ایک کو دے دی جائے تو اس کے لئے مفید ثابت ہو سکے گی۔ تو فرمایا اوّل تو یہ حکم ہے کہ سارا مال تقسیم نہ کر دو اور دوسرے یہ کہ اس طرح تقسیم کرو کہ جسے دو، وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکے۔ جو ایسا نہ کرے اس کے متعلق فرمایا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ایسا انسان شیطان کا بھائی ہے اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اس طرح مال تقسیم کرنے سے کسی کو فائدہ نہ ہوگا اور ناشکری پیدا کرے گا۔

اخوان الشیطین کہنے میں حکمت

یہاں اللہ تعالیٰ نے شیطان نہیں کہا بلکہ شیطان کا بھائی کہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دینے والے نے تو اپنی طرف سے اچھی بات ہی سمجھی تھی کہ ایک کی بجائے بہتوں کو دے دیا لیکن حقیقتاً

اس کا یہ فعل اچھا نہ تھا۔ اس لئے اس کا یہ فعل حقیقی ناشکری تو نہیں لیکن اس کے مشابہ ضرور ہے۔ پھر تھوڑی چیز کو بہتوں میں اس طرح بانٹ دینے کو کہ کسی کے بھی کام نہ آئے اللہ تعالیٰ نے ناشکری قرار دینے کی یہ وجہ بتائی کہ ہم نے جو نعمت دی تھی وہ کسی غرض کے لئے ہی دی تھی مگر تم نے اس کو بے فائدہ طور پر بانٹ دیا اور اس طرح اس غرض کو باطل کر دیا۔ وہ غرض یہی ہے کہ مال قابلیت رکھنے والوں کے پاس آتا ہے اور قابلیت رکھنے والوں کو کام کرنے کے قابل بنائے رکھنا قوم کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک اعلیٰ درجہ کا کاریگر ہو اور وہ اپنے اوزار دوسروں میں بانٹ دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا اپنا کام بھی نہ چلے گا اور دوسروں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا لیکن اگر وہ اپنے اوزار اپنے پاس رکھ کر ان سے کام کرے اور پھر جو کچھ کمائے اس میں سے دوسروں کی مدد کرے تو یہ بہت مفید بات ہوگی۔

صدقہ دینے کا صحیح طریق

پھر اسلام نے صدقہ دینے کا طریق بتایا ہے جو یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً [۲۰] یعنی مومن وہ ہیں جو اپنے اموال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں یہ احکام بیان کئے گئے کہ اوّل پوشیدہ صدقہ دو۔ دوم علانیہ صدقہ دو۔

یہاں مال کے طریق تقسیم میں انجیل کی تعلیم کا مقابلہ ہوگیا۔ انجیل میں تو یہ کہا گیا ہے کہ:-

> ''جب تُو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تا کہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔''

لیکن قرآن کہتا ہے کہ کبھی اس طرح صدقہ دو کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو پتہ نہ لگے اور کبھی اس طرح دو کہ سب کو پتہ لگے۔ اور اس کی وجہ بتائی کہ کیوں ہم یہ کہتے ہیں کہ ظاہر طور پر بھی صدقہ دو اور پوشیدہ طور پر بھی۔ فرمایا اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَیُکَفِّرُ عَنْکُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِکُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ [۲۱] یعنی اگر تم صدقہ دکھا کر دو تو یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ فَھُوَ

خَيْرٌ لَّكُمْ اگر تم چھپا کر دو تو یہ تمہارے اپنے لئے بہتر ہے۔ گویا دوسرے طریق صدقہ میں پہلے طریق کی بھی وجہ بتادی کیونکہ جب یہ بتایا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا تو یہ بھی فرمایا کہ اگر ظاہری طور پر صدقہ دو گے تو یہ دوسروں کے لئے بہتر ہوگا کیونکہ جب لوگ کسی کو صدقہ دیتے دیکھیں گے تو کہیں گے یہ بڑا اچھا کام ہے اور پھر وہ خود بھی اس کی نقل کرنے لگ جائیں گے۔ دیکھو جو لوگ یورپ کے دلدادہ ہیں وہ سر سے پیر تک وہی لباس پہنتے ہیں جو یورپین لوگوں کا ہے۔ ایک زمانہ میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو ہندو بھی مسلمانوں کی طرح جُبّے پہنے پھرتے تھے۔ اب بھی جن علاقوں میں مسلمانوں کی کثرت ہے وہاں کے ہندوؤں کا لباس مسلمانوں جیسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ سرحد میں یا سندھ میں ہے۔ ایک دفعہ ایک سندھی تاجر ہمارا ہم سفر تھا۔ اس نے بالکل مسلمانوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا۔ میں اسے مسلمان ہی سمجھتا رہا۔ جب کھانا کھانے لگے تو ہمارے نانا جان بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے اس تاجر کو کہا کہ آئیے آپ بھی کھانا کھائیں۔ مگر اس نے نہ کھایا۔ جب وہ اُترنے لگا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے مگر دوسرے لوگ بُرا مناتے ہیں۔ تب پتہ لگا کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو تھا۔ تو دوسروں کو دیکھ کر انسان ان کی باتیں اختیار کر لیتا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ [۲۲] تم میں سے ہر ایک کی مثال گڈریا کی سی ہے۔ ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ بھیڑیں لگی ہوئی ہیں جو اس کی نقل کرتی ہیں۔ پس اگر کوئی ظاہری طور پر صدقہ دے گا تو اس کے بیٹے، بھائی یا دوسرے رشتہ دار، مُرید، ملازم، دوست اور آشنا بھی اس کی نقل میں صدقہ دیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسل کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ بچوں کو صدقہ دینے کی عادت پڑے گی۔ جب وہ اپنے بڑوں کو دیکھیں گے کہ وہ صدقہ دیتے ہیں تو سمجھیں گے کہ یہ اچھی بات ہے اور خود بھی صدقہ دینے لگ جائیں گے اس طرح آہستہ آہستہ ان کی تربیت ہوتی جائے گی۔

تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ بعض دفعہ لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ فلاں شخص امداد کا محتاج ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے اپنے محلہ یا اپنے قصبہ یا اپنے شہر کے کسی آدمی کے متعلق پتہ ہو کہ وہ محتاج ہے لیکن دوسروں کو پتہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر میں ایک دوست کو کچھ دوں کہ فلاں کو دے دینا تو بغیر یہ

اعلان کرنے کے کہ فلاں کی مدد کرو اسے خود بھی دینے کا خیال آجائے گا۔ یہ ظاہری طور پر صدقہ دینے کے فوائد ہیں۔

اسی طرح اگر مخفی طور پر خیرات دی جائے تو وہ دینے والے کے اپنے نفس کے لئے اچھی ہے۔ اس سے اس میں ریاء پیدا نہیں ہوگا جو ظاہر طور پر دینے سے پیدا ہوسکتا ہے لیکن جو شخص مخفی خیرات اس لئے دیتا ہے کہ اس کے دل میں ریاء پیدا نہ ہو وہ جب ظاہر طور پر دے گا تب بھی ریاء کا جذبہ اس میں پیدا نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے نفس کو ریاء سے بچانے کے لئے پوشیدہ طور پر دے کر مشق کرتا رہتا ہے۔ ریاء کا جذبہ اسی میں پیدا ہوسکتا ہے جو صرف ظاہرہ خیرات دیتا ہے۔

پھر لَّكُمْ کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ پوشیدہ دینے میں تمہارے لئے بھی نفع ہے اور فقراء کے لئے بھی یعنی جنہیں دیتے ہو ان کے لئے بھی کیونکہ اس طرح ان کی عزت نفس محفوظ رہتی ہے اور وہ شرمندہ نہیں ہوتے۔ غرض مخفی طور پر صدقہ دینا، دینے والے کے لئے بھی نفع بخش ہے کیونکہ اس میں ریا پیدا نہیں ہوتا اور لینے والے کے لئے بھی کہ اس کی خفت نہیں ہوتی۔

صدقہ کی مختلف اقسام

صدقہ کے متعلق تیسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام نے اس کی اقسام مقرر کی ہیں۔ صدقہ کی ایک قسم تو لازمی ہے جس کے متعلق فرمایا۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ [۲۳] تم نماز باشرائط جماعت کے ساتھ ادا کرو اور زکوٰۃ دو۔ آگے اس لازمی صدقہ کی دو قسمیں بتائیں۔ اوّل لازمی وقتی جیسے جہاد ہے۔ جب جہاد کا موقع پیش آجائے اس وقت قوم کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے اموال پیش کر دے۔ دوم لازمی مقررہ جیسے فرمایا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً [۲۴] یہ زکوٰۃ ہے لیکن ایک صدقہ وقتی غیر مقررہ ہے اس میں شریعت یہ نہیں کہتی کہ کتنا دو بلکہ یہ کہتی ہے کہ اس وقت ضرور دو۔ مقررہ میں تو حد مقرر کر دی گئی ہے کہ چالیسواں حصہ یا جانوروں میں سے اتنا حصہ دیا جائے مگر جہاد کے لئے کہا جاتا ہے کہ دو جتنا دے سکتے ہو۔ چنانچہ ایک جہاد کے موقع کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ مجھے خیال آیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ مجھ سے بڑھ جاتے ہیں۔ آج میں ان سے بڑھوں گا۔ یہ خیال کر کے میں گھر گیا اور اپنے مال میں سے آدھا مال نکال کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں پیش کرنے کے لئے لے آیا۔ وہ زمانہ اسلام کے لئے انتہائی مصیبت کا دور تھا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا سارا مال لے آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ابوبکرؓ! گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا۔ اللہ اور اس کا رسولؐ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ سن کر مجھے سخت شرمندگی ہوئی اور میں نے سمجھا کہ آج میں نے سارا زور لگا کر ابوبکرؓ سے بڑھنا چاہا تھا مگر آج بھی مجھ سے ابوبکرؓ بڑھ گئے۔ [۲۵]

ممکن ہے کوئی کہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا سارا مال لے آئے تھے تو پھر گھر والوں کے لئے انہوں نے کیا چھوڑا؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے مراد گھر کا سارا اندوختہ تھا۔ وہ تاجر تھے اور جو مال تجارت میں لگا ہوا تھا وہ نہیں لائے تھے اور نہ مکان بیچ کر آ گئے تھے۔

جہاد کے موقع پر مال دینے کا ذکر سورۃ بقرہ رکوع ۲۴ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ [۲۶] تم جنگی کاموں میں اپنا روپیہ صَرف کرو۔ اگر نہیں کرو گے تو دشمن جیت جائے گا اور تم تباہ ہو جاؤ گے۔

پھر ایک صدقہ اختیاری ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بقرہ رکوع ۲۶ میں آتا ہے۔ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ [۲۷] جب کوئی دینے کا موقع ہو اور اس وقت تم خدا کے لئے خرچ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ اپنے والدین کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے، یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کیلئے۔ یہ صدقہ اختیاری رکھا۔ ایک اور جگہ اختیاری اور لازمی صدقہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ [۲۸] معلوم کے لفظ میں بتا دیا کہ یہ مقررہ صدقہ ہے کیونکہ مَعْلُوْمٌ کے معنی ہیں مقرر کر دیا گیا یعنی رقم مقرر کر دی کہ اتنا دینا ضروری ہے یا یہ کہ خرچ کا وقت مقرر ہوتا ہے کہ اب کچھ نہ کچھ دینا تم پر فرض ہے۔ پس فرمایا فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ۔ ان کے مال میں ایک مقرر حق ہوتا ہے۔ لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ سوال کرنے والے اور محروم کا۔ گویا بتایا کہ اتنا دینا تمہارے لئے ضروری ہے اور غیر مقررہ کے لئے فرمایا۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ

لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [9] یہاں مَعْلُوْمٌ کا لفظ نہیں رکھا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں قرآن میں قافیہ بندی کی گئی ہے حالانکہ اگر صرف قافیہ بندی ہوتی تو مَحْرُوْم کے ساتھ مَعْلُوْمٌ قافیہ تھا جو سورۃ معارج میں آیا مگر سورۃ ذاریات میں مَعْلُوْمٌ کا لفظ اُڑا دیا یہاں دوسری قسم کے صدقہ کا ذکر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں قافیہ کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ مضمون کا خیال رکھا جاتا ہے۔

صدقہ ایک قسم کے قرض کی ادائیگی ہے

صدقہ کے متعلق چوتھا پہلو اسلام نے یہ پیش کیا ہے کہ صدقہ کی حقیقت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ صدقہ ایک قسم کے قرضہ کی ادائیگی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں صدقہ ملنے کی وجہ سے لوگ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ان میں سُستی اور کاہلی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۔ لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ محتاج اور مساکین کا حق ہے کہ تم انہیں اپنے مال میں سے دو۔ اگر تم کسی محتاج کو دیتے ہو تو اس پر احسان نہیں کرتے بلکہ اس کا حق ادا کرتے ہو۔ دوسری جگہ اس حق کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ [10] یعنی زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اے بنی نوع انسان اسے ہم نے بغیر تمہاری محنت اور بغیر کسی قسم کی اُجرت کے تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے۔ اب اگر زمین اور آسمانوں کی چیزیں صرف زید یا بکر کی خدمت میں لگی ہوئی ہوں تو ان کا وہ مالک ہوسکتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں غریب اور امیر سب کی خدمت کر رہی ہیں تو معلوم ہوا کہ سب چیزیں سب کے لئے پیدا کی گئی ہیں صرف زید یا بکر کے لئے نہیں پیدا کی گئیں۔ اگر سورج صرف بادشاہ کے لئے پیدا کیا جاتا تو چاہئے تھا کہ اسی کو نظر آتا اور اسی کو فائدہ پہنچاتا مگر سورج بادشاہ کو بھی اسی طرح روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے جس طرح ایک فقیر کو۔ یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے بنی نوع انسان کی مشترکہ جائیداد ہے اور سب دولت اسی کے ذریعہ کمائی جاتی ہے۔ سَخَّرَ لَكُمْ کے ماتحت ہی انسان دنیا میں مال و دولت حاصل کرتا ہے۔ پس ساری کی ساری کمائی پبلک پراپرٹی سے ہی ہو رہی ہے جو خدا تعالیٰ نے ساری دنیا کے

لئے پیدا کی ہے۔ بے شک جو محنت و مشقت کر کے اس سے کماتا ہے اس کا زیادہ حق ہے مگر پراپرٹی میں حصہ رکھنے والے کا بھی تو حق ہوتا ہے۔ جو محنت کرتا ہے اس کا زیادہ حق ہوتا ہے لیکن جس چیز میں محنت کرتا ہے وہ چونکہ مشترک ہے اس لئے اس کے لینے میں وہ بھی شریک ہے جس کی اس میں شراکت ہے۔ یہ حق صدقہ اور زکوٰۃ کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔

اب دیکھو یہ نکتہ بیان کر کے کس طرح امراء اور دولت مندوں کا تکبر توڑا گیا ہے۔ جب غرباء کا بھی امراء کے مال و دولت میں حق ہے تو اگر کوئی امیر اُن کو دیتا ہے تو ان کا حق ادا کرتا ہے نہ کہ ان پر احسان کرتا ہے۔ ادھر غرباء اور محتاجوں کو شرمندگی سے یہ کہہ کر بچا لیا کہ مالداروں کے مال میں تمہارا بھی حق ہے۔ ہم نے ان کو ساری رقم دے کر ان کا فرض مقرر کر دیا ہے کہ ہمارے محتاج بندوں کو بھی دیں، ساری کی ساری کمائی خود ہی نہ کھا جائیں۔

صدقہ کے محرکات

پانچواں پہلو صدقات کے متعلق اسلام نے یہ بیان کیا کہ صدقہ کے محرکات کیا ہونے چاہئیں؟ محرکات کے ذریعہ ایک اعلیٰ درجہ کی چیز بھی بُری ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں کوئی مہمان آئے اور ہم اس کی خاطر اس لئے کریں کہ اس سے ہمیں فلاں فائدہ حاصل ہو جائے گا تو خواہ ہم کتنی خاطر کریں اس میں اپنی ذاتی غرض پنہاں ہوگی لیکن اگر ہم مہمان کی تواضع اس لئے کریں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو یہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہوگی۔ پس بُرے محرکات کے ذریعہ ایک چیز ادنیٰ ہو جاتی ہے اور اگر اچھے محرکات ہوں تو اعلیٰ ہو جاتی ہے۔ یہود میں صدقہ کی غرض رحم بتائی گئی ہے۔ یہ ایک لحاظ سے تو اچھی ہے مگر اس میں نقص بھی ہے۔ اسلام نے محرکات کے متعلق بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ [۱۳۱] یہاں صدقہ کی دو اغراض بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ محض یہ غرض ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو دوسری یہ کہ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ بھی یہ غرض ہو کہ اپنی قوم مضبوط ہو جائے۔ پس اسلام کے نزدیک صدقہ کی دو ہی اغراض ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور دوسری یہ کہ غرباء کی مدد اپنی مدد ہوتی ہے۔ جس قوم کے افراد گرے ہوئے ہونگے وہ قوم بھی کمزور ہو

جائے گی کیونکہ گرے ہوئے افراد اس کے لئے بوجھ ہونگے اور قوم ترقی نہ کر سکے گی۔ اسی لئے یورپین قومیں بھی جنہیں خدا سے کوئی تعلق نہیں محض اس لئے صدقہ و خیرات کرتی ہیں کہ قوم کے غرباء کی ترقی سے قوم بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ پس صدقہ کی ایک غرض اسلام نے یہ بتائی کہ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اس کے ذریعہ قوم مضبوط ہو جاتی ہے۔

اسی طرح نیک لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ یعنی نیک وہ ہوتا ہے جو عَلٰى حُبِّهٖ مال دیتا رہے۔ کتنے مختصر الفاظ ہیں لیکن ان میں نہایت وسیع مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ عَلٰى حُبِّهٖ کے معنے یہ ہیں کہ اوّل اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے۔ چنانچہ پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر موجود ہے۔ گویا وہ مال دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت کی خاطر۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی محبت ہوتی ہے اس لئے وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ چونکہ ہم خدا تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اس لئے ہم بھی ان سے محبت کریں۔

۲۔ حُبِّهٖ کی ضمیر اس شخص کی طرف بھی جاتی ہے جسے مال دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جسے مال دیتے ہیں اسے ذلیل سمجھ کر نہیں دیتے بلکہ اپنا بھائی سمجھ کر دیتے ہیں۔ وہ مال دیتے تو دوسرے کو ہی ہیں لیکن اسے ذلیل سمجھ کر نہیں بلکہ اس کا حق سمجھ کر دیتے ہیں اسے اپنا بھائی اور اپنا پیارا سمجھ کر دیتے ہیں۔

۳۔ حُبِّهٖ کی ضمیر مال دینے کی طرف بھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ معنے ہوئے کہ وہ مال دینے کی محبت کی وجہ سے دیتے ہیں کیونکہ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں مال دینا انتہائی مرغوب ہوتا ہے۔ وہ چٹی سمجھ کر نہیں دیتے بلکہ اس لئے دیتے ہیں کہ انہیں مال دینے سے ایک روحانی سرور اور ذوق حاصل ہوتا ہے۔ اسی حُبِّهٖ کے متعلق دوسری جگہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى [۳۲] کہہ کر بتایا کہ ان کی محبت بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ماں باپ ہیں اور غریب اور محتاج لوگ ہمارے بچے ہیں۔ جیسے ماں اپنے بچہ کو محبت سے دودھ پلاتی ہے نہ کہ کسی طمع سے اسی طرح یہ لوگ محتاجوں کو اپنا مال دیتے ہیں۔ دودھ کیا ہوتا ہے ماں کا خون ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی جن عورتوں کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا وہ کڑھتی رہتی ہیں جس

کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں کوئی ایسا بچہ نہیں ملتا جسے وہ اپنا خون پلائیں۔ تو فرمایا وہ لوگ مال دیتے دیتے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ نہیں سمجھتے کہ مال دے کر ہم کسی پر احسان کر رہے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا احسان ہے جو ہم سے مال لیتے ہیں۔ جیسے بچہ جب روٹھ جائے تو ماں اسے مناتی اور کہتی ہے "میں صدقے جاواں۔ میں واری جاواں" حالانکہ وہ بچہ کو کھانے کے لئے دیتی ہے نہ کہ اس سے کچھ لیتی ہے۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے تمہارا وہ درجہ ہونا چاہئے کہ تم دے کر یہ سمجھو کہ لینے والوں نے ہم پر احسان کیا ہے نہ کہ تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہے۔

صدقات کی غرض وغایت

چھٹے اسلام نے صدقہ دینے کی غرض بیان کی ہے۔ ایک غرض تو اسی آیت میں آئی ہے جو میں نے ابھی پڑھی ہے یعنی اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ جو شخص مال دے اس کی محبت کی وجہ سے دے، دشمنی سے نہ دے، کسی کی عادات بگاڑنے کے لئے نہ دے بلکہ اس لئے دے کہ اچھے کاموں میں لگے۔ جسے دیا جائے اسے فائدہ ہو۔ ایسی حالت نہ ہو جائے کہ مال لینے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچے۔

صدقات سے معذوری کے اصول

ساتویں اسلام نے صدقہ نہ دینے کے مواقع بھی بیان کئے ہے۔ یعنی بتایا ہے کہ فلاں مواقع پر صدقہ نہ دو یا تم صدقہ نہ دینے میں معذور ہو۔ جیسے فرمایا۔ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا [۳۳] اس آیت میں تین مواقع بتائے کہ ان میں صدقہ نہ دینے میں حرج نہیں۔ اوّل جب کہ تمہارے پاس کچھ نہ ہو۔ اِبْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ جب تم خود تکلیف میں ہونے کی وجہ سے اپنے رب کی رحمت کے محتاج ہو۔ دوم۔ جب تمہارا دل تو چاہتا ہو کہ صدقہ دو اور دینے کے لئے مال بھی تمہارے پاس موجود ہو لیکن عقل کہتی ہو کہ اگر مال دوں گا تو خدا کا غضب نازل ہو گا اور اگر نہ دوں گا تو خدا کی رحمت کا نزول ہو گا۔ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا۔ بخل سے نہیں بلکہ یہ خیال ہو کہ نہ دوں گا تو خدا کا فضل

نازل ہوگا ایسی صورت میں صدقہ نہ دینا اچھا ہے۔ مثلاً کوئی شخص عیاشی میں روپیہ برباد کر دیتا ہوتو اسے نہ دینا ہی رضائے الٰہی کا موجب ہوگا یا ایک شخص آئے اور آکر کہے کہ مجھے اسلام کے خلاف ایک کتاب لکھنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اس میں چندہ دیجئے تو اس سے اعراض کرنے والا یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل کی جستجو میں انکار کرے گا۔ اب ایک اور مثال دیتا ہوں اس بات کی کہ انسان کا دل تو چاہتا ہے کہ دے مگر اِبْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ نہیں دیتا۔ ایک بچہ ہے جو ہماری تربیت کے نیچے ہے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے۔ وہ خواہش ہم پوری بھی کر سکتے ہیں وہ بری بھی نہیں ہوتی مگر ہم سمجھتے ہیں اس کی تربیت کے لحاظ سے یہ برا اثر ڈالے گی اس لئے اسے پورا نہیں کرتے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے مانگے مثلاً کسی کو مارنے کیلئے ریوالور خریدنا چاہے تب بھی نہیں دیں گے۔

صدقات سے انکار کرنے کا طریق

آٹھویں۔ اسلام نے یہ بتایا ہے کہ صدقہ نہ دینے اور انکار کرنے کا کیا طریق ہونا چاہئے۔ یعنی بتایا کہ انکار کرو تو کس طرح کرو۔ فرمایا۔ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ [۳۵] جب انکار کرو تو سائل کو ڈانٹ کر نہ کرو۔ تم انکار کر سکتے ہو مگر سائل پر سختی نہیں ہونی چاہئے۔

پھر فرمایا۔ فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ایسی بات کرو جس سے مانگنے والے کو ذلّت محسوس نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں سائل کو نرمی سے جواب دینا چاہئے۔ یہ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ میں آچکا ہے قَوْلًا مَّيْسُوْرًا کے یہ معنے ہیں کہ اس طرح جواب نہ دو کہ اُسے ذلّت اور شرمندگی محسوس ہو۔

صدقات میں کیا چیز دی جائے

نویں۔ اسلام نے یہ بتایا کہ کیا چیز صدقہ میں دی جائے۔ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کسی غریب کو اچھا کپڑا دینے کا کیا فائدہ۔ اس کی بجائے اگر دس غریبوں کو کھدر کے کپڑے بنوا دیئے جائیں تو زیادہ اچھا ہوگا یا مثلاً ایک شخص کو پلاؤ کھانے کی بجائے دس کو آٹا دے دیا جائے تو یہ بہتر ہے لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اسلام فطرت کی گہرائیوں کو دیکھتا ہے۔ اسلام جانتا

ہے کہ غرباء روزانہ امراء کو اچھا کھاتے اور اچھے کپڑے پہنتے دیکھتے ہیں اور خود بھی چاہتے ہیں کہ ویسے ہی کپڑے پہنیں اور ویسے ہی کھانے کھائیں۔ اس لئے ایسی بھی صورت ہونی چاہئے کہ ان کو اس امر کے مواقع حاصل ہوسکیں۔ اسلام لوگوں کو خشک فلسفی نہیں بناتا بلکہ لوگوں کے دلوں کے خیالات پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک قصہ مشہور ہے جسے ہم بھی بچپن میں بہت خوشی سے سنا کرتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ کوئی لکڑہارا تھا جو بادشاہ کے باورچی خانہ کے لئے لکڑیاں لایا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ لکڑیاں لے کر آیا تو کھانے کو بگھار لگایا جارہا تھا۔ اس کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ برداشت نہ کرسکا اور باورچی سے کہنے لگا کہ کیا اس کھانے میں سے مجھے کچھ دے سکتے ہو۔ اس نے کہا یہ بڑا قیمتی کھانا ہے۔ تمہیں کس طرح دیا جاسکتا ہے۔ کہتے تھے اشرفیوں کا بگھار لگاتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کس طرح لگاتے تھے۔ لکڑہارے نے پوچھا۔ یہ کتنا قیمتی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ تمہارے چھ ماہ کی لکڑیوں کی قیمت کے مساوی ہے۔ اس پر وہ لکڑیاں ڈالنے لگا۔ پہلے روزانہ ایک بوجھ لایا کرتا تھا۔ پھر دو لانے لگا۔ ایک بوجھ کھانے کی قیمت میں دیتا اور ایک بوجھ کی قیمت سے گزارہ چلاتا۔ آخر چھ ماہ کے بعد اسے وہ کھانا دیا گیا۔ جب وہ اسے لے کر گھر گیا۔ تو کسی فقیر نے اس کے دروازہ پر جا کر کھانا مانگا۔ لکڑہارے کی بیوی نے کہا۔ یہی کھانا اسے دیدو کیونکہ ہم تو چھ ماہ لکڑیاں ڈال کر یہ پھر بھی لے سکتے ہیں لیکن یہ اس طرح بھی نہیں لے سکتا۔ لکڑہارے نے وہ کھانا فقیر کو دے دیا۔

اسی طرح ہمایوں کو جس سقہ نے دریا میں ڈوبتے ہوئے بچایا تھا۔ اسے جب کہا گیا کہ جو کچھ چاہو مانگو تو اس نے چار پہر کے لئے بادشاہت مانگی۔ یہ تھی ایک سقہ کے دل کی خواہش تو خدا تعالیٰ دلوں کو پڑھتا ہے۔ فلسفی کو ان باتوں کی کیا خبر ہوسکتی ہے پس دلوں کے احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے یہ حکم دیا کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۵ ؎ کہ جو کچھ خدا نے دیا ہو اس میں سے خرچ کرو۔ روپیہ ہی صدقہ میں نہیں دینا چاہئے بھی اچھا کپڑا بھی دو، اچھا کھانا بھی دو بلکہ جو کچھ تمہیں دیا جائے اس میں سے بانٹتے رہو۔

اس سے بھی واضح الفاظ میں دوسری جگہ فرمایا۔ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۶ ؎ اے باغوں والے مسلمانو! جب تمہارے باغ پھل لاتے ہیں تو تم

اپنے عزیزوں سمیت بیٹھ کر ان کے پھل کھاتے ہو۔ کبھی تمہیں یہ بھی خیال آیا کہ باغ کی دیوار کے ساتھ گذرنے والے غریب کا بھی پتہ لیں کہ اس کے دل میں کیا گذرتا ہے۔ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ جب پھل پکیں تو خوب کھاؤ مگر ایک بات ضرور مدنظر رکھو اور وہ یہ کہ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ جب پھل پک جائیں تو غریبوں کو بھی دو تا کہ وہ بھی دنیا کی نعمتوں سے حصہ پائیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ پھل بیچ کر کچھ روپے غریبوں کو دے دو کہ ان سے دال روٹی کھالیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ وَلَا تُسْرِفُوْا ہاں اسراف نہ کرو یہ نہ ہو کہ روز غریبوں کو سنگترے وغیرہ تو کھلاتے رہو مگر ان کے کپڑوں اور کھانے پینے کا خیال نہ رکھو ہر ایک امر کی ایک حد ہونی چاہئے۔

پھر بتایا کہ جو کچھ دو، حلال مال سے دو۔ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ اے ایمان دارو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے دل میں غریبوں کی مدد کے لئے جوش اُٹھتا ہے تو ڈاکے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اخلاقی علوم سے واقف نہیں ہوتے، وہ کہتے ہیں فلاں ڈاکو بڑا اچھا آدمی ہے کیونکہ وہ غریبوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ غریبوں پر رحم کرنے کا طریق نہیں بلکہ اصل طریق یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ غریبوں کی ہمدردی کے یہ معنے نہیں کہ ڈاکے ڈال کر اور دوسروں کا مال چھین کر ان کو دے دو بلکہ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اس قدر مال جس قدر قرآن کریم نے جائز رکھا ہے دیدو اور باقی کام خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ کسی کی خاطر ناجائز فعل کرنا درست نہیں۔ لوگوں کا مال لوٹ کر غرباء کو دینا تو ''حلوائی کی دُکان اور دادا جی کی فاتحہ'' کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ ہمارے پاس تھوڑا مال ہے مگر غریب بہت ہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تم جتنا دے سکتے ہو دے دو باقی خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔

ایک تاریخی لطیفہ ہے۔ لکھا ہے کہ صلیبی جنگوں کے موقع پر ایک شخص جو فوج میں ملازم تھا بادشاہ کے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا۔ میری غیرت یہ برداشت نہیں کرتی کہ میں بیت المال سے تنخواہ لوں۔ میں آئندہ تنخواہ نہیں لونگا۔ اسے کہا گیا کہ پھر تم کس طرح گذارہ کرو گے۔ اس نے کہا میری ایک لونڈی ہے جو جادو ٹونے کرنا جانتی ہے۔ میں اس کی کمائی سے گذارہ کرلوں گا۔ گویا اس نے

اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے حرام مال کوتو جائز قرار دے لیا اور جائز کو اپنے لئے حرام سمجھ لیا۔

غرباء اور امراء دونوں کو صدقہ دینا چاہئے

دسویں بات اسلام نے یہ بتائی ہے کہ صدقہ دے کون کیا امراء کو ہی صدقہ دینا چاہئے غرباء کو نہیں دینا چاہئے؟ اسلام کہتا ہے کہ صدقہ غرباء کو بھی دینا چاہئے کیونکہ صدقہ دینے کی صرف یہی غرض نہیں کہ حاجت مند کی امداد ہو بلکہ یہ ایک درس گاہ ہے جس میں اخلاقی تربیت کی جاتی ہے اگر غریبوں کو صدقہ دینے سے محروم رکھا جائے تو وہ اس درس گاہ میں تعلیم پانے سے محروم رہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ [38] مومن وہ ہیں جو اس وقت بھی خرچ کرتے ہیں جب ان کے پاس مال ہوتا ہے اور اس وقت بھی خرچ کرتے ہیں جب آپ تنگی میں مبتلا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے غریب امیر سب کے لئے صدقہ مقرر کیا ہے تا کہ انہیں صدقہ دینے کے فوائد حاصل ہو جائیں۔ صدقہ دینے کے کئی فوائد ہیں جن میں سے دو تین میں بیان کر دیتا ہوں۔

اوّل ایسا انسان محسوس کرتا ہے کہ مجھ سے بھی زیادہ غریب اور محتاج لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ ایک ایسا شخص جسے خود ایک وقت کا فاقہ ہو اُسے اگر کوئی چیز ملے اور وہ کہے میں کسے صدقہ دوں؟ تو خدا تعالیٰ اسے کہتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہیں کئی کئی وقت کا فاقہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے تم ایسے شخص کو صدقہ دے سکتے ہو جو کئی وقت کا بھوکا ہو۔

دوم اسلام نہیں چاہتا کہ کسی ثواب سے کوئی بھی محروم رہے۔ اس لئے صدقہ اس نے صرف امراء پر ہی نہیں بلکہ غرباء پر بھی رکھا ہے تا کہ وہ بھی اس ثواب سے محروم نہ رہیں اور پھر وہ شخص تو ثواب کا اور زیادہ مستحق ہوتا ہے جو تنگی کی حالت میں دوسرے کی مدد کرتا ہے۔

سوم خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ غریب کے دل پر زنگ لگے۔ جو خود لیتا رہے لیکن دے نہیں اس کے دل پر زنگ لگ جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے کہا کہ وہ بھی دے تا کہ وہ یہ سمجھے کہ میں ہی دوسروں سے امداد حاصل نہیں کر رہا بلکہ میں بھی دوسروں کی مدد کرتا ہوں۔ اس کے لئے اسلام نے ایک خاص موقع بھی رکھ دیا ہے۔ یعنی رمضان کے بعد صدقۃ الفطر رکھا ہے جس سے کسی کو مستثنیٰ نہیں

کیا گیا۔ حتّٰی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غریب اسی سے دے دے جو امیر اس کے گھر بھیجے لیکن صدقہ ضرور دے۔

صدقہ کے مستحقین

گیارہویں بات اسلام نے یہ بتائی ہے کہ صدقہ کسے دیا جائے۔ میں نے بتایا ہے وید میں کہا گیا ہے کہ برہمن کو صدقہ دیا جائے کسی اور کو نہ دیا جائے۔ بعض مذاہب میں قومی اور خاندانی لحاظ سے صدقہ دینے کا حکم ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔ بعض مذاہب نے صدقہ غیر کے لئے رکھا ہے اپنے لوگوں کے لئے نہیں۔ مسلمانوں میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو صدقہ نہیں دینا چاہئے حالانکہ اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے بلکہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ یعنی جو مال تم خدا کی راہ میں تقسیم کرو اگر تمہارے ماں باپ محتاج ہوں اور تمہارے ہدایا سے بھی ان کی تنگی دُور نہ ہو سکے تو انہیں صدقہ میں سے بھی دے سکتے ہو۔ پھر اقربین کو دو۔ یتامیٰ کو دو، مساکین کو دو، مسافروں کو دو۔ پھر فرماتا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ [۹۳] یعنی صدقات غریبوں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور جو ان صدقات کو جمع کرنے والے ہوں ان کے لئے ہیں۔ اسی طرح جو اسلام نہیں لائے ان کے لئے یعنی ان کے کھانے پینے کے لئے، ان کی رہائش کے لئے، ان کی تعلیم و تربیت کے لئے، پھر قیدیوں کے چھڑانے کے لئے، قرض داروں کے لئے، جو جہاد کے لئے جائیں ان کے لئے اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اسی طرح فرمایا۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ [۹۴] یعنی اللہ تمہیں روکتا نہیں کہ تم صدقہ دو ان کو جو تم سے لڑتے نہیں۔ جنہوں نے

تمہیں تمہارے گھروں اور وطنوں سے نہیں نکالا۔تم ان سے نیکی اور انصاف کرو۔اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے۔فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ مسلمانوں کے مالوں میں حق ہے سوالی کا بھی یعنی جو بول سکتا ہے اور محروم کا بھی یعنی حیوانوں کا جو بول نہیں سکتے۔

پھر فرماتا ہے۔وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡكُمۡ وَالسَّعَةِ اَنۡ یُّؤۡتُوۡۤا اُولِی الۡقُرۡبٰی وَالۡمَسٰكِیۡنَ وَالۡمُهٰجِرِیۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ [۱۴۲] یعنی اے مومنو! کوئی تم میں سے یہ قسم نہ کھائے کہ میں قریبیوں کو اور مساکین کو اور مہاجرین فی سبیل اللہ کو صدقہ نہ دوں گا چاہئے کہ تم درگذر سے کام لو۔کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تمہارے متعلق درگذر سے کام لے۔پس کسی سے ناراض ہو کر اسے صدقہ سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اوّل اسلام نے صدقہ مستحقین کو دینے کا ارشاد فرمایا ہے۔کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں کیا۔نہ اس میں کوئی زائد ثواب رکھا ہے۔

دوم اپنے بیگانے میں فرق نہیں کیا۔اپنوں کے لئے بھی جائز رکھا ہے اور دوسروں کے لئے بھی۔اس طرح ایسے لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے جو (الف) اپنوں کی خود بھی مدد نہیں کرتے اور صدقہ بھی نہیں دیتے کہ اپنوں کو کس طرح دیں۔(ب) جو غریب اپنوں کو مدد اور صدقہ ایک ہی وقت میں نہیں دے سکتے انہیں نیکی سے محروم نہیں کیا گیا بلکہ اپنوں کی مدد کو ہی صدقہ شمار کر لیا ہے۔

سوم صدقہ صرف غرباء کے لئے ہی نہیں رکھا گیا بلکہ ان سے جو مشابہ لوگ ہوں ان کے لئے بھی رکھا ہے (الف) مثلاً ایک لکھ پتی ہو مگر رستہ میں اس کا مال ضائع ہو گیا ہو تو اسے بھی صدقہ دے سکتے ہیں۔اسے قرض اس لئے نہیں دے سکتے کہ کیا پتہ ہے کہ وہ کوئی لٹیرا ہو اور دغا باز ہے یا ٹھگ ہے لیکن صدقہ دے سکتے ہیں کیونکہ اگر ٹھگ اور دغا باز ہوگا تو اس کا وبال اس پر پڑے گا۔(ب) مساکین۔مسکین سے مراد غریب نہیں کیونکہ اگر اس کی یہی معنے ہوتے تو پھر لِلۡفُقَرَآءِ کیوں فرمایا۔ دراصل مسکین سے مراد ایسا شخص ہے جو سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنا کام نہ کر سکے۔مثلاً ایک شخص ایک فن جانتا ہے مگر وہ فن ایسا ہے کہ دس ہزار روپے سے کام چل سکتا ہے۔ایسا شخص فقیر تو نہیں کہلا

سکتا۔ وہ بہر حال کھاتا پیتا ہوگا مگر اپنی لیاقت اور قابلیت سے کام نہ لینے کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر اُسے دس ہزار روپیہ دے دیا جائے تو کام چلا سکتا ہے۔ ایسے شخص کو صدقہ کی مد سے حکومت روپیہ دے سکتی ہے خواہ بطور قرض ہو خواہ بطور امداد۔ (ج) ایک ایسا شخص ہو جو ہو تو مالدار مگر مقروض ہو۔ مثلاً اس کی پچاس ہزار کی تجارت ہو اور دس ہزار اس پر قرض ہو اور قرض والے اپنا روپیہ مانگتے ہوں۔ تو اگر وہ سرمایہ میں سے ان کا قرض ادا کر دے تو اس کی پچاس ہزار کی تجارت تباہ ہو جاتی ہے ایسے شخص کی بھی صدقہ سے مدد کی جا سکتی ہے۔ یا مثلاً زمیندار ہے اور وہ مقروض ہے۔ اگر قرض ادا کرے تو اس کی زمین بک جاتی ہے اور اس کے گذارہ کی کوئی صورت نہیں رہتی اسے بھی صدقہ میں سے مدد دی جا سکتی ہے۔

چہارم۔ صدقہ میں صدقہ کے عاملوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے کیونکہ جب اسلام نے یہ حکم دیا کہ فلاں فلاں کو صدقہ دینا ضروری ہے تو یہ سوال ہو سکتا تھا کہ پھر صدقہ جمع کون کرے پس ضروری تھا کہ اس کے لئے کارکن ہوں اور ان کی تنخواہیں مقرر کی جائیں بے شک اسے صدقہ نہیں قرار دیا جائے گا مگر صدقہ میں سے ہی ان کی تنخواہیں ادا کی جا سکیں گی۔ یہ ایک سوال ہے، جس کی طرف اور کسی مذہب نے توجہ نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ صدقہ میں عاملوں کا بھی حق ہے۔

پنجم۔ یہ بتایا کہ سائل کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سائلوں کو نہیں دینا چاہئے کیونکہ اس طرح ان کی عادت خراب ہو جاتی ہے لیکن اسلام کہتا ہے کہ انہیں دینا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ صرف ظاہر کو دیکھ کر یہ پتہ نہیں لگتا کہ فلاں محتاج ہے یا نہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے یہ رکھا کہ کوئی شخص سوال کرے اور اس کو پورا کرنے کی مقدرت ہو تو اُسے دے دینا چاہئے۔

ششم۔ اپنوں پرائیوں سب کو صدقہ دیا جائے سوائے ان کے جو اس وقت جنگ میں مشغول ہوں تا کہ وہ نقصان نہ پہنچائیں۔

ہفتم۔ انسانوں کے سوا جانوروں کو بھی جو محروم ہیں جن کی کوئی مالیت نہیں سمجھی جاتی۔ صدقہ سے محروم نہ رکھا جائے کہ خدا تعالیٰ نے ان کا حصہ انسان کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ گویا بوڑھے اور ناکارہ جانوروں کو چارہ اور دانہ ڈالنا بھی صدقات میں شامل ہے اور ثواب کا موجب ہوگا۔ گئو شالہ کو مدد دینا بھی صدقہ ہے مگر اونٹ شالے اور بھینس شالے بھی ہونے چاہئیں۔

صدقات کی تقسیم کے اصول

بارھویں بات اسلام نے یہ بیان کی کہ حکومت جو صدقات وصول کرے انہیں کن اصول پر تقسیم کرے۔ اس کے لئے اسلام نے قواعد مقرر کئے ہیں۔ فرمایا تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا [۴۲] یعنی دو اصل تمہارے مدِّنظر ہونے چاہئیں۔

اوّل۔ تُطَهِّرُهُمْ۔ قوم کی کمزوری دور کرنے کے لئے اور مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرنے کے لئے۔

دوم۔ يُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ قوم کو بلند کرنے کے لئے۔ زَکٰی کے معنے اُٹھانے اور ترقی دینے کے بھی ہوتے ہیں۔

صدقہ دینے اور لینے والوں کے تعلقات پر بحث

تیرھویں بات یہ بیان کی کہ صدقہ دینے والے اور جنہیں دیا گیا ہو ان کے تعلقات کیا ہوں؟

(۱) شریعت نے ایسے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ حصہ جو حکومت کے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے ہاتھ سے گیا ہے۔ یا میرا روپیہ فلاں کو دیا گیا ہے کیونکہ وہ سب کا جمع شدہ مال ہوتا ہے جس میں سے حکومت خود مستحق کو دیتی ہے اس طرح دینے والے کا واسطہ ہی اُڑا دیا گیا ہے اور احسان جتانے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہنے دی۔

(۲) حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ کہہ کر احسان جتانے کی روح کو بھی کُچل دیا اور بتایا کہ جن کو صدقہ دیا جاتا ہے ان کا بھی دینے والے کے مال میں حق ہے۔

(۳) لیکن چونکہ ہر ایک اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے ظاہری احکام بھی دے دیئے۔ چنانچہ فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى [۴۳] اے مومنو! صدقات کو احسان جتا کر یا دوسروں سے خدمت لے کر ضائع نہ کرو۔

(۴) پھر ایک اور پہلو اختیار کیا جس سے احسان کا کچھ بھی باقی نہ رکھا۔ فرمایا۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ [۴۴] اللہ تعالیٰ سود کو مٹائے گا اور صدقات دینے والوں کے مال کو

بڑھائے گا۔ اس میں بتایا کہ صدقہ دینے والوں کو ہم خود بدلہ دیں گے۔

صدقات پر زور لیکن سوال کی ممانعت

چودھویں بات یہ بیان کی کہ جہاں صدقات دینے پر اسلام نے زور دیا وہاں چونکہ یہ خیال ہو سکتا تھا کہ مانگنا اچھی بات ہے اس لئے اس کی بھی تشریح کر دی۔ چنانچہ مومن کی شان بتائی کہ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا [45] یعنی جو شخص اس تعلیم سے واقف نہیں کہ اسلام سوال کو پسند نہیں کرتا وہ ایسے لوگوں کو سوال سے بچنے کی وجہ سے غنی خیال کرتا ہے لیکن جو اس سے واقف ہے، وہ لوگوں کی شکلوں سے تاڑ لیتا ہے اور ان کی مدد کر دیتا ہے۔

اس میں بتایا کہ کامل مومن کو سوال نہیں کرنا چاہئے مگر منع بھی نہیں کیا۔ یعنی مانگنا قطعی حرام نہیں کیونکہ بعض دفعہ انسان اس کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا مجھے کچھ دیں۔ آپؐ نے دیا۔ اس نے پھر مانگا۔ آپؐ نے پھر دیا۔ اس نے پھر مانگا آپؐ نے پھر دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟ اور وہ یہ کہ مانگنا اچھا نہیں ہوتا۔ اس نے اقرار کیا کہ آج کے بعد میں کسی سے نہیں مانگوں گا۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں ایک جنگ کے دوران اس کا کوڑا گر گیا۔ دوسرا شخص اُٹھا کر دینے لگا تو اس نے کہا تم نہ دو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کیا ہوا ہے کہ میں کسی سے کچھ نہیں لوں گا۔ اس پر وہ خود اُترا اور کوڑا اُٹھایا۔ تو جہاں اسلام نے صدقات پر اتنا زور دیا ہے کہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیوں نہ لیں وہاں یہ بھی بتا دیا کہ مانگنا نہیں چاہئے۔ یہ بات دینے والے پر رکھو کہ وہ تلاش کر کے دے۔

یہ صدقات کے متعلق اسلام کی بیان کردہ وہ چودہ باتیں ہیں کہ خواہ باقی مذاہب کی ساری الہامی کتابیں اکٹھی کر لو، تمام فلسفیوں کی کتابیں بھی دیکھ لو ان کی بحث ان میں نہ ہوگی اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کی معمولی سی بات بھی اس رنگ میں نہ انسانی کتابوں میں پائی جائے گی اور نہ الہامی کتابوں میں جس رنگ میں قرآن نے بیان کی ہے۔

عورت اور مرد کے تعلقات پر بحث

اب میں مثال کے طور پر ایک اور بات کو لے لیتا ہوں اور وہ عورت اور مرد کا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا فطری تعلق ہے جو جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے اور کسی گہرے تدبر سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک شیر دوسرے تمام جانداروں کو پھاڑے گا لیکن وہ بھی شیرنی کے ساتھ رہنے کی ضرورت محسوس کرے گا۔ گدھا بے وقوف جانور سمجھا جاتا ہے لیکن وہ بھی گدھی سے تعلق ضروری سمجھتا ہے۔ غرض یہ تعلق ایسا ہے کہ دنیا کے ہر جاندار کا ذہن ادھر جاتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ پس اس کی تعلیم بہت مکمل ہونی چاہئے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے یہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اب تک محسوس کی جارہی ہے مگر ساری مذہبی کتابیں اس کی تکمیل سے محروم ہیں صرف قرآن کریم نے ہی اسے مکمل کیا ہے۔ حالانکہ بظاہر اس تعلق کے متعلق کسی کتاب کا نئی بات بتانا ناممکن سا نظر آتا ہے۔

عورت مرد کے تعلقات کا مضمون ایک وسیع مضمون ہے۔ میں اس وقت کثرتِ ازدواج، حقوقِ نسواں، ایک دوسرے کے معاملہ میں مرد وعورت کی ذمہ داریاں، مہر اور طلاق وغیرہ کے مسائل نہیں لوں گا کہ یہ مسائل زیادہ لمبے اور باریک ہیں۔ میں صرف اس چھوٹی سے چھوٹی بات کو لوں گا جس کی وجہ سے مرد وعورت آپس میں ایک جگہ رہنے لگ جاتے ہیں اور بتاؤں گا کہ اس تعلق کو بھی اسلام نے کس قدر مکمل طور پر بیان کیا ہے اور اسے کتنا لطیف اور خوبصورت مضمون بنادیا ہے۔

دوسرے مذاہب کی مقدس کتب کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ابتدائی مسئلہ کے متعلق بھی خاموش ہیں۔ مثلاً انجیل کو لیں تو اس میں عورت اور مرد کے تعلق کے متعلق لکھا ہے:

> ''شاگردوں نے اس سے کہا کہ اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں۔ اس نے ان سے کہا کہ سب اس بات کو قبول نہیں کر سکتے مگر وہی جنہیں یہ قدرت دی گئی ہے کیونکہ بعض خوجے ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوجے ایسے ہیں جنہیں آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ایسے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہت کے لئے اپنے آپ کو خوجہ بنایا۔ جو قبول کر سکتا ہے

وہ قبول کرے۔''۴۶

گویا حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں کو بتایا کہ مرد عورت کا تعلق ادنیٰ درجہ کے لوگوں کا کام ہے اگر کوئی اعلیٰ درجہ کا انسان بننا چاہے اور آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا چاہے تو اسے چاہئے کہ خوجہ بن جائے۔ مطلب یہ کہ اصل نیکی شادی نہ کرنے میں ہے۔ ہاں جو برداشت نہ کرسکے وہ شادی کرلے۔ اسی طرح ا۔کرنتھیوں۔ ا باب ۷ میں لکھا ہے:۔

''مرد کے لئے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے لیکن حرام کاریوں کے اندیشے سے ہر مرد اپنی بیوی اور ہر عورت اپنا شوہر رکھے۔''۴۷

''میں بے بیاہوں اور بیوہ عورتوں کے حق میں یہ کہتا ہوں کہ ان کے لئے ایسا ہی رہنا اچھا ہے جیسے میں ہوں لیکن اگر ضبط نہ کرسکیں تو بیاہ کرلیں۔''۴۸

گویا عورت مرد اگر بن بیاہے رہیں تو پسندیدہ بات ہے۔

یہود میں یوں تو نہیں لکھا لیکن مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق کوئی صاف حکم بھی نہیں۔ تورات میں صرف یہ لکھا ہے کہ:۔

''خداوند نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔''۴۹

ان الفاظ میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ عورت چونکہ مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس سے مل کر ایک بدن ہو جائے گا اور مرد کو طبعاً عورت کی طرف رغبت رہے گی۔ یہ کہ ان کا مل کر رہنا اچھا ہوگا یا نہیں اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا صرف فطری تعلق کو لیا گیا ہے۔

ہندو مذہب نے شادی کی ضرورت پر کچھ نہیں لکھا۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شادی ان کے دیوتا بھی کرتے تھے پھر بندے کیوں نہ کریں گے۔ مگر ساتھ ہی بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ نجات

کا اصل ذریعہ یہ ہے کہ انسان سب دنیا سے الگ ہو کر عبادت کرے۔ منو جی نے جن کی تعلیم ہندو مانتے ہیں یہ بھی بتایا ہے کہ پچیس سال تک کنوارا رہنا چاہئے پھر پچیس سال تک شادی شدہ رہے لیکن وید اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں جو ہندوؤں کی اصل مقدس کتاب ہے۔ شادی کی ضرورت، اس کی حقیقت اور اس کے نظام وغیرہ کے متعلق منو وغیرہ بھی خاموش ہیں۔ بدھ مذہب نے شادی نہ کرنے کو افضل قرار دیا ہے کیونکہ پاکیزہ اور اعلیٰ خادمانِ مذہب کے لئے شادی کو منع کیا ہے خواہ عورت ہو خواہ مرد۔ یہی جَین مذہب کی تعلیم ہے۔

اب اسلام کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق کو اس نے کس طرح نہایت اعلیٰ مسئلہ بنا دیا ہے اور اسے دین کا جزو اور روحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

اسلام شادی کو ضروری قرار دیتا ہے

اس بارہ میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرد اور عورت کا تعلق ہونا چاہئے اور کیا انہیں اکٹھے زندگی بسر کرنی چاہئے؟ قرآن کریم اس کے متعلق کہتا ہے کہ شادی ضروری ہے۔ نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ جو بیوہ ہوں ان کی بھی شادی کر دینی چاہئے اور شادی کرنے کی دلیل یہ دیتا ہے کہ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا [5] یعنی اے انسانو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی قسم کا جوڑا بنایا۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انسانیت ایک جوہر ہے۔ یہ کہنا کہ انسانیت مرد ہے یا یہ کہنا کہ انسانیت عورت ہے غلط ہے۔ انسانیت ایک علیحدہ چیز ہے۔ وہ نفسِ واحدہ ہے اس کے دو ٹکڑے کئے گئے ہیں۔ آدھے کا نام مرد اور آدھے کا نام عورت۔ جب یہ دونوں ایک ہی چیز کے دو ٹکڑے ہیں تو جب تک یہ دونوں نہ ملیں گے اس وقت تک وہ چیز مکمل نہیں ہوگی۔ وہ تبھی کامل ہوگی جب اس کے دونوں ٹکڑے جوڑ دیئے جائیں گے۔

یہ اسلام نے عورت اور مرد کے تعلق کا اصل الاصول بتایا ہے کہ مرد اور عورت علیحدہ علیحدہ انسانیت کے جوہر کے دو ٹکڑے ہیں۔ اگر انسانیت کو مکمل کرنا چاہتے ہو تو ان دونوں ٹکڑوں کو ملانا

پڑے گا ورنہ انسانیت مکمل نہ ہوگی اور جب انسانیت مکمل نہ ہوگی تو انسان کمال حاصل نہ کر سکے گا۔

حوّا کی پیدائش آدم علیہ السلام کی پسلی سے نہیں ہوئی

اس آیت پر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ معلوم ہوا حوّا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی جیسا کہ بائیبل میں ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اوّل تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ [۵۱] یعنی ہم نے ہر چیز کو جوڑا بنایا ہے۔ تو کیا انسان کا جوڑا بنانا نَعُوْذُ بِاللهِ اُسے یاد نہ رہا تھا کہ آدم کی پسلی سے حوّا کو نکالا گیا؟ قرآن تو کہتا ہے کہ خواہ خیالات ہوں، عقلیات ہوں، احساسات ہوں، ارادے ہوں ان کے بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ارادہ، کوئی احساس، کوئی جذبہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک دو مقابل کے ارادے اور دو مقابل کے احساسات اور دو مقابل کے جذبات نہ ملیں۔ اسی طرح کوئی جسم مکمل نہیں ہو سکتا جب تک دو جسم نہ ملیں۔ کوئی حیوان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک دو حیوان نہ ملیں۔ کوئی انسان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک دو انسان نہ ملیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ہر چیز کے جوڑے بنائے گئے ہیں تو کون تسلیم کرے گا کہ پہلے آدم کو بنایا گیا اور پھر اسے اداس دیکھ کر اس کی پسلی سے حوّا کو بنایا۔ قرآن تو کہتا ہے کہ ہر چیز کے جوڑے ہیں۔ اس لئے جب خدا نے پہلا ذرہ بنایا تو اس کا بھی جوڑا بنایا۔ پھر خود انسان کے متعلق آتا ہے وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا [۵۲] ہم نے تم سب لوگوں کو جوڑا جوڑا بنایا ہے۔ پھر آدم کس طرح اکیلا پیدا ہوا۔ اس کا جوڑا کہاں تھا؟ دوسرے یہی الفاظ کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا تمہیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا گیا اور اس میں سے تمہارا جوڑا بنایا، سارے انسانوں کے متعلق بھی آئے ہیں لیکن ان کے یہ معنے نہیں کئے جاتے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَاللهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ [۵۳] کہ اے بنی نوع انسان! اللہ نے تمہارے نفسوں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں۔ اب کیا ہر ایک بیوی اپنے خاوند کی پسلی سے پیدا ہوتی ہے؟ اگر نہیں تو پہلی آیت کے بھی یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ انسان کا جوڑا اس میں سے پیدا کیا گیا۔ اسی طرح سورۃ شوریٰ رکوع ۲ میں آتا ہے جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا [۵۴] تمہارے نفسوں سے تمہارا جوڑا اور چوپایوں میں سے ان کا جوڑا بنایا

گیا۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حوّا پیدا کی گئی تھی تو چاہئے تھا کہ پہلے گھوڑا پیدا ہوتا اور پھر اس کی پسلی سے گھوڑی بنائی جاتی۔ اسی طرح جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو فرشتہ آتا اور اس کی پسلی کی ایک ہڈی نکال کر اس سے لڑکی بنا دیتا۔ مگر کیا کسی نے کبھی ایسا دیکھا ہے؟ تیسرے خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا[55] وہ خدا ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اس سے اس کا جوڑا بھی بنایا ہے لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا تا کہ وہ اس سے تعلق پیدا کر کے تسکین حاصل کرے۔

وہ لوگ جو کہا کرتے ہیں کہ انسان کا جوڑا پسلی سے بنایا گیا ہے وہ بھی صرف یہی کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حوّا کو بنایا گیا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ حوّا کی پسلی سے آدم علیہ السلام کو بنایا گیا لیکن اس آیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرد کی پسلی سے عورت نہیں بنی بلکہ عورت کی پسلی سے مرد بنا ہے کیونکہ اس میں زَوْجَهَا کی ضمیر نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ کی طرف جاتی ہے جو مؤنث ہے۔ اسی طرح مِنْهَا میں بھی ضمیر مونث استعمال کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے اس کا زوج بنایا اور زوج کے لئے لِيَسْكُنَ میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زوج نر تھا جو ایک مادہ سے پیدا ہوا۔ پس ان معنوں کے لحاظ سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ عورت مرد کی پسلی سے نہیں بلکہ مرد عورت کی پسلی سے پیدا ہوا ہے جسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

ان آیات کا اصل مطلب یہ ہے کہ عورت مرد کا اور مرد عورت کا ٹکڑا ہے اور دونوں مل کر ایک کامل وجود بنتے ہیں۔ الگ الگ رہیں تو مکمل مرد نہیں ہو سکتے۔ مکمل اسی وقت ہوتے ہیں جب دونوں مل جائیں۔ اب دیکھو! یہ کتنی بڑی اخلاقی تعلیم ہے جو اسلام نے دی۔ اس لحاظ سے جو مرد شادی نہیں کرتا وہ مکمل مرد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو عورت شادی نہیں کرتی وہ بھی مکمل عورت نہیں ہو سکتی۔ پھر جو مرد اپنی عورت سے حسن سلوک نہیں کرتا اور اسے تنگ کرتا ہے وہ بھی اس تعلیم کے ماتحت اپنا حصہ آپ کاٹتا ہے۔ اسی طرح جو عورت مرد کے ساتھ عمدگی سے گذارہ نہیں کرتی وہ بھی اپنے آپ کو نامکمل بناتی ہے اور اس طرح انسانیت کا جزو نامکمل رہ جاتا ہے۔

پس جب انسانیت مرد کا نام نہیں اور نہ انسانیت عورت کا نام ہے بلکہ مرد و عورت دونوں کے

مجموعے کا نام انسانیت ہے تو ماننا پڑے گا کہ انسانیت کو مکمل کرنے کے لئے مرد و عورت کا ملنا ضروری ہے اور جو مذہب ان کو علیحدہ علیحدہ رکھتا ہے وہ انسانیت کی جڑ کاٹتا ہے۔ اگر مذہب کی غرض دنیا میں انسان کو مکمل بنانا ہے تو یقیناً مذہب اس عمل کی مخالفت نہیں کرے گا بلکہ اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرے گا اور جو مذہبی کتاب بھی اس طبعی فعل کو بُرا قرار دے کر اس سے روکتی ہے یا اس سے بچنے کو ترجیح دیتی ہے وہ یقیناً انسانی تکمیل کے راستہ میں روک ڈال کر اپنی افضلیت کے حق کو باطل کرتی ہے۔

اب یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب مرد اور عورت ایک ہی چیز کے دو ٹکڑے ہیں تو کیوں ان کو علیحدہ علیحدہ وجود بنایا؟ کیوں ایسا نہ کیا کہ ایک ہی وجود رہنے دیتا تا کہ مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی خواہش ہی نہ ہوتی۔ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً۔[۵۶] اس کے نشانوں میں سے ایک یہ بھی نشان ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لئے جوڑے بنائے تا کہ تمہیں آپس میں ملنے سے سکون حاصل ہو۔ گویا انسان میں ایک اضطراب تھا۔ اس اضطراب کو دور کرنے کے لئے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے اور ان کو آپس میں ملنا سکون کا موجب قرار دیا گیا۔ اب ہم غور کرتے ہیں کہ وہ کون سا اضطراب ہے جس کا نمونہ عورت و مرد کے تعلقات ہو سکتے ہیں سو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی[۵۷] والا اضطراب ہے جو انسانی فطرت میں رکھا گیا ہے اور جس کے لئے تجسّس کی خواہش اس کے اندر ودیعت کی گئی ہے جو اسے رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ جو چیز اپنی ذات میں مکمل ہو اس میں تجسّس نہیں ہوتا لیکن جب تجسّس کا مادہ ہو تو بسا اوقات لوگ کسی چھوٹی چیز کا تجسّس کرتے ہیں تو انہیں بڑی چیز مل جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کے قلب میں تجسّس کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ جب وہ اس سے کام لیتا ہے تو خدا تعالیٰ کی ذات اس کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے اور وہ اسے پا لیتا ہے جب مرد عورت کی تلاش کر رہا ہوتا ہے اور اس کے لئے اپنے قلب میں اضطراب پاتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری تلاش کرو۔ تب اس کی زبان سے بَلٰی کی آواز نکلتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتا ہے کہ آپ ہی تو اصل مقصود ہیں۔ اسی طرح جب عورت مرد کی تلاش کر رہی ہوتی ہے اسے خدا کہتا ہے کہ کیا میں تلاش کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ تب وہ پکار اُٹھتی ہے کہ بَلٰی یقیناً آپ ہی

اصل مقصود ہیں۔ اس طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کے متعلق تلاش اور تجسس کا جذبہ رکھنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی محبت حاصل کر لیتے اور اسے پا لیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنی محبت کا مادہ فطرتِ انسانی میں مخفی کیوں رکھا

اب سوال ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ظاہراً کیوں نہ مرد و عورت میں اپنی محبت پیدا کر دی اور اس طرح مخفی کیوں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہراً محبت ہوتی تو حصولِ اتصال موجبِ ترقیات نہ ہوتا اور نہ اس کا ثواب ملتا۔ ثواب کے لئے اخفاء کا پہلو ضروری ہوتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے مرد کے پیچھے عورت کے لئے اور عورت کے پیچھے مرد کے لئے اپنی محبت کو چھپا دیا تا کہ جو لوگ کوشش کر کے اسے حاصل کریں وہ ثواب کے مستحق ہوں۔ مرد میں عورت کی اور عورت میں مرد کی جو خواہش پیدا کی وہ مبہم خواہش ہے، اصل خواہش خدا ہی کی ہے۔ اس لئے اس نے انسان میں یہ مادہ رکھا کہ وہ خواہش کرے کہ میں مکمل بنوں اور وہ یہ سمجھے کہ مجھے تکمیل کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہے لیکن اگر انسان میں صرف اضطراب اور تجسس کی خواہش ہی رکھی جاتی تو اضطراب مایوسی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ جہاں انسان کے قلب میں مکمل ہونے کے متعلق اضطراب ہو وہاں اس اضطراب کے نکلنے کا کوئی رستہ بھی ہو۔ جیسے انجن سے زائد سٹیم نکلنے کا رستہ ہوتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے انسان میں اضطراب پیدا کیا اور ساتھ ہی عورت کے لئے مرد اور مرد کے لئے عورت کو سیفٹی والو بنایا اور اس طرح وہ محبت جو خدا تعالیٰ کے لئے پیدا کرنی تھی اس کے زوائد کو استعمال کرنے کا موقع دے دیا گیا۔ اگر اس کے لئے کوئی سیفٹی والو نہ ہوتا تو یہ محبت بہتوں کو جنون میں مبتلا کر دیتی۔ دنیا میں کوئی عقلمند کسی چیز کو ضائع ہونے نہیں دیتا پھر کس طرح ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ کسی چیز کو ضائع ہونے دے۔ پس اس نے اس کا علاج یہ کیا کہ انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسے دو شکلوں میں ظاہر کیا جس سے اس جوش کا زائد اور بے ضرورت حصہ دوسری طرف نکل جاتا ہے اور اس طرح انسان خواہ مرد ہو یا عورت سکون محسوس کرتا ہے۔ اسی کی طرف رسول کریم ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا اَلنِّسَاءُ وَالطِّيْبُ وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔ [۵۸] ایک روایت میں مِنَ الدُّنْيَا کی بجائے مِنْ دُنْيَاكُمْ کے الفاظ بھی

آتے ہیں۔ یعنی دنیا میں سے تین چیزیں مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ اَلنِّسَاءُ عورتیں اَلطِّيْبُ خوشبو وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک تو نماز میں رکھی گئی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ مرد و عورت کے جنسی تعلقات بھی تسکین اور ٹھنڈک کا موجب ہوتے ہیں اور خوشبو سے بھی قلب کو سکون محسوس ہوتا ہے اور نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری اور عاجزانہ دُعائیں جو لذّت پیدا کرتی ہیں، وہ بھی انسان کے لئے سکون کا موجب ہوتی ہیں۔

مرد و عورت ایک دوسرے کے لئے سکون کا موجب ہیں

یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہاں تو صرف یہ ذکر ہے کہ مرد کے لئے عورت سکون کا باعث ہے، یہ ذکر نہیں کہ عورت کے لئے بھی مرد سکون کا باعث ہے۔ یہ مفہوم جو مرد و عورت کے تعلقات کا بتایا گیا ہے تب درست ہوتا جب دونوں ایک دوسرے کے لئے سکون کا موجب ہوں۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [۵۹] یعنی عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ پس موجب سکون اور آرام ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ عورت مرد کے لئے سکون کا باعث ہے اور مرد عورت کے لئے۔

مرد و عورت دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر کوئی نہا دھو کر نکلے لیکن میلے کچیلے کپڑے پہن لے تو کیا وہ صاف کہلائے گا۔ کوئی شخص خواہ کس قدر صاف ستھرا ہو لیکن اس کا لباس گندا ہو تو وہ گندا ہی کہلاتا ہے۔ پس هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا نیکی بدی میں شریک قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا محافظ ہونا چاہئے۔ اس طرح بھی لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا کا مفہوم پورا ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لئے بطور رفیقِ سفر کے کام کرتے ہیں۔

روحانی طاقتوں کی جسمانی طاقتوں سے وابستگی

حقیقت یہ ہے کہ بہت لوگوں نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ روحانی طاقتیں جسمانی طاقتوں سے اس

دنیا میں وابستہ ہیں اور روح اسی جسم کے ذریعہ سے کام کرتی ہے۔ یہ بات عام لوگوں کی نظروں سے غائب ہے۔ نادان سائنس والے جسم کی حرکات دیکھ کر کہتے ہیں کہ روح کوئی چیز نہیں اور روحانیات سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرنے والے علماء جو قرآن نہیں جانتے وہ کہتے ہیں کہ روح جسم سے علیحدہ چیز ہوتی ہے۔ حالانکہ روح اور جسم ایک دوسرے سے بالکل پیوست ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے روح کو علوم اور عرفان کے خزانے دیئے ہیں وہاں ان خزانوں کے دریافت کی تڑپ اور ان کے استعمال کو جسم کی کوششوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ جب جسم ان کی تلاش اور تجسّس کرتا ہے تو وہ نکلتے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی پاگل خدا رسیدہ نہیں ہوسکتا ورنہ اگر روح جسم سے الگ ہوتی اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو چاہئے تھا کہ پاگل کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہوتا کیونکہ پاگل کا دماغ خراب ہوتا ہے اور دماغ جسم سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ روح سے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاگلوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرفوع القلم قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کو دوبارہ عمل کا موقع دے گا۔ اگر خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا صرف روح کا کام تھا جسم کا اس میں کوئی دخل نہ تھا تو وہ پہلی تو کہہ ہی چکی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم روح سے بالکل پیوستہ ہے۔ جسم میں خدا تعالیٰ نے ایسی طاقتیں رکھی ہیں جو روحانیت کو بڑھانے والی ہیں۔

رجولیت یا نسائیت سے متعلق قوتوں کا روح سے تعلق

انہیں قوتوں میں سے جو انسان کو ابدیت کے حصول کے لئے دی گئی ہیں ایک اس کی ان غدودوں کا فعل ہے جو رجولیت یا نسائیت سے متعلق ہیں۔ یہ غدود جسم کے ہی حصے نہیں بلکہ روح سے بھی ان کا تعلق ہے ورنہ مرد کو خوجہ بننے سے روکا نہ جاتا۔ پھر یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ انبیاء کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں کیونکہ یہ اعضاء روحانیت کے لئے ضروری ہیں۔ بلکہ ان سے روحانیت مکمل ہوتی ہے۔ رجولیت یا نسائیت کی اصل غرض درحقیقت بقا کی حِس پیدا کرنے کی خواہش ہے۔ اس خواہش کے ماتحت رجولیت یا نسائیت کے غدود بقا کی دوسری صورت کا کام دیتے ہیں۔ یعنی نسل کشی۔ گویا نسلِ انسانی کے پیدا کرنے کا ذریعہ ان غدودوں کے نشوونما کا ایک ظہور ہے اور وہی طاقت جو روح کی بقا کا ذریعہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بقا کا ذریعہ بھی بنا دیا اور یہ

بقائے اولاد کے ذریعہ ہوتا ہے۔ روح کی ترقی سے بقاء ابدی حاصل ہوتا ہے اور اولاد کے ذریعہ جسمانی بقاء ہوتا ہے۔ اس لئے بقاء پیدا کرنے والی زائد طاقت کو اس کے لئے استعمال کر لیا گیا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر حیوانات میں اس طاقت کے رکھنے کا کیا فائدہ ہے تو اس کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی پیدائش مختلف دوروں کے بعد ہوئی ہے۔ پہلے چھوٹا جانور بنا پھر بڑا پھر اس سے بڑا اور آخر میں انسان پیدا کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔[۱۰] تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کے لئے وقار پسند نہیں کرتے اور تم کہتے ہو کہ خدا جلدی کر دے۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا[۱۱] تم اپنی پہلی پیدائش کو دیکھو کہ کتنے عرصے میں ہوئی ہے۔ غرض انسان مختلف دوروں کے بعد بنا ہے اور انہی دوروں میں سے حیوانات بھی ہیں۔ پس تمام حیوانات درحقیقت انسانی مرتبہ تک پہنچنے کی سیڑھیاں ہیں ورنہ وہ اپنی ذات میں خود مقصود نہیں اور جو چیز سیڑھیوں پر لے جائی جائے گی وہ راستہ میں بھی گرے گی۔ اس لئے وہ چیزیں جو انسان کی ترقی کے لئے بنی تھیں وہ حیوانوں میں بھی پائی گئیں مگر یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قوت شہوانی جس قدر انسان میں ترقی یافتہ ہے اس قدر حیوانات میں نہیں ہے اور پھر یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قوتِ شہوانی کا دماغی قابلیتوں سے ایک بہت ہی گہرا تعلق ہے اور بہت سے اعصابی نقصوں اور دماغی نقصوں کا علاج شہوانی غدودوں کے رس ہیں۔

غرض حق یہ ہے کہ شہوانی طاقتوں کے پیدا کرنے والے آلات کا اصل کام اخلاق کی درستی ہے لیکن چونکہ اصل کام کے بعد کچھ بقائے ضرور رہ جاتے ہیں جو بطور زائد سٹیم کے ہوتے ہیں۔ اگر انہیں نہ نکالا جائے تو انجن کے ٹوٹنے کا ڈر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے دوسرا کام بقائے نسل کا لے لیا اور بجائے نسل انسانی کے چلانے کے کسی اور ذریعہ کے اس ذریعہ کو اختیار کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے دنیا ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھی مگر آہستہ آہستہ سمجھ رہی ہے اور طبّی دنیا مان رہی ہے کہ قوتِ شہوانی کا دماغی قابلیتوں سے بہت گہرا تعلق ہے اور ان غدودوں سے کام لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کا ایک ماہر مانتا ہے کہ ان غدودوں میں نقائص کی وجہ سے ہی مایوسی اور کئی دوسرے جسمانی نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک امریکن مصنف نے سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق لکھتا ہے کہ آپ پر کئی شادیاں کرنے کا اعتراض فضول

ہے کیونکہ آپ خدا تعالیٰ کے عشق اور اس کے ذکر میں محو رہتے تھے اور ایسے آدمی کی قوتِ رجولیت ساتھ ہی نشوونما پا جاتی ہے۔ گو اس شخص نے صحیح الفاظ میں حقیقت کو بیان نہیں کیا لیکن حق یہی ہے کہ بقائے دوام کی خواہش کا ذریعہ غدود شہوانیہ ہیں۔ اور بقائے نسل ان کا ایک ضمنی اور ماتحت فعل ہے۔ پس ضروری تھا کہ اس اضطراب کو کم کرنے کے لئے جو خدا تعالیٰ نے غدودِ شہوانیہ کے ذریعہ سے انسان کے اندر پیدا کیا تھا اور اس طرح اپنی طرف بلایا تھا ایک ایسی صورت کی جاتی کہ اضطراب اپنے اصل رستہ سے ہٹ جانے کا موجب نہ ہوتا اور طاقت کے بقیہ حصّہ کو استعمال بھی کر لیا جاتا جس کے لئے مرد عورت کے تعلقات کو رکھا گیا ہے۔ اور مرد کو عورت کے لئے اور عورت کو مرد کے لئے موجب سکون بنا دیا۔

حضرت خلیفہ اوّل کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے بیماری کی حالت میں روزہ رکھ لیا تو اس سے شہوانی طاقت کو بہت ضعف پہنچ گیا۔ بیسیوں لوگوں کو میرے علاج سے فائدہ ہوتا تھا مگر مجھے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر میں نے سوچا کہ خدا تعالیٰ کا ذکر شروع کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے کثرت سے تسبیح و تحمید کی تو شفا ہو گئی۔ پس یہ بہت باریک تعلقات ہیں جنہیں ہر ایک انسان نہیں سمجھ سکتا۔

روحانیت میں بھی رجولیّت اور نسائیت کی صفات

یہ سلسلہ کہ ہر ایک چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑوں میں پیدا کیا ہے تا کہ غفلت میں کمال، غلط اطمینان کا باعث ہو کر باعثِ تباہی نہ ہو اور تا کہ ہر ایک چیز اپنی ذات میں کامل نہ ہو اور اس کامل وجود کی طرف اس کی توجہ رہے جس سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ ظاہری حالات کے علاوہ روحانیات میں بھی چلتا ہے۔ اور اس سے بھی اس ظاہری سلسلہ کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کافر پر ابتداءً رجولیّتِ ایمان کی حالت غالب ہوتی ہے اور ہر مومن پر رجولیّتِ کفر کی حالت غالب ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص جاہل ہو گا تو جہالت کی وجہ سے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہو گی اور وہ علم حاصل کرے گا۔ لیکن جب کوئی علم حاصل کر لے گا تو اسے اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ علم حاصل کر لیا۔ ہر جگہ یہی بات چلتی ہے۔ قرآن کریم میں مومن کی

مثال فرعون کی بیوی سے دی گئی ہے کیونکہ ابتداء میں مومن پر کفر غلبہ کرنا چاہتا ہے لیکن آخر کفر مغلوب ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کہ ہر انسان کا ایک گھر جنت میں ہوتا ہے اور ایک دوزخ میں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعہ میں ہر انسان کا ایک گھر جنت میں اور ایک دوزخ میں ہوتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں دونوں قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں۔ کفر کی طرف کفر والی طاقت کھینچتی ہے اور ایمان کی طرف ایمان والی طاقت اور انسان ایک یا دوسری کی طرف پھر جاتا ہے۔ درحقیقت قرآنی اصطلاح میں رجولیت چیکنگ پاور کا نام ہے اور نسائیت فیضان کا لیکن بعد میں ایک یا دوسرے کی طرف انسان پھر جاتا ہے۔ البتہ بعض استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں اور ایسے انسان مریمی صفت ہوتے ہیں۔ یعنی شروع سے ہی ان کی رجولیت اور نسائیت ایک رنگ میں رنگین ہوتی ہے اور وہ تقدس کے مقام پر ہوتے ہیں یعنی بعض لوگوں میں فطرتًا ایسا مادہ ہوتا ہے کہ تاثیر کا مادہ بھی ان کے اندر ہوتا ہے اور تاثر کا مادہ بھی۔ جب ان کی رجولیت اور نسائیت کامل ہو جاتی ہیں تو ان سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جو قدوسیت یا مسیحیت کا رنگ رکھتا ہے لیکن باقی لوگ کسبی طور پر یہ بات حاصل کرتے ہیں۔ جس انسان کے اندر ہی یہ دونوں مادے ہوں اس کو نیا مرتبہ ملتا اور اس کی ایک نئی ولادت ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ تحریم سے جب یہ استدلال کیا کہ بعض انسان مریمی صفت ہوتے ہیں۔ تو اس پر نادانوں نے اعتراض کیا کہ مرزا صاحب کبھی عورت بنتے ہیں، کبھی حاملہ ہوتے ہیں اور کبھی بچہ جنتے ہیں۔ حالانکہ تمام صوفیاء یہ لکھتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت شہاب الدین صاحب سہروردیؒ اپنی کتاب ''عوارف المعارف'' میں حضرت مسیحؑ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ لَنْ يَّلِجَ مَلَكُوْتَ السَّمَاءِ مَنْ لَمْ يُوْلَدْ مَرَّتَيْنِ [۱۲] یعنی کوئی انسان خدائی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک دو دفعہ پیدا نہ ہو۔ ایک وہ پیدائش جو خدا کے ہاتھوں سے ہوئی اور دوسری مریم والی پیدائش۔ پھر اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ وَصَرْفُ الْيَقِيْنِ عَلَى الْكَمَالِ يَحْصُلُ فِيْ هٰذِهِ الْوِلَادَةِ وَبِهٰذِهِ الْوِلَادَةِ يَسْتَحِقُّ مِيْرَاثَ الْاَنْبِيَاءِ وَمَنْ لَّمْ يَصِلْهُ مِيْرَاثُ الْاَنْبِيَاءِ مَا وُلِدَ وَاِنْ كَانَ عَلٰى كَمَالٍ مِّنَ الْفِطْنَةِ وَالذَّكَاءِ لِاَنَّ الْفِطْنَةَ وَالذَّكَاءَ نَتِيْجَةُ الْعَقْلِ۔ وَالْعَقْلُ اِذَا كَانَ يَابِسًا مِّنْ نُّوْرِ الشَّرْعِ لَا يَدْخُلُ الْمَلَكُوْتَ وَلَا يَزَالُ مُتَرَدِّدًا فِي الْمُلْكِ [۱۳] یعنی

یقین کے کمالات کے درجہ تک پہنچنا ایسی ولادت کے بعد ہوتا ہے جو دوسری ولادت ہوتی ہے۔ اس کے بعد انبیاء کا ورثہ ملتا ہے۔ پھر کہتے ہیں جسے یہ میراث نہ ملے، نہ انبیاء والے علوم ملیں وہ سمجھے کہ اس کی دوسری ولادت نہیں ہوئی۔ اگرچہ عقلی طور پر اسے بڑے بڑے لطیفے سوجھیں اور اگرچہ اس میں بڑی ذکاء ہو۔ یہ عقل کا نتیجہ ہوگا، روحانیت کا نتیجہ نہیں ہوگا اور عقل، جب تک خدا کی طرف سے نور نہ آئے روحانیت میں داخل نہیں ہوتی بلکہ نیچر میں ہی رہتی ہے۔

پس روحانیت میں بھی یہ جوڑے ہوتے ہیں۔ اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کہ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلَّا وَالشَّیْطٰنُ یَمَسُّهٗ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّیْطٰنِ اِیَّاهُ اِلَّا مَرْیَمَ وَابْنَهَا۔ [۶۴] یعنی ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اسے شیطان چھوتا ہے جس سے وہ روتا ہے سوائے مسیح اور اس کی ماں مریم کے۔

اس سے مراد صرف مریم اور عیسیٰ نہیں بلکہ ہر وہ آدمی جو مریمی صفات والا ہوتا ہے، مراد ہے ورنہ کہنا پڑے گا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ شیطان نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چھوا تھا۔ اس حدیث میں دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ دو کامل پیدائشیں ہوتی ہیں۔ ایک مریمی پیدائش اور دوسری مسیح والی پیدائش۔ جو انسان مریمی صفت لے کر پیدا ہوتا ہے وہ مسیح بنتا ہے اور جو مسیحیت کی صفت لے کر پیدا ہوتا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنتا ہے۔ مسیحیت کی صفت پر پیدا ہونے والے جلالی نبی تھے اور مریمیّت کی صفت رکھنے والے جمالی نبی۔ ایک میں عکس کی صفت کامل تھی اور دوسرے میں انعکاس کی۔ ایک وہ ہیں جن کی اصل صفت نسوانی ہے اور رجولیت بعد میں کامل ہوتی ہے یعنی ماتحت اور جمالی نبی اور ایک وہ ہیں جو مسیحیت کے وجود سے پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان کی نسوانیت مکمل ہوتی ہے۔ یہ جلالی نبی یا شرعی نبی ہیں۔

غرض روحانی سلسلہ میں بھی جوڑے پائے جاتے ہیں اور کبھی بھی کوئی انسان کامل نہیں ہوسکتا جب تک اس کی رجولیت اور نسائیت کی صفات آپس میں ملیں نہیں اور دونوں صفات مکمل نہ ہوں جنہیں ہم دوسرے الفاظ میں اخلاق کا تاثیری یا تاثری پہلو کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ دونوں پہلو پیدا ہوں تب جا کر وہ نئی روح پیدا ہوتی ہے جو ایک نئی پیدائش کہلاتی ہے اور تاثیر اور تاثر کے ملنے سے ہی روحانیت کو سکون حاصل ہوتا ہے اور انسان اپنے قلب میں اطمینان پاتا ہے یہاں تک کہ اسے

ایک نئی پیدائش حاصل ہوجاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے۔

یہ روحانی علم النفس کا ایک وسیع مسئلہ ہے کہ انسان کے جتنے اخلاق ہیں ان میں سے بعض رجولیت کی قوت سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض نسائیت کی قوت سے۔ جب یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تب اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں مگر یہ مضمون چونکہ اس وقت میرے ساتھ تعلق نہیں رکھتا اس لئے میں نے اس کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے۔

مرد وعورت میں مَوَدَّت کا مادہ

دوسری بات خدا تعالیٰ نے یہ بتائی کہ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً اس ذریعہ سے تم میں مَوَدَّت پیدا کی گئی ہے۔ مَوَدَّت محبت کو کہتے ہیں لیکن اگر اس کے استعمال اور اس کے معنوں پر ہم غور کریں تو محبت اور مَوَدَّت میں ایک فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ مَوَدَّت اس محبت کو کہتے ہیں جو دوسرے کو اپنے اندر جذب کر لینے کی طاقت رکھتی ہے لیکن محبت میں یہ شرط نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَوَدَّت کا لفظ بندوں کی آپس کی محبت کے متعلق استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کو اور عورت مرد کو جیت لینا چاہتی ہے۔ ان میں سے جو دوسرے کو جیت لیتا ہے وہ مرد ہوتا ہے اور جسے جیت لیا جاتا ہے وہ عورت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ نہیں رکھا گیا کیونکہ بندہ کی کیا طاقت ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو جذب کر سکے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ نہیں آیا کہ بندہ خدا کے لئے وَدُوْد ہے مگر خدا تعالیٰ کے لئے آیا ہے کہ وہ وَدُوْد ہے۔ وہ بندہ کو جذب کر لیتا ہے مگر مرد و عورت کے لئے مَوَدَّةً کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چونکہ انسانوں کو کامل کرنا مقصود تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے ایسے احساسات مرد اور عورت میں رکھے کہ مرد چاہتا ہے عورت کو جذب کرے اور عورت چاہتی ہے مرد کو جذب کرے لیکن خدا تعالیٰ کو بندہ جذب نہیں کر سکتا۔ اس لئے بندوں کے لئے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ [65] یا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ [66] آتا ہے یَوَدُّوْنَ اللّٰهَ نہیں آتا۔

مرد و عورت میں اللہ تعالیٰ نے مَوَدَّت کا تعلق رکھ کر بتایا کہ ہم نے اس طرح ایک نفس کے دو ٹکڑے بنا کر ایک دوسرے کی طرف کشش پیدا کر دی ہے اور ہر ٹکڑا دوسرے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس طرح طبعاً تکمیل انسانیت کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ یہ مَوَدَّت پیدا

نہ کرتا تو شادی بیاہ کے جھمیلوں سے ڈر کر کئی لوگ شادیاں بھی نہ کرتے اور کہتے کہ کیوں خرچ اُٹھائیں اور ذمہ واریوں کے نیچے اپنے آپ کو لائیں لیکن چونکہ خدا تعالیٰ نے مرد اور عورت میں مَوَدَّۃ پیدا کر دی ہے اس لئے شادی بیاہ کے جھمیلے برداشت کر لیتے ہیں۔

مرد وعورت کے ذریعہ ایک مدرسہ رحم کا اجراء

تیسری بات یہ بیان فرمائی کہ اس ذریعہ سے رَحْمَۃ پیدا کی گئی ہے کیونکہ نفس جس چیز کے متعلق یہ محسوس کرے کہ یہ میری ہے اس سے رحم کا سلوک کرتا ہے۔ مرد جب عورت کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ میرا ہی ٹکڑا ہے تو پھر اس ٹکڑے کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ بعض مردوں عورتوں میں نا چاقی اور لڑائی جھگڑا بھی تو ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت اسی جگہ ہوتی ہے جہاں اصل ٹکڑے آپس میں نہیں ملتے۔ جہاں اصل ٹکڑے ملتے ہیں وہاں نہایت امن اور چین سے زندگی بسر ہوتی ہے اور کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ ایک مرد وعورت کی آپس میں نا چاقی رہتی ہے اور آخر طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے لیکن اس مرد کی کسی اور عورت سے اور اس عورت کی کسی اور مرد سے شادی ہو جاتی ہے تو وہ بڑی محبت اور پیار سے زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت مرد کا ٹکڑا تو ہے لیکن جب صحیح ٹکڑا ملتا ہے تب امن اور آرام حاصل ہوتا ہے۔ پس مرد عورت کو اپنا ٹکڑا سمجھ کر اس پر رحم کرتا ہے اور اس طرح اسے رحم کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور پھر ہر جگہ اس عادت کو استعمال کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ڈاکے ڈالتے اور لوگوں کو قتل کرتے ہیں وہ بھی اگر بیوی بچوں میں رہیں تو رحمدل ہو جاتے ہیں لیکن علیحدہ رہنے کی وجہ سے ان میں بے رحمی کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ مجرموں کو جیلوں میں رکھنے کی وجہ سے جرم بڑھ جاتے ہیں کیونکہ وہ علیحدہ رہتے ہیں اور اس طرح سنگ دل ہو جاتے ہیں۔ گویا مرد عورت کے تعلق کے ذریعہ انسان کو رحم کا ایک مدرسہ مل جاتا ہے جس میں تربیت پا کر وہ ترقی کرتا ہے اور خدا کے رحم کو کھینچ لیتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ عورت و مرد کا تعلق ایک پُر حکمت تعلق ہے۔ اس کو توڑنا انسانیت کو ناقص اور سلوک کو ادھورا کر دیتا ہے اور اسے قائم کرنے سے خدا تعالیٰ کی طرف رغبت میں سہولت پیدا ہوتی ہے نہ کہ روک۔

عورت کو کھیتی قرار دینے میں حکمت

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد وعورت کس اصل پر تعلق رکھیں؟ یورپ کے بعض فلاسفر ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تربیت اخلاق کے لئے شادی تو ضروری ہے لیکن تعلقاتِ شہوانی مُضر ہیں۔ یہ تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ [1] تمہاری بیویاں تمہارے لئے بطور کھیتی کے ہیں تم جس طرح چاہو ان میں آؤ۔ اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب یہ کہا گیا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں کریں تو اچھا ہم تو چاہتے ہیں کہ عورتوں سے تعلق نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ اس طرح آؤ کہ آگے نسل چلے اور یادگار قائم رہے۔ پس تم اس تعلق کو بُرا نہ سمجھنا۔ اس آیت میں مندرجہ ذیل امور بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ نر و مادہ کے تعلق کی اجازت دی ہے لیکن ایک لطیف اشارہ سے۔ یعنی عورت کو کھیتی کہہ کر بتایا کہ انسانی عمل محدود ہے۔ اسے غیر محدود بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ یہی کہ نسل چلائی جائے۔ پس جس طرح زمین ہو تو اسے کاشتکار نہیں چھوڑتا۔ تم کیوں اس ذریعہ کو چھوڑتے ہو جس سے تم پھل حاصل کر سکتے ہو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہارا بیج ضائع ہوگا۔

۲۔ دوسری بات یہ بتائی کہ عورتوں سے اس قدر تعلق رکھو کہ نہ ان کی طاقت ضائع ہو اور نہ تمہاری۔ اگر کھیتی میں بیج زیادہ ڈال دیا جائے تو بیج خراب ہو جاتا ہے اور اگر کھیتی سے پے در پے کام لیا جائے تو کھیتی خراب ہو جاتی ہے۔ پس اس میں بتایا کہ یہ کام حد بندی کے اندر ہونا چاہئے۔ جس طرح عقلمند کسان سوچ سمجھ کر کھیتی سے کام لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کس حد تک اس میں بیج ڈالنا چاہئے اور کس حد تک کھیت سے فصل لینی چاہئے اسی طرح تمہیں کرنا چاہئے۔

اس آیت سے یہ بھی نکل آیا کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہر حالت میں اولاد پیدا کرنا ہی ضروری ہے کسی صورت میں بھی برتھ کنٹرول جائز نہیں وہ غلط کہتے ہیں۔ کھیتی میں سے اگر ایک فصل کاٹ کر معاً دوسری بودی جائے تو دوسری فصل اچھی نہیں ہوگی اور تیسری اس سے زیادہ خراب ہوگی۔ اسلام نے اولاد پیدا کرنے سے روکا نہیں بلکہ اس کا حکم دیا ہے لیکن ساتھ ہی بتایا ہے کہ کھیتی کے

متعلق خدا کے جس قانون کی پابندی کرتے ہو اسی کو اولاد پیدا کرنے میں مدّنظر رکھو۔ جس طرح ہوشیار زمیندار اس قدر زمین سے کام نہیں لیتا کہ وہ خراب اور بے طاقت ہو جائے یا اپنی ہی طاقت ضائع ہو جائے اور کھیت کاٹنے کی بھی توفیق نہ رہے یا کھیت خراب پیدا کرنے لگے۔ اسی طرح تمہیں بھی اپنی عورتوں کا خیال کر رکھنا چاہئے۔ اگر بچہ کی پرورش اچھی طرح نہ ہوتی ہو اور عورت کی صحت خطرہ میں پڑتی ہو تو اس وقت اولاد پیدا کرنے کے فعل کو روک دو۔

تیسری بات یہ بتائی کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو تو اولاد پر اچھا اثر ہوگا اور اگر ظالمانہ سلوک کرو گے تو اولاد بھی تم سے بے وفائی کرے گی۔ پس ضروری ہے کہ تم عورتوں سے ایسا سلوک کرو کہ اولاد اچھی ہو۔ اگر بدسلوکی سے کھیت خراب ہوا تو دانہ بھی خراب ہوگا یعنی عورتوں سے بدسلوکی اولاد کو بداخلاق بنادے گی کیونکہ بچہ ماں سے اخلاق سیکھتا ہے۔

چوتھی بات یہ بتائی کہ عورت سے تمہارا صرف ایسا تعلق ہو جس سے اولاد پیدا ہوتی ہو۔ بعض نادان اس سے خلافِ وضعِ فطری فعل کی اجازت سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ وہ عمل کرو جس سے کھیتی پیدا ہو۔ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ ایک بات کو اسی حد تک ننگا کرتا ہے جس حد تک اخلاق کے لئے اس کا عُریاں کرنا ضروری ہوتا ہے باقی حصہ کو اشارہ سے بتا جاتا ہے۔ پس اَنّٰی شِئْتُمْ میں تو اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے کہ یہ تمہاری کھیتی ہے اب جس طرح چاہو سلوک کرو لیکن یہ نصیحت یاد رکھو کہ اپنے لئے بھلائی کا سامان ہی پیدا کرنا ورنہ اس کا خمیازہ بھگتو گے۔ یہ ایک طریقِ کلام ہے جو دنیا میں بھی رائج ہے۔ مثلاً ایک شخص کو ہم رہنے کے لئے مکان دیں اور کہیں کہ اس مکان کو جس طرح چاہو رکھو تو اس کا مطلب اس شخص کو ہوشیار کرنا ہوگا کہ اگر احتیاط نہ کرو گے تو خراب ہو جائے گا اور تمہیں نقصان پہنچے گا۔ اسی طرح جب لوگ اپنی لڑکیاں بیاہتے ہیں تو لڑکے والوں سے کہتے ہیں کہ اب ہم نے اسے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے جیسا چاہو اس سے سلوک کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اسے جوتیاں مارا کرو بلکہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔ پس اَنّٰی شِئْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ عورت تمہاری چیز ہے اگر اس سے خراب سلوک کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بُرا ہوگا اور اگر اچھا سلوک کرو گے تو اچھا ہوگا۔ دراصل اس آیت سے غلط نتیجہ نکالنے والے اَنّٰی کو پنجابی کا ''اَناہ'' سمجھ

لیتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں کہ ''اُنھے واہ'' کرو۔

تکمیلِ روحانیت کا زوجیت سے تعلق

پھر قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جنّت میں بھی بیویاں ہونگی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق اسلام میں روحانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے ورنہ اُس جگہ بیویوں کی کیا ضرورت ہوسکتی تھی۔ وہاں تو اولاد پیدا نہیں ہونی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ رجولیت اور نسائیت کی اصل غرض تکمیل انسانی ہے اولاد ایک ضمنی فائدہ رکھا گیا ہے۔

غرض قرآن کریم کا کوئی حکم لے لو خواہ وہ کس قدر ہی ابتدائی امر کے متعلق ہو اس میں بھی اسلام کی تعلیم افضل ہی نظر آئے گی۔ نر و مادہ کے تعلقات کا مسئلہ کتنا ابتدائی مسئلہ تھا لیکن قرآن کریم نے اسے کتنا علمی بنا دیا۔ باقی کتب میں اس کا ذکر بھی نہ ہوگا۔ پس ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ قرآن میں ایسی باتیں ہیں جو اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی ایسی بات نہیں جو دوسرے مذاہب کی الہامی کتابوں سے افضل نہ ہو۔ خواہ وہ کھانے پینے کے متعلق ہو خواہ لینے دین کے متعلق ہو خواہ اور معاملات کے متعلق ہو۔ اس کے لئے ہم چیلنج دے سکتے ہیں کہ کوئی عیسائی یا ہندو یا کسی اور مذہب کا پیرو کھڑا ہو اور کسی مسئلہ کا نام لے کر کہے کہ اسے قرآن سے افضل ثابت کرو تو یقیناً ہم اسے افضل ثابت کر دیں گے۔ اِنْشَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

پس قرآن کریم بعض باتوں میں ہی افضل نہیں بلکہ ہر بات میں افضل ہے۔ حتّٰی کہ قرآن زبان کے لحاظ سے بھی افضل ہے لیکن بوجہ اس کے کہ تفصیلات سے صرف جزئیات کا علم حاصل ہوتا ہے، میں اب اصول کی طرف آتا ہوں۔

میں نے پچھلے سال سالانہ جلسہ پر قرآن کریم کی فضیلت کے چھ اصول بتائے تھے اور ثابت کیا تھا کہ ان میں سے ہر امر میں قرآن کریم دوسری کتب سے افضل ہے۔ وہ چھ اصول یہ تھے۔ اوّل۔ جس کا منبع افضل ہو۔ دوم۔ ظاہری حُسن۔ سوم۔ وہ اس غرض کو پورا کرے جس کے لئے اس کی ضرورت سمجھی گئی ہو۔ چہارم۔ اس کا فائدہ دوسروں سے زائد ہو۔ پنجم۔ جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ ششم۔ وہ چیز اپنی ہو۔

اب میں چند اور فضیلت کے اصول بیان کر کے بتاتا ہوں کہ قرآن کریم وجہ فضیلت کے لحاظ سے دوسری تمام الہامی اور غیر الہامی تعلیمات سے افضل ہے۔

قرآنی فضیلت کی ساتویں وجہ

ساتویں وجہ فضیلت کی یہ ہوا کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی جنس کی چیزوں کی نسبت ٹوٹ پھوٹ سے زیادہ محفوظ ہو۔ جب ہم کپڑا خریدتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ کونسا کپڑا زیادہ چلے گا۔ جو جلد پھٹ جانے والا ہو وہ نہیں لیتے بلکہ جو زیادہ دیر چلنے والا ہو وہ لیتے ہیں۔ یہی حال اور چیزوں کا ہوتا ہے۔ زیادہ چلنے والی چیز خریدی جاتی ہے اور کم چلنے والی چیز چھوڑ دی جاتی ہے۔ تعلیمات کے متعلق بھی یہ سوال لازماً ہوتا ہے۔ اگر دو تعلیمیں برابر ہوں لیکن ایک بگڑنے سے محفوظ ہو تو اسے یقیناً تقدم حاصل ہوگا۔ اس اصل کے ماتحت ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں کہ یہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے یا دوسری کتابیں۔ الہامی کتابوں میں ٹوٹ پھوٹ نہ ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں یہی کہ الہامی تعلیم بگڑنے سے محفوظ ہو۔ اس میں نہ ملاوٹ ہوا اور نہ ہو سکتی ہو۔ پہلے بتایا گیا تھا کہ دوسری کتابوں میں ملاوٹ ہے لیکن قرآن کریم میں نہیں ہے۔ گو جو کچھ بیان ہوا تھا وہ بھی اختصار سے ہوا تھا اور دلائل بھی ساتھ بیان ہونے سے رہ گئے تھے مگر اب میں یہ بتاتا ہوں کہ قرآن ایسا محفوظ ہے کہ اس میں ملاوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ ملاوٹ نہ ہوا اور نہ ہو سکتی ہو میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں ملاوٹ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ:-

(ا) قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم نے ہی اس ذکر کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ رہیں گے۔ اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جس چیز کی ہر وقت ایک قادر ہستی حفاظت کر رہی ہو وہ ٹوٹ نہیں سکتی۔ پھر جس چیز کی حفاظت کا ذمہ غیر محدود طاقت والا لے اس میں کوئی ملاوٹ بھی نہیں ہو سکتی لیکن یہ صرف دعویٰ ہے۔ میں ابھی اسے دلیل کے طور پر پیش نہیں کر رہا۔ اس دعویٰ میں بھی قرآن دوسری کتب سے افضل ہے کیونکہ کسی اور کتاب کا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ خدا اس کا محافظ ہے۔ نہ انجیل کا نہ تورات کا نہ وید کا اور نہ کسی اور کتاب کا۔ قرآن کریم نے اس دعویٰ کے ساتھ وجہ بھی بتائی ہے اور وہ یہ کہ (i) یہ کامل ذکر ہے۔ خدا تعالیٰ

فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم نے اس کامل ذکر کو اُتارا ہے اور کامل ذکر میں خرابی پیدا ہونے سے چونکہ دنیا تباہ ہوتی ہے اس لئے ہم خود اس کے محافظ ہیں۔ نئی چیز تب بنائی جاتی ہے جب پہلی سے اعلیٰ بنائی جائے لیکن قرآن چونکہ کامل ہے اس لئے اس کو توڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوسکتی۔

(ii) دوسری وجہ یہ بیان کی کہ ہم نے خود قرآن کو کمال عطا کیا ہے اور جب ہم نے خود اس کو کمال دیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اپنے دیئے ہوئے کمال کو ضائع ہونے دیں۔

حفاظتِ قرآن کے ذرائع

پھر وہ ذریعہ جو اس کے محفوظ رکھنے کا ہے وہ بھی بتایا۔ سورۃ حجر میں جب فرمایا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ [۶۸] یہ کامل کتاب کی آیات ہیں ایسی کتاب کی جو مبین ہے یعنی تمام حقائق کو ظاہر کرنے والی ہے۔ تو چونکہ خدا تعالیٰ نے قرآن کے متعلق یہ فرمایا تھا یہ کامل کتاب ہے اور اس سے یہ مفہوم نکلتا تھا کہ یہ محفوظ رہے گی اس لئے کفار نے اعتراض کیا کہ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ [۶۹] اگر یہ کتاب محفوظ رکھی جائے گی تو پھر اس کے محفوظ رکھنے کے ذرائع کیوں نہیں بتائے گئے۔ چاہئے تھا کہ فرشتے اس کے ساتھ اُترتے۔ یہ ان کے نقطہ نگاہ سے معقول اعتراض تھا۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ [۷۰] فرشتے تو پیغامبر ہوتے ہیں یا عذاب کی خبریں لاتے ہیں یا بشارت کی۔ فرشتوں کی کیا طاقت ہے کہ وہ خدا کے کلام کی حفاظت کرسکیں۔ فرشتوں کو تو کامل علم نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کی حفاظت کر سکتے ہیں مطالب کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ حفاظت تو سوائے ہماری ذات کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ سو ہم بتاتے ہیں کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم اس کی حفاظت کا فیصلہ کر چکے ہیں ہم ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اب تم اور آئندہ کفار زور لگا کر دیکھ لو تم کچھ نہیں کر سکتے اور آئندہ بھی کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

پھر فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ

خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ۔ ؎۱ یعنی ہنسی اور انکار تو پہلے انبیاء کا بھی ہوتا چلا آیا ہے لیکن پہلے انبیاء تو اس کتاب کے متعلق جو اُن پر نازل ہوتی تھی یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ پھر لوگ ان سے کیوں ہنسی کرتے رہے۔ ان لوگوں کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کریں ورنہ جو کچھ یہ کہتے ہیں قطعاً معقول بات نہیں ہے۔ یہ تو صرف جُرم کا نتیجہ ہے جو ہر زمانہ میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اب رہا اس کے محفوظ ہونے کا ثبوت۔ سو اس کے متعلق فرماتا ہے۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ۔ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ۔ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۔ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ ؎۲ فرمایا۔ یہ بے وقوف لوگ اپنی ناواقفی سے کہتے ہیں کہ قرآن بھی لفظوں میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔ جب ایسی ہی اور کتابیں بگڑ گئیں تو یہ کیوں نہیں بگڑ سکتی۔ انہیں آسمانی سامان نظر نہیں آتے۔ اگر ہم آسمانی دروازوں میں سے ایک بھی ان کے لئے کھولتے اور یہ آسمان پر چڑھ جاتے۔ یعنی ان سامانوں سے آگاہ ہوتے جو اس کتاب کی حفاظت کے لئے کئے گئے ہیں تو یہ ایسی بے ہودہ بات نہ کرتے۔ ایک راہ بھی اگر انہیں نظر آتی تو حیران رہ جاتے اور کہتے کہ ہماری آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں اور ہم کچھ دیکھ نہیں سکتے جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ ہم نابینا ہو گئے ہیں اور یہ خواب ہے یا ہم پر اس شخص نے کوئی جادو کر دیا ہے کہ اس کلام کی پشت پر اس قدر سامان ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک سامان کا ذکر بھی کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ ان سامانوں میں سے ایک یہ سامان ہے کہ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ۔ ہم نے اس کلام کے آسمان میں روشن ستارے بنائے ہیں یا یہ کہ ہم نے آسمان میں کچھ ستارے مقدر کر چھوڑے ہیں جو اس کے محافظ ہیں اور ہم نے اس کے آسمان کو ستاروں سے خوبصورت بنایا ہے۔ یعنی کثرت سے ستارے ہیں نہ کہ کوئی کوئی۔ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اور ہم نے اس آسمان کو ہر شیطان رجیم سے جو اسے بگاڑنا چاہتا ہے ان ستاروں کے ذریعہ سے محفوظ کر دیا ہے۔ پس اب اس کلام کو کوئی شریر چھو نہیں سکتا۔ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ ہاں دور سے اس کی باتیں سن کر مطلب بگاڑنے کی کوشش کر سکتا ہے جیسے عیسائی کرتے

ہیں مگر جو دُور سے سُن کر باتیں بنانے والے ہونگے وہ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ ان کے لئے بھی ہم ایسا شہاب مقرر کر دیں گے جو اُن کی حقیقت کو ظاہر کر دے گا۔ یعنی ہم نے ایسے آدمی رکھے ہیں کہ جب کوئی قرآن کی کسی آیت کا غلط مفہوم بیان کرے گا تو وہ ایک شہاب بن کر اسے تباہ کر دیں گے۔

یہ وہ ذریعہ ہے جو قرآن کی حفاظت کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ زَیَّنّٰھَا میں بتایا ہے کہ ہم نے روشنی کا جو سامان بنایا ہے وہ ایک آدھ نہیں بلکہ کثرت سے ہے اور مُّبِیْنٌ میں یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ شہاب سے مراد ٹوٹنے والے تارے نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی شہاب ہوگا جو قرآن کے مطالب کھول کر بیان کر دے گا۔

اس آیت میں بتایا کہ اس آسمان کو کوئی شیطان چُھو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ اس کی تشریح ان الفاظ میں موجود ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ [۳۷] یعنی اس کو وہی لوگ چُھو سکتے جو مطہر اور خادم دین ہوں۔ دوسرے لوگ جو گندے ارادوں سے اور بگاڑنے کی نیّت سے اس کو چھونا چاہیں نہیں چُھو سکتے۔ پس یہ قرآن ہی کے متعلق ہے کہ شیطان اُسے چُھو نہیں سکتا۔ ورنہ آسمان کو اگر شیطان نہیں چُھو سکتا تو کیا مومن چُھو سکتا ہے؟ مگر اس آسمان کو صرف شیطان نہیں چُھو سکتا اور مومن چُھو سکتا ہے۔ پس یہ قرآن ہی ہے جسے مومن چُھو سکتا ہے۔

ایک اور جگہ بھی اس کی تشریح آئی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن سُن کر جب کچھ جنات واپس گئے تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰھَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُھُبًا۔ وَّاَنَّا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْھَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَہٗ شِھَابًا رَّصَدًا۔ [۳۸] یعنی پہلے تو آسمان کو ہم چھو لیا کرتے تھے لیکن اب جو گئے تو دیکھا کہ اس کی حفاظت کے لئے بڑے بڑے پہرہ دار بیٹھے ہیں اور آسمان کو ہم نے شُھُب سے بھرا ہوا پایا پھر پہلے تو ہم آسمان میں بیٹھ بیٹھ کر باتیں سنا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننے کے لئے جاتا ہے تو اُسے پتھر پڑتے ہیں۔

اس سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے یہ تو جَو ہے اور ایسی چیز نہیں جس میں کوئی بیٹھ سکے اور اگر فرض کر لو کہ کوئی بیٹھ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تو شیطان آسمان پر بیٹھا کرتے تھے مگر پھر نہ بیٹھے۔ حالانکہ حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ ارواحِ کافرہ بھی آسمان پر نہیں جاسکتیں۔ پھر ہم کہتے ہیں رسول کریم ﷺ سے پہلے جب شیطان اُوپر بیٹھتا تھا تو اب کیوں نہیں بیٹھتا؟ کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے غیب کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ پھر وہ کون تھے جو خدا تعالیٰ کا غیب سُن کر زمین پر آجایا کرتے تھے حالانکہ قرآن صاف طور پر ان معنوں کو رڈ کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ آسمان پر کوئی جا سکتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے بتائے بغیر کسی کو غیب معلوم ہوسکتا ہے۔ پھر ان معنوں کے لحاظ سے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ خدا تعالیٰ کو بھی علم غیب نہیں تھا کیونکہ ایسی ہستیاں آسمان پر جا کر بیٹھتی تھیں جو غیب کی باتیں سُن لیتی تھیں مگر خدا تعالیٰ کو ان کے بیٹھنے کا پتہ نہیں لگتا تھا۔ اب اس نے پتہ لگانے کے لئے پہرہ دار مقرر کر دیئے ہیں۔

دراصل ان آیات کے یہ معنے ہیں کہ آسمانِ روحانیت سے آنے والی پہلی کتابیں ایسی تھیں کہ جنہیں مخالف چُھو سکتے یعنی انہیں بگاڑ دیتے تھے اور ان میں تبدیلیاں کرلیا کرتے تھے لیکن اب جو کتاب آئی ہے وہ ایسی ہے کہ اسے کوئی چُھو نہیں سکتا یعنی اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور اس کی حفاظت کا خاص سامان کیا گیا ہے اور پہلے تو ہم لوگ یعنی ہم میں سے بعض لوگ کلام کو سُن کر جس طرح چاہتے تھے توڑ مروڑ کر بات سنا دیا کرتے تھے لیکن اب یہ دروازہ بھی بند ہوگیا ہے اور جو کتاب آئی ہے وہ ایسی ہے کہ کوئی بگاڑنے والا اُسے چُھو نہیں سکتا بلکہ اگر کوئی بگاڑنے کی کوشش کرے گا تو فوراً اس پر ایک شعلہ مارتا ہوا ستارہ آگرے گا۔ گویا لَمَسْ تو بالکل بند ہے لیکن سَمْع ہوسکتا ہے مگر اس میں بھی یہ انتظام ہے کہ جو جھوٹ ملا کر بات کرے اور بدنیتی سے سُنے اس کی فوراً تردید ہو جاتی ہے۔

غرض قرآن کریم کی ایسی کامل حفاظت کر دی گئی ہے کہ اسے لفظاً بھی کوئی شخص بگاڑ نہیں سکتا اور مفہوم بگاڑنے والوں کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے ایسے سامان رکھے ہیں کہ ان سے اس بگاڑ کی اصلاح ہوتی رہے گی۔

شاید کوئی خیال کرے کہ اس جگہ تو آسمان کا لفظ ہے۔ پس آسمان کو چھونا ہی مراد ہوسکتا ہے نہ کہ کسی اور چیز کو سو یاد رکھنا چاہئے کہ

(۱) وہ آسمان جس سے کلام نازل ہوتا ہے یہ مادی آسمان نہیں ہوسکتا ورنہ اللہ تعالیٰ کو مادی ماننا پڑے گا۔ پھر یہ آسمان تو مادہ لطیف ہے کوئی ٹھوس چیز تو نہیں جس کو چُھونے اور بیٹھنے کا کچھ مطلب

ہو۔ پس آسمان جس سے کلام اُترا ہے اس کے معنے کچھ اور ہی کرنے پڑیں گے۔

(۲) عربی زبان کے محاورہ کے رُو سے سبب اور مقام کے لفظ کو استعارۃً سبب اور مقام سے نکلی ہوئی چیز کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی سماء کا لفظ بارش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بارش چونکہ اُوپر سے نازل ہوتی ہے اس لئے اسے بھی سماء کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا [۵] ہم نے ان پر بادلوں کو موسلا دھار بارش برساتے ہوئے بھیجا۔ اسی طرح سبزی ترکاری کو بھی سماء کہتے ہیں کیونکہ وہ پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں۔ مَازِلْنَا نَطَأُ السَّمَاءَ حَتّٰى اَتَيْنَاكُمْ ہم سَمَاء یعنی سبزی کو کچلتے ہوئے تمہارے گھر تک آئے۔ پس اس جگہ سَمَاء سے مراد آسمانی کتاب ہے ورنہ یہ کہنا بے جا ہوگا کہ ہم پہلے وہاں بیٹھ کر سنا کرتے تھے اب ایسا نہیں کر سکتے۔ پہلے کیوں سنتے تھے اور اب کیوں نہیں سنتے۔ ہمیں کوئی ایسا سماء نکالنا پڑے گا جسے پہلے چھو لیا کرتے تھے اور اب نہیں چھو سکتے۔ سو اس کے متعلق قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماء آسمانی کتابوں کا ہے کہ پہلے لوگ ان کو بگاڑ لیتے تھے۔ چنانچہ سورۃ بیّنہ میں آتا ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ [۶] فرمایا یہ اہل کتاب اور مشرکین اپنی جہالت کو کبھی چھوڑ نہ سکتے تھے جب تک کہ ان کے پاس ایک بینہ نہ آجاتی۔ بینہ کیا ہے؟ وہ خدا کا رسول ہے جو اُن پر کئی پاکیزہ صحیفوں والی کتاب پڑھتا ہے۔ کئی ایسی تعلیمیں تھیں جو بگڑ گئی تھیں۔ قرآن کریم میں ان کو اصل حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ پس چونکہ اب اس میں کتب قیمہ جمع ہو گئی ہیں اس لئے اب یہ کتاب نہیں بگڑ سکتی۔

قرآن کے متعلق فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کہہ کر بتایا کہ پہلی تعلیموں میں دو قسم کی خرابیاں تھیں۔ ایک وہ خرابی جس کی اصلاح کی ضرورت بوجہ نسخ نہ رہی تھی اسے چھوڑ دیا۔ دوسری وہ خرابی جو ایسی تعلیم میں تھی جو قائم رہنی تھی سوا سے دور کر کے اخذ کر لیا۔ غرض اگر تو کوئی ایسی تعلیم بگڑ گئی تھی جس کی دنیا کو اب ضرورت نہ تھی تو اسے چھوڑ دیا گیا ہے اور اگر اس تعلیم میں خرابی پیدا ہو گئی تھی جو قائم رہنی چاہئے تھی تو اس خرابی کو دور کر کے صحیح تعلیم کو اخذ کر لیا گیا ہے۔

سمائے روحانی حیی و قیوم کی صفات پر بنیاد

اس کے مقابلہ میں نیا آسمان جو قرآن کے ذریعہ بنا اس کی بنیاد حَیٌّ و قَیُّوْم کی صفات پر رکھی گئی ہے۔ مختلف انبیاء کے کلام مختلف صفاتِ الٰہیہ کے ماتحت نازل ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَفِیْ شَاْنٍ یعنی ہر زمانہ نبوت میں اللہ تعالیٰ کا کلام نئی صفات کے ماتحت نازل ہوتا ہے۔ اس جگہ یَوْم سے مراد نبوت کا زمانہ ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [7] یعنی اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک اپنے حکم کو اپنی تدبیر کے مطابق قائم کرے گا اور پھر وہ اس کی طرف ایک ایسے وقت میں چڑھنا شروع کرے گا جس کی مقدار ایسے ہزار سال کی ہے جس کے مطابق تم دنیا میں گنتی کرتے ہو۔ پس یَوْم سے مراد زمانہ نبوت ہے اور سَمَآء سے قرآن کریم مراد ہے کیونکہ قرآن کریم کا نام صحف مرفوعہ بھی آیا ہے اور سَمَآء بھی بلندی کا نام ہے۔ پس اس روحانی آسمان کو بھی سَمَآء کہہ سکتے ہیں اور اس کے لئے صفت حَیٌّ و قَیُّوْم کو استعمال کیا گیا ہے۔

یہ ثبوت کہ قرآن حَیٌّ و قَیُّوْم کی صفات کی بنیاد پر ہے قرآن سے بھی اور حدیث سے بھی ملتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم کی کون سی آیت سب سے بڑی ہے تو آپ نے فرمایا۔ آیت الْکُرْسِی [8] اور آیت الْکُرْسِی کی بنیاد حَیٌّ و قَیُّوْم پر ہے۔ یہ روایت ابی بن کعبؓ، ابن مسعودؓ، ابوذر غفاریؓ، ابوہریرہؓ اور چار پانچ صحابہؓ سے مروی ہے اور اکثر کتب حدیث میں ہے۔

اعظم ایة سے مراد اور حقیقت یہی ہے کہ یہ آیت منبع ہے قرآن کا ورنہ سب آیات ہی اعظم ہیں اور منبع اسی آیت کو کہہ سکتے ہیں جو بطور اُمّ کے ہو۔ یعنی اس میں وہ بات ہے جو قرآن کریم کو دوسری کتب سے بطور اصول کے ممتاز کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ آیت الْکُرْسِی میرے سوا اور کسی نبی کو نہیں ملی۔ [9] یوں تو قرآن کریم کی کوئی آیت بھی کسی اور نبی کو نہیں دی گئی مگر آیت الْکُرْسِی کے نہ دیئے جانے کا یہ مطلب ہے کہ

اس کے اندر جو صفات ہیں ان کے ماتحت کسی اور نبی پر کلام نازل نہیں ہوا اور وہ صفات حَیّ و قَیُّوم کی ہی ہیں۔ چنانچہ سورۃ آل عمران میں خدا تعالیٰ کی ان ہر دو صفات کو بیان کر کے قرآن کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ حَیّ کے معنے ہوتے ہیں زندہ اور زندہ رکھنے والا ہے اور قَیُّوم کے معنے ہیں قائم اور قائم رکھنے والا۔ پس فرمایا یہ کتاب اس خدا کی طرف سے اُتری ہے جو زندہ اور زندہ رکھنے والا ہے یعنی یہ کلام ہمیشہ زندہ اور زندگی بخش رہے گا اور پھر یہ کتاب اس خدا کی طرف سے اُتری ہے جو قائم اور قائم رکھنے والا ہے۔ پس اس کتاب کو بھی وہ ہمیشہ قائم رکھے گا۔ آیت الْكُرْسِی کے متعلق رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی صبح کو آیت الْكُرْسِی پڑھے تو شام تک اور شام کو پڑھے تو صبح تک شیطان سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔[۸۰] اس سے معلوم ہوا کہ قرآن ان صفات کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ صرف یہی کلام ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ پس وہی کلام جس کے زندہ رکھنے اور محفوظ رکھنے کا وعدہ تھا اور جس سے پہلے کسی کلام کے متعلق یہ وعدہ نہ تھا۔ حالانکہ وہ آسمانی کلام تھے اور جس سے پہلے کلاموں کو لوگ چھوتے تھے اور جس کے چھونے سے لوگوں کو روکا گیا تھا صاف ظاہر ہے کہ اسی کلام کی طرف اَنَّا لَمَسْنَا والی آیت میں اشارہ ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اگر حفاظت سے مراد قرآن کریم کی حفاظت نہ تھی تو کفار کے سوال میں شُہُب کے نزول کے ذکر کے کیا معنے ہیں؟ کفار تو قرآن کے متعلق سوال کرتے تھے پھر یہ کیا جواب ہوا کہ آسمان پر شیطان نہیں جا سکتا اور اگر جاتا ہے تو اس پر شہاب گرتا ہے۔

کتبِ سابقہ میں تحریف

اب عملاً دیکھ لو پہلی آسمانی کتب کس طرح خراب کر دی گئیں۔ تورات میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی خود حضرت موسیٰؑ کی موت کا ذکر ہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت مسیحؑ کی موت کا ذکر ہے۔ ژند اَوِستا کے متعلق خود پارسیوں کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے اُسے بگاڑ دیا۔ میں کہتا ہوں یہ تو پیچھے دیکھا جائے گا کہ مسلمانوں نے پارسیوں کی آسمانی کتاب میں کیا تصرّف کیا لیکن ان کے بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ان کی کتاب بگڑ چکی ہے۔ ویدوں کی بناوٹ ہی بتاتی ہے کہ وہ بگڑ

چکے ہیں۔ وید میں دوسروں کی عورتوں کو اغوا کرنے اور چوری کرنے کے متعلق دُعائیں سکھائی گئی ہیں اور ایسے منتر موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اس طرح چوری کرنی چاہئے کہ چور گھر والوں کو نظر نہ آئے۔ جس کتاب میں چوری اور ادھالے کی دُعائیں ہوں وہ کیونکر مسِ شیطانی سے محفوظ سمجھی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی باتوں سے تو صاف ظاہر ہے کہ شیطان نے ان کتابوں کو چھوا لیکن اس کے مقابلہ میں قرآن نہ صرف دعویٰ طہارت کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ کوئی اسے بگاڑ ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی اسے خراب کرنا چاہے گا تو اس پر شُہب گریں گے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں دوسری کتب کو لوگ آئے دن بگاڑتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں بائیبل کے متعلق خود عیسائیوں کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ:

> ''بائیبل سوسائٹی نے کمال دور اندیشی سے نئے ترجمہ کی تھوڑی سی جلدیں اس غرض سے شائع کی ہیں کہ اس ترجمہ پر جو اعتراضات موصول ہوں ان کو پیش نظر رکھ کر مناسب تبدیلیاں کرلی جائیں۔''[۸۱]

اسی طرح انجیل کا ایک حصہ ہی اڑا دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یسوع مسیح کے بیماروں کو اچھا کرنے پر جب یہ اعتراض کیا کہ انجیل میں لکھا ہے کہ ایک تالاب تھا جس میں نہانے سے بیمار اچھے ہوجاتے تھے۔ تو اب عیسائیوں نے اسے نکال دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کسی اور کتاب کا حصہ تھا جو غلطی سے انجیل میں درج ہوگیا۔ مگر ہم کہتے ہیں اس سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ شیطان نے انجیل کو مس کیا مگر قرآن کو تو کوئی چُھو ہی نہیں سکا۔ آخر وجہ کیا ہے کہ دوسری کتابوں کے ماننے والے قرآن کو بگاڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس سے انہیں ڈر کیوں آتا ہے۔ روسی حکومت نے ایک دفعہ چاہا تھا کہ قرآن سے جہاد کی آیتیں نکال دے لیکن ملک میں اتنا شور پڑا کہ حکومت کو مجبور ہوکر اپنے ناپاک ارادہ سے باز رہنا پڑا۔ یہ بھی شُہب ہی تھے جو اس پر گرے۔ انجیل کے متعلق کیوں ایسا نہیں ہوتا۔ پھر روسی حکومت جو قرآن سے جنگ کی آیات نکالنا چاہتی تھی وہ خود جنگ کی لپیٹ میں آگئی۔

حفاظتِ قرآن اور یورو پین مستشرقین

دوسرا ذریعہ جس کی وجہ سے قرآن میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کے لئے حرس مقرر ہیں۔ یعنی اس کے نگران ہیں۔ اس وجہ سے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس مضمون کو دوسری جگہ زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۔ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۔ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ۔ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ۔ یعنی یہ قرآن ایسے صحیفوں میں ہے جو عزت والے بڑی بلند شان رکھنے والے اور پاک ہیں اور یہ صحیفے دور دور سفر کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو بڑے معزّز اور اعلیٰ درجہ کے نیکو کار ہیں۔

یہ آیت ایسی عجیب ہے کہ اسے پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا عیسائی لٹریچر کو مدّنظر رکھ کر اُتاری گئی ہے۔ میں نے موجودہ عیسائی لٹریچر سے ایسے الفاظ نکالے ہیں جو اس آیت کی تشریح معلوم ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اس کلام کے ہمیشہ محفوظ رکھنے کا سامان ہم نے کیا ہے اور وہ یہ کہ (۱) یہ کتاب ہمیشہ مکرم رہے گی۔ اس کا ادب ہم لوگوں کے دلوں میں ڈال دیں گے اور لوگ ادب اور تعظیم کی وجہ سے اس کو خراب نہیں کریں گے۔ اس ادب کو سر ولیم میور یوں تسلیم کرتا ہے۔

> The two sources would correspond closely with each other; for the Coran, even while the Prophet was yet alive, was regarded with a superstitious awe as containing the very words of God; so that any variations would be reconciled by a direct reference to Mahomet himself, and after his death to the originals where they existed, or copies from the same, end to the memory of the Prophet's confidential

friends and amanuenses. ۸۲

یعنی قرآن کا لوگوں پر اتنا رُعب تھا کہ اس کے متعلق وہ خود اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے بلکہ رسول سے پوچھتے تھے یا پھر حفاظ اور قرآن کی نقلوں سے مقابلہ کرتے تھے۔ خود بخود کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ مَرْفُوْعَة یعنی باطنی طور پر بھی اس میں کوئی خرابی نہیں آسکتی کیونکہ اس کے مطالب کو بلند بنایا گیا ہے اور اس میں علوم ایسے رنگ میں رکھے گئے ہیں کہ انہیں خدا کا کلام یقین نہ کرنے والے سمجھ ہی نہیں سکتے اور بگاڑتا کوئی اسی وقت ہے جب مطلب سمجھ سکے اور جانتا ہو کہ اس میں یہ تغیر کر دوں گا تو یہ بات بن جائے گی۔ غرض فرمایا۔ قرآن کے مطالب ایسے رنگ میں رکھے گئے ہیں کہ جو لوگ انہیں سمجھتے ہیں وہ بگاڑتے نہیں اور جو دشمن ہیں وہ کہتے ہیں اس میں رکھا ہی کیا ہے یہ بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے اس وجہ سے وہ بگاڑنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ سر ولیم میور اس بارے میں لکھتا ہے۔

The Contents and the arragnment of the Coran speak forcibly for its authenticity. All the fragments that could obtained have, with artless simplicity, been joined together. the patchwork bears no marks of a designing genius or moulding hand. ۸۳

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ کسی نے اسے بگاڑا نہیں۔ تمام ٹکڑے اس سادگی سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے گئے ہیں کہ پتہ لگتا ہے کہ وہ گودڑی جس کے ساتھ چیتھڑے جوڑے گئے ہیں کسی عقلمند نے انہیں نہیں جوڑا۔ اب اس قسم کے مرفوع کلام میں کسی کو جرأت ہی کب ہوسکتی ہے کہ کچھ داخل کرے۔ جو سمجھتے ہیں وہ بَرَرَة ہیں اور جو نہیں سمجھتے وہ اسے ایک بے معنی کلام سمجھتے ہیں اور اس میں تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

تیسری بات یہ بتائی کہ یہ کتاب ہر نقص سے پاک بنائی گئی ہے اور ایسی اعلیٰ چیز میں جو دخل

دے وہ فوراً پکڑا جاتا ہے۔اس کی مثال کشمیر میں جا کر دیکھو۔ سلطنت مغلیہ کی جو عمارتیں بنی ہوئی ہیں ان میں جہاں جہاں بعد میں دخل دیا گیا ہے اس کا فوراً پتہ لگ جاتا ہے۔اسی طرح تاج محل کی حالت ہے۔ معمولی عمارت میں اگر کوئی پیوند لگا دے تو وہ چھپ سکتا ہے لیکن اگر تاج محل میں جا کر لگائے تو فوراً پکڑا جاتا ہے۔ پس جو لوگ قرآن کریم کی خوبیوں سے ناواقف ہیں وہ تو اس میں کمی بیشی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور جو واقف ہوتے ہیں وہ اس کی خوبصورتی میں دخل نہیں دے سکتے کیونکہ اگر دخل دیں تو فوراً ظاہر ہو جائے۔ اس وجہ سے انہیں قرآن کو بگاڑنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی۔

قرآن کریم کی حفاظت کے ظاہری سامان

پھر خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے ظاہری سامان بھی رکھے ہیں۔جس طرح اس کی اندرونی حفاظت کے تین ذرائع بتائے تھے اسی طرح بیرونی حفاظت کے بھی تین ذرائع بیان کئے۔ اوّل فرمایا بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ۔ سَفَرَة کے ایک معنی لکھنے والے کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنی ہونگے کہ یہ کتاب ایسی قوم کے ہاتھ میں دی گئی ہے کہ جوں جوں یہ نازل ہوتی گئی لکھی جاتی رہی اور جو بات لکھ لی جائے وہ محفوظ ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا یہ کتاب ایسے لکھنے والوں کے سپرد کی گئی ہے جو كِرَامٍ بَرَرَةٍ ہیں۔ یعنی معزز لوگ ہیں اور نیک اور پاک ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ ہمیشہ مخلص لکھنے والے اسے ملتے رہیں گے جو روپیہ یا لالچ کے سبب سے نہیں لکھیں گے بلکہ بڑے پایہ کے لوگ ہوں گے جو ہر ایک قسم کی عزت رکھتے ہونگے اور اپنے ہم عصروں میں خاص مقام رکھتے ہونگے۔ وہ لوگ محض نیکی کی خاطر قرآن لکھا کریں گے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جن کی کوئی غرض بگاڑنے سے وابستہ نہ ہو اور ہوں وہ نیک وہ کبھی بگاڑ نہیں سکتے۔ پس اس وجہ سے قرآن کریم کے اس قدر صحیح نسخے دنیا میں پھیل جائیں گے کہ اس میں بگاڑ ہی ناممکن ہو جائے گا۔

اب دیکھو یہ کتنی زبردست بات ہے اور کس طرح خدا تعالیٰ نے اس کو پورا کیا ہے۔ بڑے بڑے زبردست بادشاہ جو مذہبی علماء نہیں تھے کہ تعلیم قرآنی کے بگاڑنے میں ان کا فائدہ ہو اور پھر

مختلف ممالک کے قرآن کریم کے لکھنے کے بوجہ ثواب عادی تھے۔ ہندوستان کے بادشاہوں میں سے اورنگ زیب مشہور ہے جس نے کئی نسخے قرآن کریم کے لکھے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے متعلق ایک کتاب حال ہی میں چھپی ہے۔ اس میں اسامہ بن منقذ اپنے والد سلطان شہزاد کے متعلق جو شام کی ایک حکومت کے بادشاہ تھے لکھتا ہے کہ وہ یا تو فرنگیوں سے لڑتے یا شکار کھیلتے اور یا پھر قرآن لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مرتے وقت ان کے لکھے ہوئے ۴۳ قرآن موجود تھے۔

دوسرے معنی سَفَرَۃ کے سفر کرنے والے کے ہیں۔ ان معنوں کی رُو سے یہ مطلب ہوا کہ نہ صرف قرآن کریم بکثرت لکھا جائے گا بلکہ فوراً دنیا کے چاروں گوشوں میں پھیل جائے گا اور اس وجہ سے بگڑنے سے محفوظ ہو جائے گا۔ اگر کوئی مصر میں بگاڑنا چاہے گا تو عرب، شام، ہندوستان وغیرہ ممالک میں جو قرآن موجود ہوگا وہ بگاڑ کو رڈ کر دے گا۔ غرض فرمایا یہ کتاب سفر کرنے والے بزرگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے تا کہ وہ اسے سارے ملکوں میں لے جائیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی تمام عرب، افریقہ اور ابی سینا میں پہنچ گیا تھا۔ پھر رسول کریم ﷺ کی وفات کے چند سال بعد کے عرصہ میں فلسطین، شام، عراق، فارس اور افغانستان، چین، اناطولیہ، مصر، ہندوستان اور یونان وغیرہ ممالک میں پھیل گیا۔ پس ان بے غرض لکھنے والوں اور پھر اس طرح مختلف ممالک میں پھیل جانے کی وجہ سے اس میں کسی تبدیلی کا ہونا ناممکن ہو گیا اور پھر اس میں شک کرنا بھی ناممکن ہو گیا کیونکہ سب ملکوں کے نسخے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں اور اب تو پریس کے نکل آنے کی وجہ سے اس کی اشاعت کی کوئی حد ہی نہیں رہی۔

پھر شروع اسلام میں مسلمانوں میں جو اختلاف ہوا وہ بھی قرآن کریم کی حفاظت کا مؤید ہو گیا۔ سَفَرَۃ کے معنی اونٹ کی ناک میں نکیل ڈالنے والوں کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنی بھی لئے جاسکتے ہیں کہ مختلف حملہ کرنے والی فوجوں کے افسروں یا جماعتوں کے لیڈروں کے ہاتھ میں یہ قرآن ہوگا جو سب کے سب نیک ہونگے اور اس طرح مختلف مخالف جماعتوں کے ہاتھوں میں قرآن کریم کا بغیر اختلاف کے ہونا اسے بالکل محفوظ کر دے گا اور کوئی جماعت اسے بگاڑ نہیں سکے گی کیونکہ دوسری جماعت فوراً اس پر گرفت کر سکے گی۔

یہ دلیل ایسی زبردست ہے کہ دشمن سے دشمن بھی اس کی طاقت کا قائل ہوا ہے مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ خود قرآن نے ایک مکی سورۃ میں ان سب دلائل کو جمع کر دیا تھا۔ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

it is conceivable that, either Ali, or his party, when thus arrived at power, would have tolerated a mutialted Coran-mutilated expressly to destroy his claims? Yet we find that they used the same Coran as their opponents, and raised no shadow of an objection against it. ۸۴

یعنی ہم کس طرح مان سکتے ہیں کہ قرآن میں کوئی تغیر کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں جب لڑائیاں ہوئی تو وہ ایک ہی قرآن رکھتے تھے اور کسی نے کسی فریق کے قرآن کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح لکھتا ہے۔

So for from objecting to Othman's revision, Ali multiplied copies of the edition among other MSS. Supposed to have been written by Ali, one is said to have been preserved at Mashhed Ali as late as the fourteenth century,which bore his signature. ۸۵

یعنی دوسرے کئی مصنفوں نے بھی قرآن کریم کے جلد سے جلد پھیل جانے اور مختلف لڑنے والے گروہوں کے پاس ہونے کو اس میں تبدیلی ہونے کے لئے ناممکن بتایا ہے۔

مگر قرآن کریم کو دیکھو اس نے پہلے ہی اس تفصیل سے اس حقیقت کو ظاہر کر دیا تھا کہ وہ خود ایک زبردست نشان ہے۔ قرآن نے بتا دیا تھا کہ یہ بکثرت لکھا جائے گا۔ دور دراز ملکوں میں پھیل جائے گا۔ مسلمانوں میں جنگیں ہونگی اس لئے اسے کوئی بگاڑ نہ سکے گا اور یہ ایسی پختہ دلیلیں ہیں کہ عیسائیوں نے بھی انہیں تسلیم کرلیا حالانکہ یہ باتیں اس وقت بیان ہوئیں جب کہ رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ابھی مکہ میں تھے اور جب قرآن کے بگڑنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

سَفَرَۃ کے ایک معنی جھاڑ دینے اور پردہ اُٹھا دینے کے بھی ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے آیت کے یہ معنی ہونگے کہ اس کتاب کو ایسے لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے جو اس خس و خاشاک کو جو تعلیم قرآن پر پڑ کر اسے مسخ کر دینے کا موجب ہو سکتا تھا دور کرتے رہیں گے اور پھر اس کی تعلیم کو اس کی اصلی حالت پر لاتے رہیں گے اور جو اس کے پوشیدہ مطالب کو ظاہر کرتے رہیں گے اور اس کے بلند مطالب کو لوگوں کے سامنے لا کر اس کی قبولیت اور تاثیر کو تازہ کرتے رہا کریں گے جو اس فن کے لوگوں میں کِرَام ہوں گے۔یعنی ماہرین فن ہونگے اور بَرَرَۃ ہونگے یعنی امور خیر میں وسیع دسترس رکھنے والے ہونگے اور اس طرح وہ نہ صرف خود خدمت کریں گے بلکہ اور بہت سے خادم بنا کر چھوڑ جائیں گے۔لطیفہ یہ ہے کہ اس آیت میں تین ہی صفات کتاب کی اور تین ہی کتاب کے حاملوں کی بیان ہوئی ہیں لیکن کرام کے سوا جو دونوں میں متحد ہے باقی دونوں صفات میں فرق ہے۔کتاب کے لئے مَرْفُوْعَة اور مُطَهَّرَة فرمایا ہے اور انسانوں کے لئے سَفَرَة۔ بَرَرَة۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو درحقیقت اس اختلاف میں بھی اتحاد ہے۔سَفَرَة کا جوڑ مَرْفُوْعَة سے ہے کیونکہ اونچی چیز اوجھل ہوتی ہے اور سفر کے معنی خفاء کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب سَفَرَتِ الرِّيْحُ الْغَيْمَ عَنْ وَجْهِ السَّمَاءِ کہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں كَشَفَتْهُ یعنی ہوا نے گرد و غبار کو اُڑا کر مطلع صاف کر دیا۔اسی طرح مُطَهَّرَة کے مقابلہ میں بَرَرَة فرمایا ہے کیونکہ مُطَهَّرَة کے معنی ہیں جس میں طہارت کے سب سامان ہوں اور بَرَرَة کے معنی بھی یہی ہیں کہ جن میں سب اصول خیر ہوں۔پس کتاب کی تینوں صفات کے مقابلہ میں ویسی ہی تین صفات والے انسانوں کا ذکر کیا جو اس کی حفاظت کریں گے۔

اللہ اللہ!! کیسا زبردست دعویٰ ہے اور کس طرح اس دعویٰ کو زبردست طاقتوں سے پورا کیا گیا ہے۔سب سے پہلا قدم غلطی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اُٹھنے لگا تھا جب کہ آپؐ کی وفات میں شبہ پیدا ہو گیا اور گویا آپ کو خدائی کا مقام ملنے لگا تھا مگر خدا تعالیٰ نے سورۃ نور کی آیت استخلاف کے ماتحت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر کے یہ اختلاف دور کر دیا۔انہوں نے قرآن کریم ہی کی یہ آیت پیش کی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ [۸۲] اور

اس طرح پیش کی کہ اس اختلاف کے بانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے نہ رہ سکے اور گر گئے مگر غور کر کے دیکھو کہ مسیح کے بعد کیا ہوا۔ ابھی وہ زندہ ہی تھے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد بگاڑ شروع ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ کی بھی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ سے لوگ شرک کرنے لگے وہاں حضرت ہارونؑ جیسے اور مسیحؑ کے وقت پطرس جیسے لوگ کچھ نہ کر سکے اور حواریوں کی موجودگی میں گمراہی شروع ہو گئی گو حواری خدا تعالیٰ کے فضل سے محفوظ تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ان کی تعریف آئی ہے اور شرک بھی بہت بعد جا کر پھیلا ہے لیکن خرابی شروع ہو گئی تھی جو اباحت کے رنگ میں تھی۔

اس کے بعد جس جس زمانہ میں تغیر ہوا اس کی اصلاح ہو گئی اور ہمیشہ امت محمدیہ میں ایسے انسان پیدا کئے جاتے رہے جو قرآن کریم کے ذریعہ ہر قسم کے اختلافات کو دُور کرتے رہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کی حالت بدلتی چلی گئی اور اصلاح کرنے والے کوئی پیدا نہ ہوئے۔ اس آخری زمانہ میں ہی دیکھ لو کہ کس طرح اسلام کو پھر خدا تعالیٰ اپنی اصل حالت پر لے آیا ہے اور قرآن کریم کس طرح اپنے اصلی مفہوم پر قائم ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جتنی خرابیاں قرآن کریم کی غلط تفسیریں کرنے کی وجہ سے پیدا ہو چکی تھیں انہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آ کر دور کر دیا اور قرآن کریم کو اسی طرح اجلا کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا جیسے رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں تھا۔

حفاظت قرآن کا دائمی وعدہ

پس قرآن کریم کی دائمی حفاظت کا جو وعدہ خدا تعالیٰ نے کیا وہ پورا ہوا اور کوئی شخص آج تک نہ ظاہری طور پر قرآن کو بگاڑ سکا اور نہ باطنی طور پر اور جب آج تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوتا رہا ہے تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے خود بتا دیا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ [87] آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنے احسان کو پورا کر دیا ہے۔ پس جب مکمل دین آ گیا اور نعمت کامل ہو گئی تو اب اور کسی دین کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اب جو بھی مامور آئے گا اسی کی تائید میں آئے گا اور اس وجہ سے قرآن قیامت تک بگڑ نہیں سکے گا۔ اگر قرآن کو کوئی بدل سکتا ہے تو خدا ہی بدل سکتا ہے لیکن خدا نے اپنے

متعلق بتا دیا کہ قرآن کو بالکل مکمل کر دیا گیا ہے اور انسانوں کے بدل نہ سکنے کے متعلق ہر قسم کی حفاظت کے سامان کر دیئے گئے ہیں۔ پس اب قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

دوستوں کو ایک نصیحت

میں دوستوں کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب سے ریل جاری ہوئی ہے ایک نقص پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ ادھر جلسہ کے آخری دن لیکچر ختم ہوا ادھر سب لوگ واپس جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ جنہیں مجبوری ہو رخصت ختم ہو چکی ہو وہ تو جا سکتے ہیں لیکن جو ٹھہر سکتے ہوں انہیں ضرور ٹھہرنا چاہئے۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سارے سال میں جلسہ کے موقع پر ہی آنے کا اتفاق ہوتا ہے انہیں چاہئے کہ جلسہ کے ختم ہونے کے بعد بھی ٹھہرا کریں۔ یہاں کی مسجدوں میں دُعائیں کریں۔ یہاں کے لوگوں سے ملاقات کریں۔ یہاں کا کاروبار دیکھیں۔ بہشتی مقبرہ میں جو لوگ دفن ہیں ان کے لئے دُعائیں کریں۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ جلسہ کامیاب کیا ہے اسی طرح وہ آئندہ بھی ہمیں کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۱؎ عبس:۲ تا ۱۷

۲؎ البقرۃ:۱۳۲

۳؎ براہین احمدیہ چہار حصص۔ روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۱۲۹

۴؎ اشتہار بعنوان ہم اور ہماری کتاب۔ براہین احمدیہ چہار حصص جلد ۱ صفحہ ۶۷۳

۵؎ دیباچہ براہین احمدیہ حصہ پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۶

۶؎ متی باب ۱۹ آیت ۲۳، ۲۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۷؎ متی باب ۱۹ آیت ۲۱ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۸؎ متی باب ۶ آیت ۳، ۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۹؎ متی باب ۶ آیت ۳ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۱۰ The Hymns of the Atharra-Veda, Vol, II P.120 Book XII Hymn IV Benares, Published 1917.

۱۱ بنی اسرائیل:۳۰،۳۱

۱۲تا۱۵ اقرب الموارد جلد ا صفحہ ۱۹۰ زیر لفظ "حسر" مطبوعہ بیروت ۱۸۹۹ء

۱۶ الفرقان:۶۸

۱۷ تذکرۃ الاولیاء

۱۸ مسلم کتاب الصیام باب جواز الصوم والفطر فی شھر رمضان للمسافر

۱۹ بنی اسرائیل:۲۷،۲۸

۲۰ البقرۃ:۲۷۵ ۲۱ البقرۃ:۲۷۲

۲۲ بخاری کتاب الجمعۃ باب الجمعۃ فی القری والمدن

۲۳ البقرۃ:۱۱۱ ۲۴ البقرۃ:۱۰۳

۲۵ ترمذی کتاب المناقب مناقب ابی بکر الصدیق

۲۶ البقرۃ:۱۹۶ ۲۷ البقرۃ:۲۱۶

۲۸ المعارج:۲۵،۲۶ ۲۹ الذّٰریت:۲۰

۳۰ الجاثیۃ:۱۴ ۳۱ البقرۃ:۲۶۶

۳۲ النحل:۹۱ ۳۳ بنی اسرائیل:۲۹

۳۴ الضحٰی:۱۱ ۳۵ البقرۃ:۴

۳۶ الانعام:۱۴۲ ۳۷ البقرۃ:۲۶۸

۳۸ آل عمران:۱۳۵ ۳۹ التوبۃ:۶۰

۴۰ الممتحنۃ:۹ ۴۱ النور:۲۳

۴۲ التوبۃ:۱۰۳ ۴۳ البقرۃ:۲۶۵

۴۴ البقرۃ:۲۷۷ ۴۵ البقرۃ:۲۷۴

۴۶ متی باب ۱۹ آیت ۱۰ تا ۱۲ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۴۷ کرنتھیوں ا-باب ۷ آیت ۲، ۳ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء
۴۸ کرنتھیوں ا-باب ۷ آیت ۸ تا ۹ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء
۴۹ پیدائش باب ۲ آیت ۲۱ تا ۲۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء
۵۰ النساء:۲ ۵۱ الذّٰریت:۵۰
۵۲ النبا:۹ ۵۳ النحل:۷۳
۵۴ الشورٰی:۱۲ ۵۵ الاعراف:۱۹۰
۵۶ الروم:۲۲ ۵۷ الاعراف:۱۷۳
۵۸ الجامع الصغیر للسیوطی جلد ا صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ مصر ۱۳۰۶ھ + مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۲۸ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء
۵۹ البقرۃ:۱۸۸ ۶۰ نوح:۱۴ ۶۱ نوح:۱۵
۶۲، ۶۳ عوارف المعارف مؤلفہ حضرت شہاب الدین سہروردی صفحہ ۴۵، ۴۶
احیاء علوم الدین للغزالی صفحہ ۴۷۔ مطبوعہ بیروت ۱۴۰۴ھ
۶۴ بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ آل عمران زیر آیت انی اعیذھا بک۔۔۔
۶۵ المائدۃ:۵۵ ۶۶ البقرۃ:۱۶۶
۶۷ البقرۃ:۲۲۴ ۶۸ الحجر:۲
۶۹ الحجر:۸ ۷۰ الحجر:۹
۷۱ الحجر:۱۱ تا ۱۴ ۷۲ الحجر:۱۵ تا ۱۹
۷۳ الواقعۃ:۸۰ ۷۴ الجن:۹، ۱۰
۷۵ الانعام:۷ ۷۶ البیّنۃ:۲ تا ۴
۷۷ السجدۃ:۶
۷۸ ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی آیۃ الکرسی
۷۹ درمنثور جلد ا صفحہ ۳۲۵, ۳۲۶
۸۰ بخاری کتاب فضائل القرآن باب فضل البقرۃ

۸۱ اخبار نور افشاں ۲۸ نومبر ۱۹۳۰ء

۸۲ The Life of Mahomet by William Muir P.555 Published in London 1877.

۸۳ The Life of Mahomet by William Muir P.561 Published in London 1877.

۸۴،۸۵ The Life of Mahomet by William Muir P.559 Published in London 1877.

۸۶ آل عمران:۱۴۵ ۸۷ المائدة:۴

فضائل القرآن

نمبر......۴

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانیؓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

فضائل القرآن

(نمبر...... ۴)

تمام کُتبِ الہامیہ میں سے صرف قرآن کریم کو ہی کلام اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے

قرآن کریم کی کتبِ سابقہ پر فضیلت کی آٹھویں دلیل

(فرمودہ ۲۸ ؍دسمبر ۱۹۳۱ء برموقعہ جلسہ سالانہ قادیان دارالامان)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

جس مضمون کے متعلق مَیں نے اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا کل اعلان کیا تھا وہ وہی مضمون ہے جس کے متعلق پچھلے تین سال سے مَیں تقریر کر رہا ہوں۔ اور جو فضائل القرآن کا مضمون ہے۔ یعنی قرآن کریم کو وہ کون سی فضیلتیں حاصل ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف انسانی بلکہ آسمانی کتابوں پر بھی وہ فوقیت رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی مضمون براہین احمدیہ

میں شروع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ تین سو دلائل اس کے متعلق پیش کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق غور کیا ہے اور غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعہ میں تین سو دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بتائے ہوئے علوم اور آپ کے لائے ہوئے نور سے مستفیض ہو کر براہین احمدیہ کی اپنے فہم اور اپنے درجہ کے مطابق تشریح کی جا سکتی ہے۔

تفسیر القرآن کا دیباچہ

براہین احمدیہ میرے نزدیک تفسیر القرآن کا دیباچہ ہے۔ تفسیر القرآن لکھتے وقت پہلے جن مضامین پر سیر کُن بحث کرنی چاہئے انہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ میں شروع کیا تھا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اس کی ظاہری تکمیل بھی ہو جائے۔ باطنی تکمیل تو اللہ تعالیٰ نے کر دی تین سو دلائل چھوڑ کئی لاکھ آسمانی دلائل آپ نے پیش کر دیئے۔ لیکن جب آسمانی دلائل پیش ہو چکے تو ان ظاہری دلائل کو بھی پیش کر دینا سلسلہ کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو وہ براہین احمدیہ کا ظاہری مقصد بھی پورا کر دے۔

میں نے پہلے کچھ تمہیدی ریمارکس اس مضمون کے متعلق ۱۹۲۸ء میں بیان کئے تھے اور ۱۹۲۹-۱۹۳۰ء کی تقریروں میں چھ دلیلیں قرآن کریم کی افضلیت کے متعلق بیان کی تھیں اور ۱۹۳۰ء کے جلسہ کے موقع پر ساتویں دلیل بیان کرنے سے پہلے ہی لمبا وقت ہو گیا تھا اور ادھر مجھے ضعف ہونے لگ گیا تھا۔ اس وجہ سے اس تقریر کو جلد ختم کر دینا پڑا۔ اس ساتویں دلیل کا ایک حصہ ابھی باقی تھا۔ اب میں اسے بیان کروں گا اور اس کے بعد آٹھویں دلیل شروع کروں گا۔

ساتویں دلیل کا بقیہ حصہ

میں اس مضمون پر پچھلے سال بیان کر رہا تھا کہ قرآن کریم نہ صرف اس لحاظ سے محفوظ ہے کہ کوئی انسانی ملاوٹ اس میں نہیں ہوئی بلکہ کوئی انسانی ملاوٹ اس میں ہو بھی نہیں سکتی۔ گویا قرآن کریم کو یہی فضیلت حاصل نہیں کہ باقی آسمانی کتابوں میں انسانی تصرّف ہو چکا ہے مگر اس میں نہیں ہوا بلکہ اس کی یہ بھی فضیلت ہے کہ دوسری کتابوں میں انسانی تصرف ممکن ہے مگر قرآن میں ممکن بھی

نہیں۔ میں نے اس کے دو ثبوت پچھلے سال بیان کئے تھے اب میں تیسرا ثبوت اس امر کا کہ قرآن کریم میں تبدیلی نہیں ہوسکتی بیان کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کلام اللہ ہے اور کلام اللہ میں عقلاً انسانی تبدیلی ناممکن ہے۔ شاید اکثر لوگ حیران ہوں کہ کلام اللہ تو باقی کتابیں بھی ہیں۔ پھر قرآن کو یہ خصوصیت کس طرح حاصل ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی وہ بھی کلام اللہ تھی۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء پر بھی خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوا۔ جب وہ بھی کلام اللہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ان میں تو نہ صرف تبدیلی ہوسکتی ہے بلکہ ہوئی اور قرآن میں نہ ہوئی بلکہ نہیں ہوسکتی۔ ایک ہی چیز میں یہ فرق کیوں ہے؟

میں ابھی بتاؤں گا کہ یہ حیرت درحقیقت درست نہیں اور یہ قرآن کریم کی افضلیت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ یہ کلام اللہ ہے۔ اس وجہ سے قرآن نہ صرف غیر الہامی کتب سے افضل ہے یا الہامی کتب کی موجودہ شکل سے ممتاز ہے۔ بلکہ یہ اس کی ایسی فضیلت ہے کہ اس میں کبھی بھی کوئی کتاب اس کی شریک نہیں ہوئی۔

پہلی الہامی کتب کلام اللہ نہیں تھی

یہ ایک غلط خیال ہے کہ پہلی الہامی کتب بھی کلام اللہ تھیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ توریت کلام اللہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی۔ وہ بھی کلام اللہ نہ تھی۔ اسی طرح میرا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ انجیل کلام اللہ نہیں۔ یہ تو حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہی نہیں ہوئی مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت مسیح پر جو انجیل نازل ہوئی وہ موجود ہوتی تو بھی ہم یہی کہتے کہ وہ کلام اللہ نہیں۔ وہ کتاب اللہ تھی وہ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَسِيْحِ تھی مگر کلام اللہ نہ تھی۔ اسی طرح اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحف آج موجود ہوتے اور اگر حضرت نوح علیہ السلام کے صحف آج موجود ہوتے اور اگر ایک لفظ بھی ان میں کسی انسان کا داخل نہ ہوتا تب بھی وہ کلام اللہ نہ ہوتے۔ ہاں کتاب اللہ ہوتے۔ قرآن کریم میں کلام اللہ کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے اور تینوں جگہ قرآن کے متعلق ہی استعمال ہوا ہے اور قرآن ہی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کلام اللہ ہے۔

اوّل سورۃ توبہ رکوع اوّل میں آتا ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ

فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ[1] خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے رسول! اگر مشرکوں میں سے کوئی شخص تجھ سے پناہ مانگے تو تُو اُسے پناہ دے۔ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ یہاں تک کہ تیری صحبت میں رہ کر وہ کلام اللہ سن لے۔ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ پھر اسے امن کی جگہ پہنچا دو۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ وہ قوم دین کا علم نہیں رکھتی اور جب تک علم دین حاصل نہ کرے گی کس طرح دین سیکھ سکے گی۔ گو کفار کے ساتھ لڑائی ہے۔ وہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور جنگ کی حالت میں غیر کو مارنے کا تمہیں حق حاصل ہے لیکن چونکہ تم مذہبی پیشوا ہو اس لئے ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ حکومتوں کے دستور کے خلاف اگر کوئی غیر قوم کا فرد تمہارے پاس آئے اور کلام اللہ سننا چاہے تو اُسے سناؤ۔ اگر وہ نہ مانے اور واپس جانا چاہے تو اسے واپس پہنچا دو اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ[2] فرمایا۔ اے مسلمانو! کیا تم اس بات کی امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری باتیں مان لیں گے۔ بعض صحابہؓ سمجھتے تھے کہ یہود ہماری باتیں مان لیں گے۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کی دوستیاں تھیں، تعلقات تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا تمہاری ایسی دوستی ہے کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک جماعت آتی ہے۔ قرآن سنتی ہے۔ پھر يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس کا مفہوم سمجھنے کے بعد اور بات بنا لیتی ہے جو جھوٹ ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ لوگ جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جب قرآن کے متعلق ان کا یہ حال ہے تو تمہاری باتیں کہاں مان سکتے ہیں۔

بعض نے یہاں کلام اللہ سے تورات مراد لی ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون سے ایسے یہودی علماء تھے کہ جن کی تحریف کوئی اثر رکھتی تھی۔ معمولی درجہ کے لوگ تھے۔ اگر کوئی سردار تھا تو محلّہ کے سردار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے مدینہ کے یہود کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ اگر وہ تورات کو بدل کر پیش کریں گے تو لوگ مان لیں گے۔ وہ یہی کرتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آتے۔ قرآن کریم سنتے اور پھر بالکل جھوٹی باتیں جا کر بیان کرتے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قادیان کے متعلق لوگ غلط بیانیاں کرتے تھے۔

فیروز پور کے علاقہ کے ایک شخص نے دوسروں سے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ قادیان گیا تو مجھے مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہمارے پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے حلوہ بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سب مہمانوں کو کھلا دو۔ باقی سب مہمانوں نے تو کھالیا لیکن میں نے موقع پا کر پھینک دیا۔ کچھ دیر بعد مرزا صاحب مجھے ساتھ لے کر فٹن میں سیر کو نکلے۔ (اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ قادیان آیا ہی نہیں تھا) رستہ میں مجھ سے باتیں کرتے رہے اور کہا میں ہی خدا ہوں۔ یہ سن کر میں نے لَا حَوْلَ پڑھا۔ اِس پر ان کا رنگ فق ہو گیا اور مولوی نور الدین صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگے کیا اسے حلوہ نہیں کھلایا تھا؟ مولوی صاحب کا بھی رنگ اُڑ گیا اور انہوں نے کہا میں نے تو حلوہ بھیج دیا تھا۔ نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ جس مجلس میں اس نے یہ بات سنائی۔ اسی میں ایک معزز غیر احمدی بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا۔ یہ شخص بڑا ہی جھوٹا ہے۔ میں خود قادیان سے ہو آیا ہوں اور یہ وہاں گیا ہی نہیں۔ وہاں تو یکّہ چلنا بھی مشکل ہے۔ فٹن اس کا باپ وہاں لے گیا تھا؟ اسی طرح وہ لوگ کرتے۔ کلام سنتے اور پھر کچھ کا کچھ جا کر دوسروں سے بیان کرتے۔ اس بات کا ثبوت کہ یہ انہی کے متعلق ہے یہ ہے کہ اگلی آیت میں آتا ہے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ [۳] وہ مسلمانوں کے پاس آکر کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریف کرنے والے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لوگ تھے جو قرآن سن کر دوسروں کے سامنے جھوٹ بولتے اور کہتے کہ اس نے یوں کہا ہے، ووں کہا ہے۔ پھر اس جگہ فرماتا ہے۔ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ کلام اللہ سنتے ہیں مگر یہودی کوئی کتاب نہیں سنتے تھے بلکہ پڑھتے تھے اور اس میں فقرے داخل کرنے والا سن کر نہیں بلکہ پڑھ کر داخل کر سکتا ہے۔ اگر بائبل مراد ہوتی تو یَقْرَءُوْنَ آتا کیونکہ بائبل تو وہ لوگ پڑھا کرتے تھے۔ پس یہاں تورات کا نہیں بلکہ قرآن کا ذکر ہے اور مراد یہ ہے کہ مسلمانوں سے سن کر اور سمجھ کر ایسے رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ لوگ مخالفت میں بڑھیں۔

تیسری آیت سورۃ فتح رکوع ۲ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ

اللہ؎ فرمایا وہ لوگ جن کو پیچھے چھوڑا گیا ہے۔ جب تم جنگ کو جاتے ہو اور وہ سمجھتے ہیں کہ فتوحات حاصل ہونگی اور غنیمتیں ملیں گی تو کہتے ہیں ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح خدا کے کلام کو بدل دیں۔ اگر تم ان کو ساتھ لے جاؤ گے تو وہ کہیں گے دیکھو انہوں نے خدا کے کلام کو بدل دیا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ یہ نہیں جائیں گے اور اگر نہ لے جاؤ گے تو کہیں گے یہ حریص ہیں۔ سب کچھ خود ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

غرض قرآن میں کَلَامَ اللہِ کا لفظ تین جگہ آیا ہے اور تینوں جگہ قرآن کریم کے متعلق ہی استعمال ہوا ہے۔ کسی اور کتاب کے متعلق نہیں۔ اس لئے عقلاً یہی کہا جائے گا کہ قرآن ہی کَلَامَ اللہِ ہے اور ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم بلا دلیل یہ خیال کریں کہ قرآن کریم کے سوا کوئی اور آسمانی کتاب بھی کلام اللہ کے نام کی مستحق ہے۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی کتاب کا نام کلام اللہ نہیں رکھا گیا پھر اس کو ہم کلام اللہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ میں آئندہ ثابت کروں گا کہ تاریخاً بھی ان میں سے کوئی کتاب کلام اللہ نہیں۔

قرآن کریم میں انبیاء کو کلمہ کہا گیا ہے۔ الہامات کو کلمات کہا گیا ہے بلکہ کلمات اللہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا؎ موسیٰؑ سے خدا نے خوب اچھی طرح کلام کیا لیکن باوجود اس کے حضرت موسیٰؑ کی کتاب جس کا بہت سی جگہ قرآن کریم میں ذکر آیا ہے اسے کلام اللہ نہیں کہا گیا۔ جیسا کہ فرمایا نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ؎ یعنی وہ لوگ جن کو کتاب اللہ دی گئی تھی انہوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے ڈال دیا گویا کہ انہیں علم ہی نہیں۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق ہے۔ کتاب اللہ ہر اس کتاب کو جس میں خدا کی باتیں ہوں کہا جا سکتا ہے لیکن کلام اللہ ہر ایک کو نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری الہامی کتابوں کو کتاب اللہ کہا گیا ہے اور کتاب اللہ کا لفظ قرآن کے متعلق بھی موجود ہے مگر دوسرا لفظ کلام اللہ صرف قرآن کے لئے استعمال کیا گیا ہے کسی اور کے لئے نہیں۔ یہ فرق ہے اور یہ بغیر حکمت کے نہیں۔

وحی الٰہی کی مختلف اقسام

اس فرق کو سمجھنے کے لئے یاد رکھنا چاہئے کہ انبیاء کی وحی کئی قسم کی ہوتی ہے۔(۱) ایک وہ وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں کانوں میں پڑتی ہے اور زبان پر جاری ہوتی ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو سنایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؎ ۔ یہ الفاظ کان میں آواز کے طور پر پڑے اور زبان پر جاری ہوئے۔ اس آیت کا ا، ل، ح، م، د اور ان کی اعراب سب خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے ایک مضمون رسول کریم ﷺ کے دل میں ڈال دیا بلکہ ہر حرف اور ہر لفظ خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ یہ وحی سب انبیاء پر نازل ہوئی۔

(۲) دوسری وحی رؤیا اور کشوف ہیں۔ یہ الفاظ میں نہیں بلکہ نظاروں میں ہوتی ہے۔ مثلاً رسول کریم ﷺ جب اُحد کی جنگ میں تشریف لے جانے لگے تو آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کی تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے اور دیکھا کہ ایک گائے ذبح کی جارہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تلوار کی شکستگی سے مراد فتح ہے جو مشتبہ ہوگی اور گائے کے ذبح ہونے سے مراد یہ ہے کہ کچھ احباب شہید ہونگے۔ یہ وحی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے تھی مگر فرق یہ ہے کہ پہلی وحی الفاظ میں تھی اور یہ نظارہ میں ہے اور نظارہ بیان کرتے وقت اپنے الفاظ بیان کرنے پڑتے ہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ اس بیان میں کچھ اونچ نیچ ہوجائے۔

(۳) تیسری وحی خفی ہوتی ہے جو الفاظ میں نازل نہیں ہوتی نہ نظارہ دکھایا جاتا ہے بلکہ تفہیم اور انکشاف کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ دل میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی دل میں ڈالا جاتا ہے کہ یہ تمہارا خیال نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور الفاظ اس کو خود بنانے پڑتے ہیں۔ یہ سب سے ادنیٰ درجہ کی وحی ہے۔ اس سے بڑھ کر رؤیا اور کشف کی وحی ہوتی ہے مگر اس میں تاویل کی ضرورت ہوتی ہے اور تاویل میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے لیکن پہلی وحی جو الفاظ میں ہوتی ہے اس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ یہ سب اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔

اب اگر ایک نبی اپنی تمام وحی کو ایک کتاب میں جمع کردے جس میں وحی کلام بھی ہو۔ اور وحی کشف و رؤیا بھی ہو اور وحی خفی بھی نبی کے اپنے الفاظ میں ہو تو اسے ہم کتاب اللہ تو کہہ سکتے ہیں

لیکن ہم اسے کلام اللہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ سب کی سب کلام اللہ نہیں بلکہ اس میں ایک حد تک کلام بشر بھی ہے گو مضمون سب کا سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس وجہ سے وہ کتاب کتاب اللہ ہے۔

اب اس فرق کو مدنظر رکھ کر دیکھ لو۔ دنیا کی کوئی کتاب خواہ کسی قوم کی ہو اور کس قدر ہی شدّ و مدّ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہو کلام اللہ نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک بھی ایسی کتاب نہیں نہ موجودہ صورت میں اور نہ اس صورت میں جس طرح کسی نبی نے دی تھی کہ اس کے تمام کے تمام الفاظ خدا تعالیٰ کے ہوں۔ اس میں بعض الفاظ خدا تعالیٰ کے ہونگے بعض نظارے ہونگے اور بعض مفہوم بیان کئے گئے ہونگے۔ اگر آج ہم تورات سے ان زوائد کو نکال دیں جو یہودیوں نے اپنی طرف سے ملا دیئے ہیں۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ۔

''سو خداوند کا بندہ موسیٰؑ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔'' ☆ [ے]

تب بھی تورات کلام اللہ نہ ہوگی کیونکہ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ۔

''اس وقت خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں آگ کے شعلے میں اس پر ظاہر ہوا۔ اس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا۔'' [۸]

یہی حال حضرت عیسیٰؑ اور باقی انبیاءؑ کی کتابوں کا ہے۔ پس اگر ان کتب میں سے ہم ان زوائد کو نکال بھی دیں جو بعد میں لوگوں نے داخل کر دیئے ہیں تو بھی حضرت موسیٰؑ کی کتاب اس وقت جب کہ حضرت موسیٰؑ نے اسے ترتیب دیا اور حضرت عیسیٰؑ کی کتاب اس وقت جب کہ حضرت عیسیٰؑ نے اسے بیان کیا اور وید جب کہ وہ نازل ہوئے کلام اللہ نہ تھے۔ اگر دوسروں کی باتیں ان میں نہ تھیں تو رسولوں کی اپنی باتیں تو ضرور تھیں۔ غرض اپنی سلامتی کے زمانہ میں بھی وہ کلام اللہ نہیں تھیں۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ کیا فضیلت ہے۔ اگر حضرت موسیٰؑ چاہتے تو وہ بھی کلام اللہ کو الگ جمع کر سکتے تھے۔ اگر تورات سے حضرت موسیٰؑ کا کلام اور انجیل سے حضرت عیسیٰؑ کا کلام نکال لیا جائے تو کیا یہ کتابیں قرآن کریم کے برابر ہو جائیں گی؟ میں کہوں گا نہیں کیونکہ اگر حضرت موسیٰؑ ایسا کر سکتے تو کیوں نہ کر دیتے۔ اگر حضرت موسیٰؑ کے لئے ممکن ہوتا کہ الفاظ والی وحی کو الگ کر کے کتاب بنا

دیتے تو کیوں نہ کر دیتے؟ اسی طرح اگر حضرت عیسیٰؑ کے لئے ممکن ہوتا تو وہ بھی کیوں نہ کر دیتے۔ یہ فضیلت صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہے کہ ساری کی ساری شریعت آپؐ کو وحی کے الفاظ میں عطا ہوئی۔ باقی سب انبیاء کی کتب میں کچھ کلامِ الٰہی تھا کچھ نظارے تھے اور کچھ مفہوم جسے انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ اگر وہ نظاروں اور مفہوم کے حصّہ کو علیحدہ کر دیتے تو ان کی کتابیں نامکمل ہو جاتیں کیونکہ ان کا سارا دین کلامُ اللہ میں محصور نہیں۔ کچھ رؤیا اور کشوف ہیں اور کچھ وحی خفی کے ذریعہ سے تھا۔ اگر وہ کلامُ اللہ کو الگ کرتے تو ان کا دین ناقص رہ جاتا۔ برخلاف اس کے قرآن کریم میں سب دین آ گیا ہے اور کلام اللہ میں ہی سب دین محصور ہے۔ پس قرآن کے سوا اور کسی نبی کی کتاب کا نام کلامُ اللہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نام صرف قرآن کریم کا ہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اکمل بنانا تھا اسلام کو اکمل دین اور قرآن کو آخری کلام بنانا تھا اس لئے ضروری تھا کہ اسے ایسا محفوظ بناتا کہ کوئی مطلب فوت نہ ہو اور اس کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ عالم الغیب خدا کے الفاظ میں سب کچھ بیان ہو۔ رؤیا اور کشوف میں جھگڑے اور اختلاف پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے شریعت اسلامیہ کو خدا تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں اُتار کر اس کا نام کلام اللہ رکھا اور کہہ دیا کہ اس کے سب الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے سوا اور کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے الفاظ سے نئے نئے مضامین نکلتے چلے آئیں۔ صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس کے مطالب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ رات دن قرآن کریم کو پڑھو۔ قرآن کے حقائق کبھی ختم نہ ہونگے۔ اس کی حکمتیں نکلتی چلی آتی ہیں اور ہر لفظ پُرحکمت معلوم ہوتا ہے۔ پُرانے زمانہ کی کہانیوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک تھیلی ہوتی تھی جس میں سے ہر قسم کے کھانے نکلتے آتے تھے مگر یہ تو وہمی اور خیالی بات تھی۔ قرآن کریم واقع میں ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ دوسری کتب میں یہ بات نہیں۔ مثلاً مسیحی وغیرہ خود اقرار کرتے ہیں کہ اصل عبارتوں میں غلطیاں ہو گئی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء پر کلام اللہ نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ہے کہ ان کا سب دین اور سب کتاب کلام اللہ میں محصور نہ ہوتے تھے۔

پہلی کتب میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتب کے بگڑنے کا موجب بھی یہی ہوا کہ وہ کلام اللہ نہ تھیں۔ چونکہ ان میں خود انبیاء کی تشریحات اور رؤیا اور کشوف اور تفہیمات ان کے الفاظ میں ہوتے تھے اس لئے لوگوں کے دلوں میں حفاظت کا اس قدر گہرا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ کے صحابیوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ پر وحی ہوئی جو انہوں نے لکھوا دی اور ساتھ ہی اپنا رؤیا اور کشف بھی لکھا دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھوا دیا کہ مجھے یہ خیال آیا جو الہامی خیال ہے تو ایسی باتوں سے ان کو جرأت ہوئی کہ جو بات توریت سے انہیں سوجھتی اسے بھی اس میں داخل کر دیتے اور وہ خیال کرتے کہ اگر ہم نے اپنی تفہیم بطور یادداشت لکھ دی تو کیا حرج ہوا اور چونکہ ہر شخص اپنی تفہیم کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اسے خدائی امر ہی سمجھتے تھے۔ اس طرح وہ کتب بگڑ گئیں۔ حالانکہ اگر وہ سمجھتے تو نبی کی تفہیم الہامی ہونے کی وجہ سے کتاب کا حصہ تھی مگر ان کی نہیں بلکہ اگر کسی دوسرے کی الہامی تفہیم بھی ہو تب بھی وہ پہلے نبی کی تفہیم کی طرح اس کتاب کا حصہ نہیں کہلا سکتی۔ اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے دیکھا کہ جب وہ آپ کے پاس آتے تو آپ فرماتے۔ آج خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی ہوئی ہے۔ صحابہؓ کہتے لکھ لیں۔ آپ فرماتے لکھ لیا جائے۔ پھر فرماتے یہ کشف ہوا ہے یہ رؤیا تھی۔ آپؐ اس کا مفہوم بیان فرماتے اور کہتے یہ وحی میں نہ لکھا جائے۔ جب صحابہؓ دیکھتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی وحی میں کچھ نہیں بڑھا سکتے تو وہ سمجھتے کہ ہم کس طرح اس میں کچھ داخل کر سکتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے تو الگ رہا خدا تعالیٰ کی دوسری وحی کو جو رؤیا اور کشف کی شکل میں ہوتی یا جس کے ذریعہ کوئی مفہوم دل میں ڈالا جاتا وہ بھی اس میں شامل نہ کرتے تو ہم کس طرح اس وحی میں کچھ شامل کر سکتے ہیں لیکن پہلے انبیاء چونکہ اپنی تشریحات، رؤیا، کشوف اور تفہیمات اپنے الفاظ میں درج کرتے تھے اس لئے ان کے پیرووں کو اپنی تفہیمات درج کر دینے کی بھی جرأت ہوگئی۔

محققینِ بائیبل کا بھی یہی خیال ہے کہ صحفِ قدیمہ میں جو اضافہ ہوا، وہ اس طرح ہوا کہ جو بات کسی کو سوجھی وہ اس نے اس میں لکھ دی لیکن قرآن کریم چونکہ خالص کلام اللہ ہے۔ رسول

کریم ﷺ اپنے دوسرے الہامات یا کشوف یا رؤیا یا تفہیم اس میں داخل ہی نہ کرتے تھے جس کا اثر صحابہؓ پر گہرا پڑا اور وہ محسوس کرتے تھے کہ اس کتاب میں کوئی اور بات نہیں ہونی چاہئے حتّٰی کہ طرزِ تحریر اور وقف تک کو انہوں نے محفوظ رکھا اور اس طرح بوجہ کلام اللہ ہونے کے قرآن کریم ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

یہ امر کہ قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا اثر اس کے تبدیل نہ ہونے پر خاص طور پر پڑا ہے مخالفوں تک نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے۔

A similar guarantee existed in the feelings of the people at large, in whose soul no principle was more deeply rooted than an awful reverence for the supposed word of God.[9]

یعنی قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی یہ بھی گارنٹی ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں یہ بات نقش تھی کہ قرآن کا ہر شوشہ اور ہر لفظ خدا کی طرف سے ہے۔

دوسرا فائدہ کلام اللہ کے اس طرح جمع کرنے کا یہ ہوا کہ اس میں تاریخ اور تفہیم آ ہی نہیں سکتی۔ مثلاً قرآن میں یہ نہیں لکھا۔ کہ میں فلاں جگہ گیا اور وہاں یہ الہام ہوا بلکہ اس کی عبارت اس طرح چلتی ہے کہ ہر لفظ بتاتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے بندہ اس میں کوئی اور کلام داخل ہی نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو بالکل بے جوڑ معلوم ہو گا لیکن پہلی کتب میں چونکہ تفہیم بھی درج تھی اس لئے کسی کا تفہیم کو درج کرنا غلطی کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

کلام اللہ کے نام میں منفرد کتاب صرف قرآن کریم ہے

غرض قرآن کریم کلام اللہ کے نام میں منفرد ہے۔ جس طرح کعبہ بیت اللہ کے نام میں دوسرے بیوت سے منفرد ہے۔ خدا تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو بیت اللہ قرار دیا ہے اور قرآن کو کلام اللہ قرار دیا ہے۔ کعبہ کو بھی یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے بنوایا تھا۔ اگر دوسرے مقامات کو بھی خدا تعالیٰ بنواتا تو وہ منسوخ نہ ہوتے۔ چونکہ دوسرے گھروں نے منسوخ ہونا تھا اس

لئے انہیں یہ نام نہ دیا گیا۔ اسی طرح قرآن کریم نے بھی چونکہ ہمیشہ قائم رہنا تھا، اسے بھی کلام اللہ کی صورت میں نازل کیا گیا اور اسے یہ نام دیا گیا تا کوئی اپنا کلام اس میں داخل نہ کر سکے۔

اگر کوئی کہے کہ آپ تو کہتے ہیں قرآن میں ساری شریعت موجود ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ قرآن بھی سنت اور حدیث کا محتاج ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سنّت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں جو باتیں آئی ہیں رسول کریم ﷺ نے ان پر عمل کر کے دکھا دیا اور احادیث رسول کریم ﷺ کی تفہیمات ہیں جو قرآن سے ہی حاصل ہوئیں کوئی زائد شئے نہیں۔ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى [1] کہ محمد رسول اللہ ﷺ دین کی کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ جو کچھ بتاتے ہیں وحی الٰہی سے بتاتے ہیں۔ پس حدیث میں جو کچھ ہے وہ قرآن ہی کی تشریح اور تفہیم ہے۔

قرآن کریم کی افضلیت کی آٹھویں دلیل

اب میں قرآن کریم کی فضیلت کی آٹھویں دلیل بیان کرتا ہوں جو یہ ہے کہ ہر کلام جو نازل ہوتا ہے، اس کی عظمت اور افضلیت اس لانے والے کے ساتھ بھی تعلق رکھتی ہے جس کے ذریعے وہ آتا ہے کیونکہ پیغامبر پیغام کی حیثیت سے بھیجے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بادشاہ جس نے اپنے کمرہ کی صفائی کرانی ہے وہ چوبدار سے کہے گا کہ صفائی کرنے والے کو بلاؤ لیکن اگر اسے یہ کہنا ہوگا کہ فلاں بادشاہ کو ملاقات کے لئے بلاؤ۔ تو چوبدار سے نہیں کہے گا بلکہ وزیر سے کہے گا اور وہ یہ پیغام پہنچائے گا کہ بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات کریں۔

غرض پیغام کی افضلیت پیغامبر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ سفراء جو بادشاہوں کے خطوط لے کر جاتے ہیں ان کے متعلق بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ بلند پایہ رکھنے والے ہوں۔

اسی طرح اعلیٰ درجہ کے کلام کو سمجھانے کے لئے اعلیٰ درجہ کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی کتاب علمی لحاظ سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہو تو اس کو پڑھانے والے کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہوگی۔ ایم۔اے کے طلباء کو پڑھانے والا معمولی قابلیت کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی جگہ کوئی پرائمری پاس پڑھانے کے لئے بھیجا جائے تو سمجھا جائے گا کہ ابتدائی قاعدہ پڑھایا جائے گا۔

اگر انٹرنس پاس بھیجا جاتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ چوتھی پانچویں جماعت کو پڑھائے گا۔ اگر گریجویٹ بھیجا جاتا ہے تو نویں دسویں کو پڑھائے گا اور اگر مشہور ڈگری یافتہ بھیجا جائے تو سمجھا جائے گا کہ بڑی جماعتوں کے لئے ہے۔ اسی طرح الہامی کتاب لانے والے کی شخصیت سے بھی کتاب کی افضلیت یا عدمِ افضلیت کا پتہ لگ جاتا ہے لیکن اگر خود کتاب ہی اس کی افضلیت ثابت کر دے تو یہ اور بھی اعلیٰ بات سمجھی جائے گی کہ اس نے اس شق میں بھی خود ہی ثبوت دے دیا اور کسی اور ثبوت کی محتاج نہ ہوئی۔ غرض چونکہ اس انسان کے چلن کا جس پر کتاب نازل ہوئی ہو کتاب کی اشاعت پر خاص اثر پڑتا ہے اس لئے وہی کتاب کامل ہو سکتی ہے جو اس کے کریکٹر کو نمایاں طور پر پیش کرے تاکہ لوگ اس کے منبع کی نسبت شبہ میں نہ رہیں۔ پس یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن کا منبع مشتبہ نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی زبان پر جاری ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ قرآن ثابت کرے کہ اس کے لانے والا ایک مقدس اور بے عیب انسان تھا کیونکہ جب تک یہ ثابت نہ ہو باوجود کتاب کے کامل و افضل ہونے کے انسان کے دل میں ایک شبہ رہتا ہے کہ نہ معلوم اس کا لانے والا کیسا انسان تھا اور دوسرا شبہ یہ رہتا ہے کہ نہ معلوم اس کتاب نے اس کے پہلے مخاطب پر کیا اثر کیا۔ اگر اس پر اچھا اثر نہیں کیا تو ہم پر کیا اثر کرے گی اور اگر اس نے اپنے پہلے مخاطب کو فائدہ نہیں پہنچایا تو ہمیں کیا پہنچا سکے گی۔ پس کتاب کی افضلیت پر بحث کرتے ہوئے ہمیں کتاب لانے والے کے اخلاق پر اور لانے والے کی افضلیت پر بحث کرتے ہوئے اس کے پیش کردہ خیالات پر ضرور بحث کرنی ہو گی۔

قرآن کریم کو یہ فضیلت بھی دوسری کتب پر حاصل ہے یعنی اس کا لانے والا انسان دوسرے انسانوں سے خواہ وہ کوئی ہوں افضل ہے اور مزید افضلیت یہ ہے کہ قرآن کریم اس دلیل کے محفوظ رکھنے میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہے۔ اس دلیل کو بھی خود اس نے ہی محفوظ کر دیا ہے یہاں تک کہ میور جیسا متعصب انسان بھی لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات کا بہترین منبع قرآن ہے۔[۱۱] اس موقع پر وہ حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن☆[۱۱] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق قرآن کو دیکھ لو۔ آپ کے تمام اخلاق قرآنی معیار کے مطابق تھے۔ پس قرآن کریم یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے کم از کم ایک شخص اپنے معیار کے مطابق پیدا کر لیا ہے اس لئے ہم اس کی تعلیم کے متعلق یہ شبہ نہیں کر سکتے کہ (۱) وہ قابلِ عمل نہیں (۲) یا یہ کہ

اس نے اپنے لانے والے کی اصلاح نہیں کی تو دوسروں کی کیا کرے گا؟ کیونکہ محمد ﷺ نے اس پر عمل کیا اور اعلیٰ درجہ کے انسان بن گئے۔ پس کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ قرآن نے لانے والے کو کیا فائدہ پہنچایا کہ ہمیں پہنچائے گا۔

میں نے جو یہ بتایا ہے کہ الہامی کتاب کی افضلیت کی یہ بھی دلیل ہے کہ اس کا لانے والا دوسروں سے افضل ہو یہ بھی قرآن خود ہی بیان کرتا ہے۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کی پہلی زندگی بھی پاک اور کامل ہونی چاہئے اور دعویٰ کے بعد کی زندگی بھی مطابق وحی ہونی چاہئے۔ پہلی زندگی کے متعلق خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَإِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ [12] فرمایا ان لوگوں کے سامنے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی نشان پیش کرتا ہے تو کہتے ہیں ہم کبھی نہیں مانیں گے جب تک ہمیں وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا یعنی وحی اور الہام۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا ہر ایک پر وحی رسالت نازل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسے رسول بنانا چاہئے۔ وہ اس کے احوال، اس کے افکار اور اس کے عادات دیکھتا ہے۔ جو سب سے اعلیٰ ہوا سے رسالت کا منصب دیتا ہے۔ تم جو یہ کہتے ہو کہ تمہیں بھی وہی کچھ ملنا چاہئے جو رسولوں کو ملتا ہے۔ کیا تم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے۔ تم تو گندے ہو اور گندوں کو ذلت ہی ملا کرتی ہے۔ رسالت تو بہت بڑی عزت ہے۔ یہ پاک اور اعلیٰ پایہ کے انسان کو ملتی ہے تم کو تو تمہارے مکروں کی وجہ سے عذاب ملے گا۔ اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔ وہ نیک کام کرتے وقت یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ اسی طرح ان سے سلوک کرتا ہے۔

اس میں بتایا کہ (۱) رسول بناتے وقت اللہ تعالیٰ اس آدمی کو دیکھتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ پس

مجرموں کو رسالت نہیں مل سکتی۔ انہیں تو ذلّت ملے گی۔ رسالت تو بڑی بھاری عزت ہے۔ (۲) جو رسول بنتا ہے وہ پہلے بھی اللہ کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ الٰہی احکام کی فرمانبرداری اس کی طبیعت میں داخل ہوتی ہے اور نیک تحریکوں کو قبول کرنے میں وہ پیش پیش ہوتا ہے۔

یہ گویا قرآن نے گر بتایا کہ انبیاء کی پہلی زندگی اعلیٰ ہونی چاہئے۔ بیشک ایک ایسا شخص ولی ہو سکتا ہے جو ایک زمانہ تک عیوب میں مبتلا رہا ہو اور بعد میں اس نے توبہ کر لی ہو لیکن نبوت کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہی خاص طور پر اعلیٰ درجہ کی طہارت اسے حاصل ہو۔ (۲) اور نبوت کی زندگی کے متعلق فرمایا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ [۱۳] جن لوگوں کو خدا کا قُرب حاصل ہوتا ہے۔ وہ رات دن اپنے اعمال سے دنیا کو بتاتے ہیں کہ خدا پاک ہے یعنی انہیں جس قدر قُرب عطا ہو، اسی قدر وہ فرمانبردار ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح اپنے ہر عمل سے ظاہر کرتے ہیں اور دنیا کو بتاتے ہیں کہ خدا نے یونہی انہیں نہیں چُنا۔ گویا وہ اپنے اعمال سے خدا تعالیٰ کی پاکیزگی ظاہر کرتے ہیں اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ خدا نے غلط انتخاب نہیں کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی پاکیزہ زندگی

اب سوال یہ ہے کہ کیا رسول کریم ﷺ کی ذات کے متعلق بھی اس عام قاعدہ کے پورا ہونے کا کہیں ذکر ہے؟ سو اس امر کے متعلق کہ رسول کریم ﷺ کی دعویٰ سے پہلی زندگی بالکل پاک اور بے عیب تھی۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ [۱۴] فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کہہ دے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ کتاب پڑھ کر تمہیں نہ سناتا یعنی اگر اللہ چاہتا تو کتاب ہی نہ بھیجتا اور نہ تمہیں اس تعلیم سے آگاہ کرتا۔ تمہیں علم ہے کہ میری زندگی کیسی پاکیزہ گذری ہے۔ معمولی عمر نہیں بلکہ چالیس سال کا لمبا عرصہ۔ تم اسے جانتے ہو اور اس پر کوئی عیب نہیں لگا سکتے۔ پھر کس طرح خیال کر سکتے ہو کہ اب میں نے جھوٹ بنا لیا۔ یہ پہلی زندگی کے متعلق رسول کریم ﷺ کا اعلان ہے اور کفار کے مقابلہ میں اعلان ہے جس کا وہ انکار نہیں کر

سکتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں خدا تعالیٰ کا قُرب

نبوت کی زندگی کے متعلق ہم قرآن کریم میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [۱۵] یہ رسول اس بات کا اعلیٰ نمونہ ہے کہ قرآن نے اس کی زندگی پر کیا اثر کیا اور یہ کسی ایک قوم یا ایک ملک کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے نمونہ ہے۔ جس کی انہیں پیروی کرنی چاہئے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ باقی انبیاء بھی ایسے ہی ہونگے۔ اس لئے قرآن کی ایک اور آیت میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ [۱۶] یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو ان سے کہہ دے (یہ الفاظ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتنی شانِ بلند کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے کہلواتا ہے تاکہ دنیا کے لئے ایک چیلنج ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک چیلنج دیا اور کہا ان سے کہو) اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو اور تمہارے دل میں تڑپ ہے کہ اس کے محبوب بن جاؤ تو آؤ میں تمہیں ایسا گر بتاؤں کہ تم عاشق ہو کر معشوق بن جاؤ اور وہ یہ ہے کہ فَاتَّبِعُوْنِيْ جس طرح میں کام کرتا ہوں تم بھی کرو۔ یہاں اَطِيْعُوْنِيْ نہیں فرمایا بلکہ فَاتَّبِعُوْنِيْ فرمایا ہے یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل کر رہے ہیں ویسے ہی تم بھی کرو۔ یہ نہیں فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حکم دیں اس کی تعمیل کرو۔ اس جگہ اتباع کا لفظ ہے جس کے معنی "قَفِيٌ اَثَرَهٗ" کے ہوتے ہے یعنی اس کے نقشِ قدم پر چلا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت کا لفظ تو آتا ہے مگر اتباع کا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ شرائع سے بالا ہے لیکن رسول کے لئے اتباع اور اطاعت دونوں الفاظ آتے ہیں یعنی وہ حکم بھی دیتا ہے اور ان پر خود بھی عمل کرتا ہے۔ پس فَاتَّبِعُوْنِيْ کے یہ معنی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اطاعتِ الٰہی سے محبوب الٰہی بن گیا ہوں۔ اگر تم بھی میرے جیسے کام کرو گے تو تم بھی محبوبِ الٰہی بن جاؤ گے۔ گویا خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کا دوسرا نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال رکھا ہے۔

مخالفین اسلام کے اعتراضات کا ردّ

اس کے بعد میں ان بعض اعتراضات کو لیتا ہوں جو رسول کریم ﷺ کی ذات پر کئے گئے ہیں اور بتاتا ہوں کہ کس طرح قرآن کریم نے ان کو رد کر کے آپؐ کے بے عیب اور کامل ہونے کو ثابت کیا ہے کیونکہ قرآن نے رسول کریم ﷺ کی پاکیزگی ثابت کرنے کا فرض خود اپنے ذمہ لیا ہے، کسی بندہ پر نہیں چھوڑا۔ پہلا اعتراض جو رسول کریم ﷺ کی زندگی پر ہوسکتا تھا وہ یہ ہے کہ آپ کے دعویٰ کے موجبات و محرکات کیا تھے؟ یا یہ کہ قرآن پیش کرنے کا اصل باعث کیا تھا؟ کوئی کہتا آپ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ پاگل ہیں۔ کوئی کہتا اُسے جھوٹی خوابیں آتی ہیں۔ کوئی کہتا ساحر ہیں۔ کوئی کہتا جھوٹ بولتے ہیں۔ کوئی کہتا کاہن ہیں۔ غرض مختلف قسم کے خیالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے۔ یہی خیالات آج تک چلتے چلے آتے ہیں۔ جب بھی کوئی مصنف رسول کریم ﷺ کے خلاف لکھتا ہے تو یہی کہتا ہے آپ جھوٹے تھے اور کوئی کہتا ہے کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ آپ مجنون تھے۔

پہلا اعتراض

میں سب سے پہلے جنون کے اعتراض کو لیتا ہوں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اتنی پاکیزہ تھی کہ منکر اس کے متعلق کوئی حرف گیری نہیں کر سکتے تھے اس لئے جب آپؐ کا کلام سنتے تو یہ نہ کہہ سکتے کہ آپ جھوٹے ہیں بلکہ یہ کہتے کہ پاگل ہے۔ چونکہ مشرکانہ خیالات ان لوگوں کے دلوں میں گڑے ہوئے تھے ادھر وہ سمجھتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ نہیں بول سکتے اس لئے ان دونوں باتوں کے تصادم سے یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ اس کی عقل ماری گئی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ [1] جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پیش کیا تو لوگوں نے حیران ہو کر کہ اب کس طرح انکار کریں یہ کہہ دیا کہ اے وہ شخص جو کہتا ہے کہ مجھ پر خدا کا کلام اُترا ہے تیرا دماغ پھر گیا ہے اور تو پاگل ہو گیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کریم میں اس طرح دیا گیا ہے کہ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ۔ مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ۔ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ فَسَتُبْصِرُ

وَيُبْصِرُوْنَ۔ بِاَيِّيكُمُ الْمَفْتُوْنُ۔ [۱۸] لوگ تجھے پاگل کہتے ہیں مگر ہم دوات اور قلم کو تیری سچائی کے لئے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پاگل آخر کسے کہتے ہیں اسے جس کی عقل عام انسانوں کی عقل کی سطح سے نیچے ہوتی ہے۔ ورنہ پاگلوں میں بھی کچھ نہ کچھ عقل تو ہوتی ہے۔ وہ کھانا کھاتے اور کپڑا پہنتے اور پانی پیتے ہیں۔ پاگل انہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ادنیٰ معیار عقل جو قرار دیا جاتا ہے، اس سے ان کی عقل کم ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل کہنے والوں کے متعلق فرماتا ہے تم اسے پاگل کہتے ہو مگر سب سے زیادہ عقلمند لکھنے پڑھنے والے عالم سمجھے جاتے ہیں اور مصنفین کو بڑا دانا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں ان عقلمندوں کی باتیں مقابلہ کے لئے لاؤ۔ دنیا کی تمام کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں انہیں اکٹھا کر کے لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو اپنی طرف سے لوگوں نے لکھی ہیں بلکہ فرمایا جو لکھی گئی ہیں۔ گویا مذہبی اور آسمانی کتابیں بھی لے آؤ۔ یا اعلیٰ درجہ کے علوم کی کتابیں جو لائبریریوں میں محفوظ رکھی جاتی ہیں وہ نکال کر لاؤ۔ اگر یہ سب کی سب کتابیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ثابت ہوں تو انہیں ماننا چاہئے کہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تو مجنون نہیں ہے۔

دیکھو! یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور کتنی زبردست دلیل ہے۔ یہ اس زمانہ کے لوگوں کو دلیل دی اور بعد میں آنے والوں کو یہ دلیل دی کہ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ۔ آئندہ بھی جو لوگ تجھے پاگل کہیں گے ہم انہیں کہیں گے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب تو تمہارے سامنے نہیں مگر اس کے کارناموں کے نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ پاگل جو کام کرتا ہے اس کی کوئی جزا نہیں ہوتی۔ کیا جب کوئی پاگل بادشاہ بن جاتا ہے تو اسے کوئی ٹیکس ادا کیا کرتا ہے یا ڈاکٹر بن جاتا ہے تو کوئی اس سے علاج کراتا ہے یا کوئی نبی بنتا ہے تو کوئی اس کا مرید بنتا ہے؟ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ ہم اس کے کاموں کا وہ اجر دیں گے جو کبھی کاٹا نہیں جائے گا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جب اس کے اعمال کا اجر نہ مل رہا ہوگا۔ جب بھی کوئی پاگل ہونے کا اعتراض کرے اس کے سامنے یہ بات رکھ دی جائے کہ پاگل کے کام کا تو نتیجہ اس وقت بھی نہیں نکلتا جب وہ کر رہا ہوتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دیکھو کہ کئی سو سال گذر جانے کے بعد بھی نتائج نکل رہے ہیں۔

پھر فرمایا ہم ایک اور بات بتاتے ہیں۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ پاگل کو پاگل کہو تو وہ

تھپڑ مارے گا لیکن عقلمند برداشت کر لے گا۔ اگر یہ لوگ تجھے پاگل سمجھتے تو تیری مجلس میں آ کر تجھے پاگل نہ کہتے بلکہ تجھ سے دور بھاگتے۔ یہ جو تیرے سامنے تجھے پاگل کہتے ہیں یہی ثبوت ہے اس بات کا کہ تُو پاگل نہیں ہے اور آئندہ آنے والوں کے لئے یہ ثبوت ہے کہ یہ پاگل کہنے والوں کے متعلق تو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کے بُرا بھلا کہنے پر چُپ رہو۔ کیا ایسا بھی کوئی پاگل ہوتا ہے جو صرف آپ ہی پاگل کہنے والوں کے مقابلہ میں اپنے جوش کو نہ دبائے بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی یہ ہدایت کر جائے کہ مخالفوں کو بُرا بھلا نہ کہنا۔ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ پس عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ تم دونوں میں سے کون گمراہ ہے۔ اس دلیل میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ پاگل کو کبھی خدائی مدد نہیں ملتی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی مدد سے کامیاب ہو رہے ہیں پھر ان کو پاگل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حالت میں کیا گیا جب مخالفین نے دیکھا کہ پاگل کہنے پر عقلمند لوگ خود ہمیں پاگل کہیں گے۔ جب وہ یہ دیکھیں گے کہ جسے پاگل کہتے ہیں اس نے تو نہ کسی کو مارا ہے نہ پیٹا بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں۔ پس انہوں نے سوچا کہ کوئی اور بات بناؤ۔ اس پر انہوں نے کہا۔ اسے پریشان خوابیں آتی ہیں اور ان کی وجہ سے دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ان کے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ[۱۹] کہتے ہیں اس کا کلام اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ہے کچھ مشتبہ سی خوابیں ہیں جو اسے آتی ہیں یعنی آدمی تو اچھا ہے۔ اس کی بعض باتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں لیکن بعض بُری باتیں بھی اسے دکھائی دیتی ہیں۔ جنون اور اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ میں یہ فرق ہے کہ جنون میں بیداری میں دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے لیکن اَضْغَاثُ میں نیند میں دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ مخالفین دیکھتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات میں کوئی نقص نہیں اس لئے کہتے کہ جنون سے مراد ظاہری جنون نہیں بلکہ خواب میں اسے ایسی باتیں نظر آتی ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ[۲۰] جن لوگوں کو اَضْغَاثُ

اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ہوتی ہیں کیا ان کی خوابوں میں قومی ترقی کا بھی سامان ہوتا ہے؟ پراگندہ خواب تو پراگندہ نتائج ہی پیدا کرسکتی ہے مگر اس پر تو وہ کتاب نازل کی گئی ہے جو تمہارے لئے عزت اور شرف کا موجب ہے۔ کیا دماغ کی خرابی سے ایسی ہی تعلیم حاصل ہوتی ہے؟ تم اپنے آپ کو عقلمند کہتے ہو۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

تیسرا اعتراض

پھر بعض اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ هٰذَا سَاحِرٌ[۲۱] کہ یہ جادوگر ہے۔ سِحْرٌ کے معنی عربی زبان میں جھوٹ کے بھی ہوتے ہیں مگر مخالفین نے رسول کریم ﷺ کو الگ بھی جھوٹا کہا ہے۔ اس لئے اگر اس کے معنی جھوٹ کے ہوں تو اس کا جواب علیحدہ ہوگا۔ دوسرے معنی سِحْرٌ کے یہ ہوتے ہیں کہ باطن میں کچھ اور ہو اور ظاہری شکل میں کچھ اور دکھائی دے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ[۲۲] اگر یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اعراض کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ بڑا پرانا جادو ہے۔ آگے فرماتا ہے حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ[۲۳] قرآن میں تو حکمت بالغہ ہے۔ قرآن میں ایسے مضامین ہیں جو دلوں میں تبدیلی پیدا کرنے والے ہیں۔ سِحْرٌ کے معنی تو یہ ہیں کہ ظاہر کو مسخ کردیا جائے اور باطن آزاد رہے مگر قرآن کا اثر تو یہ ہے کہ ظاہر کی بجائے دلوں کو بدلتا ہے۔ اس لئے اسے سِحْرٌ نہیں کہہ سکتے۔

یہ حکمت بالغہ ہے یعنی حکمت کی ایسی باتیں ہیں جو دور تک اثر کرنے والی ہیں۔ یہ اندرونی جذبات اور افکار پر اثر ڈالتی ہیں مگر ان لوگوں کو یہ انذار فائدہ نہیں دیتا۔

چوتھا اعتراض

پھر بعض نے کہا کہ یہ ساحر تو معلوم نہیں ہوتا ہاں مسحور ضرور ہے یعنی خود تو بڑا اچھا ہے لیکن کسی نے اس پر سحر کردیا ہے اس لئے یہ ایسی باتیں کہتا پھرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا[۲۴]

یعنی ظالم لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک مسحور کی اتباع کررہے ہیں۔کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس کی عقل ماری گئی ہے۔

اس آیت سے پہلے ملائکہ کے نزول کے متعلق معترضین کا مطالبہ ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور خزانے عطا کرتے ہیں (ملائکہ سے الہام اور خزانے سے معارف قرآن مراد تھے) تو مخالفین نے کہا کہ دیکھو اسے جو ملائکہ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مسحور ہے۔ فرشتے ہمیں نہیں نظر آتے۔ خزانے ہمیں نہیں دکھائی دیتے مگر یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور خزانے مل رہے ہیں، کہاں ملے ہیں؟ یہ سحر کا ہی اثر ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۔ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۔ ۲۵

یعنی یہ نادان کہتے ہیں کہ یہ مسحور ہے اور ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں کیوں فرشتے نظر نہیں آتے۔ ہمیں کیوں خزانے دکھائی نہیں دیتے۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ہم پر وہ فرشتے کیوں نہیں اُترتے جن کے متعلق یہ کہتا ہے کہ مجھ پر اُترتے ہیں۔ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا یا یہ کہتا ہے کہ میں اپنے رب کو دیکھتا ہوں۔ ہمیں وہ کیوں نظر نہیں آتا۔ یہ جاہل خیال کرتے ہیں کہ ہمیں چونکہ یہ چیزیں نظر نہیں آتیں اس لئے یہ جو اُن کے دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو مسحور ہے مگر یہ اپنے نفسوں کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسے گندوں کو خدا نظر آسکتا ہے۔ انہوں نے بڑی سرکشی سے کام لیا ہے۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ۔ ان کو بھی فرشتے نظر آئیں گے مگر اور طرح۔ جب انہیں فرشتے نظر آئیں گے تو یہ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے اور کہیں گے کہ کاش یہ ہمیں دکھائی نہ دیتے۔

اس دن مجرموں کے لئے خوشخبری نہیں ہوگی بلکہ یہ گھبرا کر کہیں گے کہ ہم سے پرے ہی رہو۔ اسی طرح ہم بھی ان کو نظر تو آئیں گے مگر انعام دینے کے لئے نہیں بلکہ قَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰہُ ہَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا۔ ہم ان کو تباہ کرنے کے لئے ان کے اعمال کی طرف متوجہ ہونگے اور ان کی حکومت کو باریک ذروں کی طرح اڑا کر رکھ دیں گے اور وہ جن کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک مسحور کے پیچھے چل رہے ہیں۔ ان کے لئے وہ بڑی خوشی کا دن ہوگا۔ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ یَوۡمَئِذٍ خَیۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِیۡلًا۔ ان کو نہایت اعلیٰ جگہ اور آرام دہ ٹھکانا ملے گا۔ اس کی آگے تفصیل بیان کی ہے کہ یَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ وَنُزِّلَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ تَنۡزِیۡلًا۔ اس دن آسمان سے بارش برسے گی اور بہت سے فرشتے اُتارے جائیں گے۔ جیسے بدر کے موقع پر ہوا۔ اَلۡمُلۡکُ یَوۡمَئِذِۣ الۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ۔ اس دن مکہ کی حکومت تباہ کر دی جائے گی اور حکومت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ وَکَانَ یَوۡمًا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ عَسِیۡرًا اور مکہ کی فتح کا دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔

باقی رہے خزانے سوان کے متعلق فرمایا وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا [۲۶] ہمارا یہ رسول قیامت کے دن اپنے خدا سے کہے گا کہ اے میرے رب! انہوں نے اگر حکومت نہ دیکھی تھی تو اس کے متعلق اعتراض کر لیتے۔ خزانے نہ دیکھے تھے تو اعتراض کر لیتے۔ فرشتے نہ دیکھے تھے تو اعتراض کر لیتے مگر یہ قرآن کو دیکھ کر کس طرح انکار کر سکتے تھے مگر افسوس کہ اتنے بڑے قیمتی خزانہ کا بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ تو ان کو دکھائی دینے والی چیز تھی۔

سورۃ بنی اسرائیل میں بھی یہ ذکر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسحور کہا جاتا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا۔ [۲۷] یعنی ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم ایک مسحور کی پیروی کر رہے ہو۔ پھر اس جگہ اور سورہ فرقان میں بھی اس کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ ضَرَبُوۡا لَکَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ سَبِیۡلًا [۲۸] یعنی دیکھ یہ کیسی باتیں تیرے لئے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سارا زور تیرے پیش کردہ کلام کے ردّ میں لگا رہے ہیں اور ناکامی اور نامرادی کی وجہ سے ان کی جانیں نکلی جا رہی ہیں مگر

پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ اس پر کسی جادو کا اثر ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس کمزور کے مقابلہ سے یہ لوگ کیوں عاجز آ رہے ہیں۔ مسحور تو دوسروں کا تابع ہوتا ہے اور یہ لوگوں کو اپنے تابع کر رہا ہے اور دوسرے تمام لوگ اس کے مقابل پر عاجز ہیں۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس اعتراض میں مسلمان بھی کافروں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور انہوں نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ پر ایک دفعہ جادو کر دیا تھا اور اس کے اثرات بڑے لمبے عرصہ تک آپ پر رہے۔ اور اس میں وہ امام بخاری کو بھی گھسیٹ لائے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں وہ صاف طور پر پڑھتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ [۶۹] خدا تعالیٰ تجھے لوگوں کے حملہ سے محفوظ رکھے گا۔ اگر لوگ رسول کریم ﷺ پر سحر کر سکتے تھے تو پھر يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کس طرح درست ہوا؟ ہم تو دیکھتے ہیں رسول کریم ﷺ تو الگ رہے آپ کے غلاموں پر بھی کوئی سحر نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نے ایک احمدی دوست سے بیان کیا کہ میں مسمریزم میں بڑا ماہر ہوں۔ ایک دفعہ مَیں نے ارادہ کیا کہ مرزا صاحب کے پاس جا کر ان پر مسمریزم کروں اور لوگوں کے سامنے ان سے عجیب وغریب حرکات کراؤں۔ یہ خیال کر کے مَیں ان کی مجلس میں گیا اور ان پر توجہ ڈالنے لگا مگر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑے اطمینان کے ساتھ باتیں کرتے رہے اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر مَیں نے اور زور لگایا مگر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر میں نے سارا زور لگایا اور کوشش کی کہ آپ پر اثر ڈالوں مگر اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک شیر مجھ پر حملہ کرنے لگا ہے۔ یہ دیکھ کر میں وہاں سے بھاگا اور واپس چلا آیا۔ لاہور جا کر اس نے حضرت مسیح موعود کو خط لکھا کہ مَیں نے سمجھ لیا ہے کہ آپ بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ کسی نے اسے کہا کہ تم نے ولی اللہ کس طرح سمجھ لیا۔ ہوسکتا ہے وہ مسمریزم میں تم سے زیادہ ماہر ہوں۔ اس نے کہا مسمرائیزر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاموش ہو کر دوسرے پر توجہ ڈالے مگر وہ اس وقت دوسروں سے باتیں کرتے رہے تھے اس لئے وہ مسمرائزر نہیں ہو سکتے۔

پانچواں اعتراض

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ کاہن ہے۔ کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو مختلف علامات سے

آئندہ کی خبریں بتاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔ [۳۵] لوگ تجھے کاہن کہتے ہیں حالانکہ تیرا کلام ایسا نہیں مگر یہ لوگ بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم میں جہاں دو جگہ مسحور کا ذکر آیا ہے وہاں دونوں جگہ یہ آیت بھی ساتھ آئی ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا۔ اسی طرح کاہن کا لفظ بھی دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ ذکر کا لفظ ساتھ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاہن اور مذکر دونوں اضداد میں سے ہیں۔ چنانچہ سورہ طور رکوع ۲ میں آتا ہے۔ فَذَكِّرْ فَمَآ أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُونٍ۔ [۳۶] ان لوگوں کو نصیحت کر کیونکہ تو اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہے نہ مجنون۔ یعنی کاہن مذکّر نہیں ہوسکتا اور مذکّر کاہن نہیں ہوسکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کاہن درحقیقت اڑ پوپو☆ [۳۷] کی قسم کے لوگوں کو کہتے ہیں جو بعض علامتوں وغیرہ سے اخبار غیبیہ بتاتے ہیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی اخبار بتاتے تھے۔ بعض نادان آپؐ کو کاہن کہہ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کی اخبار تو محض اخبار ہوتی ہیں اور اِس کی اخبار تذکیر کا پہلو رکھتی ہیں اور اصلاحِ نفس اور اصلاحِ قوم سے تعلق رکھتی ہیں تو پھر یہ کاہن کیونکر ہوا۔ کاہنوں کی خبریں تو ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے مولوی برہان الدین صاحب جہلمی کو ایک نے بتائی تھی۔ مولوی صاحب نے ایک دفعہ پردہ میں بیٹھ کر ایک اڑ پوپو کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے آپ کو عورت سمجھ کر خاوند کے متعلق باتیں بتانی شروع کر دیں۔ جب وہ بہت کچھ بیان کر چکا تو مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اپنی داڑھی اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور پھر کبھی اس محلّہ میں نہیں آیا۔

غرض کاہنوں کی خبریں محض خبریں ہی ہوتی ہیں کہ فلاں کے ہاں بیٹا ہوگا۔ فلاں مر جائے گا ان میں خدا تعالیٰ کی قدرت کا اظہار نہیں ہوتا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خبریں بتاتے ہیں ان کو کاہنوں والی خبریں نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ایمان کو تازہ کرنے والی اور خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ رسول کہتا ہے میں خدا کی طرف سے آیا ہوں جو میرا مقابلہ کرے گا وہ ناکام رہے گا اور جو مجھے مان لے گا جیت جائے گا مگر کوئی کاہن یہ نہیں کہہ سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کاہن کا قول ہے۔ ان کی عقل ایسی ماری گئی ہے کہ اتنی پیشگوئیاں سنتے ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی قدرت اور جبروت کا اظہار ہے مگر پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

دوسرا ردّ اس کا یہ فرمایا فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۔ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ۔ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ۔ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ۔ [۴۲] یعنی ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کو بھی جسے تم دیکھتے ہو اور اس کو بھی جسے تم نہیں دیکھتے یعنی اس کے ظاہری اور باطنی دونوں حالات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ قرآن ایک عزت والے رسول کا کلام ہے۔ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایک بات میں کاہن اور شاعر دونوں مشترک ہوتے ہیں۔ شاعر بھی بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور سب کچھ بیان کرنے کے بعد ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح کاہن بھی خبریں بتا کر مانگتا پھرتا ہے۔ مگر فرمایا یہ رسول تو ایسا ہے جو اپنے پاس سے خرچ کرتا ہے۔ کاہن تو دوسروں سے مانگتا ہے۔ یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کو رسول کریم ﷺ کا کلام قرار دیا گیا ہے۔ یہاں رسول کہہ کر اس شُبہ کو ردّ کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں کیونکہ رسول وہی ہوتا ہے جو دوسرے کا پیغام لائے۔ اگر محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی طرف سے بیان کرتا تو آپ کا کلام سمجھا جاتا ہے مگر یہ تو رسول ہے۔

تیسری دلیل یہ دی کہ کاہن تو اپنے اخبار کو اپنے علم کی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں نے جفر، رمل، تیروں اور ہندسوں وغیرہ سے یہ یہ باتیں معلوم کی ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اپنی خبروں کو منسوب نہیں کرتا مگر یہ رسول کہتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے کلام پا کر سناتا ہوں اور یہ اپنے کلام کو تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے۔

یہاں یہ بھی بتا دیا کہ کاہن ایسی باتیں بیان کرنے کی وجہ سے اس لئے سزا نہیں پاتا کہ وہ خدا پر تقوّل نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے بیان کرتا ہے مگر رسول کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے مَیں بیان

کرتا ہوں۔ اگر رسول جھوٹا ہو تو فوراً تباہ کر دیا جاتا ہے۔ پس یہ کاہن نہیں ہے بلکہ خدا کا سچا رسول ہے اور اس پر جو کلام نازل ہوا ہے یہ ربُّ العالمین خدا کی طرف سے اُتارا گیا ہے۔ اگر کہو کہ یہ اس طرح اپنی کہانت کو چھپاتا ہے تو یاد رکھو کہ جان بوجھ کر ایسا کرنے والا کبھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اگر یہ شخص ہماری طرف جھوٹا الہام منسوب کر دیتا خواہ ایک ہی ہوتا تو ہم یقیناً اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگ جان کاٹ دیتے اور اس صورت میں تم میں سے کوئی بھی نہ ہوتا جو اسے خدا کے عذاب سے بچا سکتا۔

چھٹا اعتراض

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ شاعر ہیں۔ چنانچہ سورۃ انبیاء رکوع اوّل میں آتا ہے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ کہ یہ فصیح باتیں بیان کر کے لوگوں پر اثر ڈال لیتا ہے۔ اس کا جواب سورۃ یٰسین رکوع ۵ میں یہ دیا کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ [۴۳] یعنی ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور یہ تو اس کی شان کے مطابق بھی نہیں ہے۔ یہ تو ذِکْرٌ اور قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ہے۔ کھول کھول کر باتیں سنانے والا ہے۔ یہ اس لئے نازل کیا گیا ہے تا کہ اُسے جس میں روحانی زندگی ہے ڈرائے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اوّل قرآن شعر نہیں۔ ان لوگوں کی عقلیں ماری گئی ہیں کہ نثر کو شعر کہتے ہیں۔ دوم اگر کہیں کہ مجازی معنوں میں شعر کہتے ہیں کیونکہ شعر کے معنے ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو اندر سے باہر آئے اور شعر کو اس لئے شعر کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کو اُبھارتا ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ یہ تو اس کی شان کے ہی مطابق نہیں کہ اس قسم کی باتیں کرے۔ اس کی ساری زندگی دیکھ لو۔ شاعر کی غرض اپنے آپ کو مشہور کرنا ہوتی ہے مگر یہ تو کہتا ہے مِثْلُكُمْ میں تمہارے جیسا ہی انسان ہوں۔ پھر شاعر ان لوگوں کی مدح کرتا ہے جن سے اس نے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے مگر یہ تو کہتا ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں لیتا نہ کچھ مانگتا ہوں۔ پس شاعری اور اس کا لایا ہوا کلام آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ سوم پھر اس میں ذکر ہے حالانکہ شعر ذکر نہیں ہوتا یعنی شعر

اندرونی جذبات کو ابھارتا ہے۔ شہوت اور حسن پرستی کا ذکر کرتا ہے مگر یہ ایسی باتوں کی مذمت کرتا ہے۔ چہارم پھر یہ ایسا کلام ہے جو فطرت کے اعلیٰ محاسن کو بیدار کر کے جن کی فطرت صحیح ہوتی ہے انہیں بدیوں سے بچاتا ہے اور جو مُردہ ہوتے ہیں ان پر حجت تمام کرتا ہے۔ حالانکہ شاعر جذبات بہیمیہ کو اُبھارتا ہے۔ پس اسے مجازی طور پر بھی شعر نہیں کہہ سکتے۔

ساتواں اعتراض

ساتواں اعتراض یہ کیا گیا کہ یہ معلم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَنّٰی لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۔ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۔ [۳۴] فرمایا ان نامعقولوں کو کہاں سے نصیحت حاصل ہوگئی۔ حالانکہ ان کے پاس اعلیٰ درجہ کے معارف بیان کرنے والا رسول آیا مگر یہ لوگ اس سے منہ پھیر کر چلے گئے اور کہہ دیا کہ اسے کوئی اور سکھا جاتا ہے اور مجنون ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ایسا نادان ہے کہ لوگ اس کو اس کے باپ دادا کے دین کے خلاف باتیں بتا جاتے ہیں اور یہ آگے ان کو بیان کر دیتا ہے۔

بعض لوگ رسول کریم ﷺ پر اعتراض کرتے تھے اور اب تک کرتے ہیں کہ قرآن نہ آپ پر نازل ہوا نہ آپ نے بنایا بلکہ کوئی اور شخص ان کو سکھا دیتا تھا۔ مکّہ والے کہتے تھے کہ مکّہ کا ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کس طرح اپنی قوم کے بتوں کی مذمت کر سکتا ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں دوسری قوم کے نبیوں کی تعریف کر سکتا ہے اسے کوئی اور اس قسم کی باتیں سکھا جاتا ہے۔ جب وہ حضرت موسیٰؑ کی تعریف قرآن میں سنتے تو کہتے کہ کوئی یہودی سکھا گیا ہے اور جب حضرت عیسیٰؑ کی تعریف سنتے تو کہتے کوئی عیسائی بتا گیا ہے۔ اس میں ان کو اس بات سے بھی تائید مل جاتی ہے کہ قرآن کریم میں پہلے انبیاء کے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس جگہ مجنون حقیقی معنوں میں نہیں آیا بلکہ غصّہ کا کلام ہے کیونکہ معلّم اور مجنون یکجا نہیں ہو سکتے۔ مطلب یہ کہ پاگل ہے، اتنا نہیں سمجھتا کہ لوگ اسے اپنے مذہب اور قوم کے خلاف باتیں سکھاتے ہیں۔

قرآن کریم میں دو جگہ بھی یہ ذکر آیا ہے۔ سورہ نحل رکوع ۱۴ میں ہے۔ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۔ وَلَقَدْ

نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ۔ ۳۵ فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو مخالفوں سے کہہ دے کہ قرآن کو روح القدس نے اُتارا ہے تیرے رب کی طرف سے ساری سچائیاں اس میں موجود ہیں اور اس لئے اُتارا ہے کہ مومنوں کے دل مضبوط ہوں اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہو اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کسی اور نے قرآن سکھایا ہے مگر جس کی طرف وہ یہ بات منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے (عجمی وہ ہوتا ہے جو عرب نہ ہو یا عرب تو ہو مگر اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح عربی میں بیان نہ کر سکے) اور یہ جو کلام ہے یہ تو زبانِ عربی میں ہے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ خوب کھول کھول کر بیان کرنے والی۔

دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِفْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ ۳۶ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ صرف ایک جھوٹ ہے جو اس نے بنالیا ہے اور اس بنانے میں کچھ اور بھی لوگ اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے اور بڑا افترا باندھا ہے وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں پرانے قصے ہیں جو لکھوا لیتا ہے یعنی دو جماعتیں ہیں ایک مضمون بناتی ہے اور ایک لکھ لکھ کر دیتی ہے۔ فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا پھر اس کی مجلس میں اسے خوب پڑھتے ہیں تاکہ یاد ہو جائے قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ دے اسے خدا نے اُتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں کو جاننے والا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وہ بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس اعتراض میں آج کل عیسائی بھی شامل ہو گئے ہیں اور بڑے بڑے مصنّف مزے لے لے کر اسے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا پتہ تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ وہ عیسائی اور یہودی ہی تھے جو باتیں بنا کر ان کو دیتے تھے۔ چونکہ اب بھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے اس لئے میں کسی قدر تفصیل

سے اس کا جواب بیان کرتا ہوں۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اسے بشر سکھاتا ہے۔ اس بشر سے مراد جبر☆ ۳۶ رومی غلام تھا جو عامر بن حضرمی کا غلام تھا۔ اس نے تورات اور انجیل پڑھی ہوئی تھی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ تکلیف دینے لگے تو آپؐ اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا۔ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ فرّا اور زجاج کہتے ہیں کہ حویطب ابن عبدالعزّی کا ایک غلام عائش یا یعیش نامی پہلی کتب پڑھا کرتا تھا۔ بعد میں پختہ مسلمان ہو گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتا تھا۔ اس کی نسبت لوگ یہ الزام لگاتے تھے۔ مقاتل اور ابن جبیر کا قول ہے کہ ابو فکیہ پر لوگ شبہ کرتے تھے ان کا نام یسار تھا۔ مذہباً یہودی تھے اور مکہ کی ایک عورت کے غلام تھے۔ بیہقی اور آدم بن ابی ایاس نے عبداللہ بن مسلم الحضرمی سے روایت لکھی ہے کہ ہمارے دو غلام یسار اور جبر نامی تھے دونوں نصرانی تھے اور عین التجر کے رہنے والے تھے۔ دونوں لوہار تھے اور تلواریں بنایا کرتے تھے اور کام کرتے ہوئے انجیل پڑھا کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گذرتے تو ان کے پاس ٹھہر جاتے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان میں سے ایک غلام سے لوگوں نے پوچھا۔ کہ اِنَّكَ تُعَلِّمُ مُحَمَّدًا فَقَالَ لَاهُوَ يُعَلِّمُنِيْ۔ کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سکھاتے ہو؟ اس نے کہا۔ میں نہیں سکھاتا بلکہ وہ مجھے سکھاتا ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک انجمی رومی غلام مکّہ میں تھا۔ اس کا نام بلعام تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اسلام سکھایا کرتے تھے اس پر قریش کہنے لگے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھاتا ہے۔ ۳۷

مسیحی مؤرخ لکھتے ہیں کہ غالباً آپ نے بحیرہ راہب سے سیکھا تھا۔ چونکہ مسیحی تاریخوں میں بحیرہ کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ اس وجہ سے ابتداءً تو وہ اس کے وجود سے ہی منکر تھے لیکن اب مسعودی کی ایک روایت کی وجہ سے وہ اس کو تسلیم کرنے لگے ہیں اور اس اعتراض کے رنگ میں اس سے فائدہ اُٹھانے لگے ہیں۔ وہ روایت یہ ہے کہ بحیرہ کو مسیحی لوگ سرگیس (Sergius) کہا کرتے تھے اور Sergius نامی ایک پادری کا پتہ مسیحی کتب میں مل جاتا ہے۔ پس اب وہ کہتے ہیں کہ اس شخص سے سیکھ کر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ قرآن بنالیا۔ سیل (Sale) اس خیال کو

رڈ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بحیرہ کا مکّہ جانا ثابت نہیں اور یہ خیال کہ آپؐ نے جوانی میں دعویٰ سے بہت پہلے بحیرہ سے قرآن سیکھا ہو عقل کے خلاف ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مسیحیت کا کچھ علم سیکھا ہو۔

وہیری ان روایتوں سے خوش ہو کر کہتا ہے کہ خواہ ناموں میں اختلاف ہی ہو لیکن یہ روایت اتنی کثرت سے آتی ہے کہ اس میں شُبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بعض مسیحی اور یہودی آتے تھے اور یہ کہ انہوں نے ان کی گفتگو سے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا اور جواب کی کمزوری بتاتی ہے کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے، ورنہ یہ کیا جواب ہوا کہ اس کی زبان اعجمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بنا دیتا ہو اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے عربی میں ڈھال لیتے ہوں (وہ اپنے اس خیال کی تصدیق میں آرنلڈ کو بھی پیش کرتا ہے) اس کے بعد وہ لکھتا ہے:-

It is because of this that we do not hesitate to reiterate the old charge of deliberate imposture.۳۸

یعنی ہم یہ پرانا الزام دُہراتے ہوئے اپنے دل میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جان بوجھ کر جھوٹ بنایا۔

اُوپر کے مضمون سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کفارِ مکّہ اس اعتراض کو خاص اہمیت دیتے تھے اور ان کے وارث مسیحیوں نے اس اہمیت کو اب تک قائم رکھا ہے۔ میں پہلے مسیحیوں کے اعتراضات کو لیتا ہوں اور اس شخص کو جواب میں پیش کرتا ہوں جسے عیسائی خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ حضرت مسیح پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ ان کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور دیوؤں کو اس کی مدد سے نکالتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:-

''پھر وہ ایک گونگی بدروح کو نکال رہا تھا اور جب وہ بدروح اُتر گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا لیکن ان میں سے بعض نے کہا۔ یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اس سے ایک آسمانی نشان طلب کرنے لگے مگر اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا کہ جس

کسی بادشاہت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی بادشاہت کس طرح قائم رہے گی کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بدروحوں کو بعل زبول کی مدد سے نکالتا ہے۔''[۳۹]

یہاں حضرت مسیح نے ایک قانون پیش کیا ہے۔ جب ان کے متعلق کہا گیا کہ وہ شیطان کو شیطان کی مدد سے نکالتے ہیں تو انہوں نے کہا شیطان شیطان کو کیوں نکالے گا؟ اس قانون کے ماتحت غور کرلو کہ کیا قرآن کسی یہودی یا عیسائی کا بنایا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر کسی عیسائی کا بنایا ہوا ہوتا تو عیسائیت کے ردّ سے کس طرح بھرا ہوا ہوتا؟ اور اگر کسی یہودی نے بنایا ہوتا تو اس میں یہودیت کا کس طرح ردّ ہوتا؟ عیسائیت کا کوئی فرقہ بتادو اس کا ردّ قرآن سے دکھا دیا جائے گا۔ اسی طرح کوئی یہودی فرقہ پیش کرو۔ اس کا ردّ قرآن میں موجود ہے۔ کیا کوئی خیال کرسکتا ہے کہ کوئی عیسائی اور یہودی اپنے مذہب کی آپ تردید کرے گا۔ قرآن پورے طور پر عیسائیت کو ردّ کرتا ہے۔ ہم دور نہیں جاتے پہلی سورۃ میں ہی قرآن نے عیسائیت کی جڑیں اُکھیڑ کر رکھ دی ہیں۔ پہلی سورۃ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی یہ ہے:-

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰى۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى۔ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى۔ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى۔ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۔ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰى۔ كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ۔ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ۔ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ۔ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔[۴۰]

یہ سورۃ جو سب سے پہلی سورۃ ہے۔ اسی میں عیسائیت کے تمام مسائل کو ردّ کر دیا گیا ہے۔ پہلا حملہ عیسائیت پر یہ ہے کہ فرمایا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان کی فطرت میں گناہ ہے۔ عیسائیت کہتی ہے انسان فطرتاً گناہگار ہے اور عمل سے نیک نہیں بن سکتا۔ اس لئے مسیح کو جو پاک اور بے عیب تھا صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ اسی طرح وہ انسانوں کے

گناہ اپنے اُوپر اُٹھا کر قربان ہوگیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ انسان کی فطرت میں خدا کی محبت رکھی گئی ہے اور اس کی بناوٹ میں ہی خدا سے تعلق رکھا گیا ہے۔ اس طرح عیسائیت کا پہلا عقیدہ باطل کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ کفارہ کوئی چیز نہیں ہے اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ انسان گناہگار ہے لیکن اسلام شروع ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان نیک ہے اور اس کی فطرت میں خدا سے محبت رکھی گئی ہے نہ کہ گناہ۔

دوسرا جواب یہ دیا۔ کہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ خدا جو تیرا رب ہے اس کی یہ شان ہے کہ دوسری چیزوں میں جو صفات پائی جاتی ہیں ان سب سے اعلیٰ صفات اس میں جلوہ گر ہیں۔ عیسائیت کہتی ہے کہ خدا میں رحم کی صفت نہیں۔ وہ گناہگار کو نہیں بخش سکتا مگر اسلام کہتا ہے جب انسان اپنے قصوروار کو بخش سکتا ہے اور انسان میں عفو کی صفت ہے تو خدا کیوں نہیں بخش سکتا اور اُس میں کیوں یہ صفت نہیں۔ اس میں تو بدرجہ اتم یہ صفت ہے کیونکہ وہ اَکْرَم ہے یعنی تمام صفات حسنہ میں سب سے بڑھ کر ہے۔

تیسرا ردّ یہ کیا کہ فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔ عیسائیت کی تیسری بنیاد یہ ہے کہ شریعت لعنت ہے لیکن قرآن نے بتایا کہ شریعت میں وہ باتیں ہیں جو انسان عقل سے دریافت نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی کوشش سے شرعی احکام نہیں بنا سکتے اس لئے شریعت آتی ہے۔

چوتھی زد عیسائیت پر یہ کی کہ فرمایا كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى انسان بڑا ہی سرکش ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے خدا کی شریعت کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی راہنمائی کے سامان مہیا کر لونگا۔ یہ کہنے والے بہت نامعقول لوگ ہیں۔

پانچواں ردّ یہ کیا کہ فرمایا كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ ایسے لوگوں کی باتیں کبھی نہ سننا اور اللہ کی خوب عبادت اور فرمانبرداری کرنا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ کسی راہب کی بات نہ سننا جو شریعت کو لعنت قرار دیتا ہے بلکہ خدا کی فرمانبرداری میں لگا رہ۔ گویا نجات اور قُربِ الٰہی کا ذریعہ بجائے کسی کفارہ پر ایمان لانے کے سجدہ یعنی فرمانبرداری یا بالفاظ دیگر اسلام کو قرار دیا ہے۔

پس قرآن کی تو پہلی سورۃ نے ہی مسیحیت کو ردّ کیا ہے اور بادلیل ردّ کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ میں عیسائیت اور یہودیت کو ردّ کیا گیا ہے۔ پھر کیا کوئی شخص مان سکتا ہے کہ عیسائی اور یہودی

اپنے مذہب کے خلاف خود دلائل بتایا کرتے تھے۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو عیسائی راہب اپنے مذہب کو ماننے والا ہوگا یا نہ ماننے والا۔ اگر ماننے والا تھا تو اسے چاہئے تھا کہ اپنے مذہب کی تائید کرتا نہ کہ اس کے خلاف باتیں بتاتا اور اگر نہ ماننے والا تھا اور سمجھتا تھا کہ جو باتیں اس کے ذہن میں آئی ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی ہیں تو اس نے ان کو خود اپنی طرف منسوب کر کے کیوں نہ پیش کیا۔ اسے چاہئے تھا کہ اپنے نام پر کتاب لکھتا نہ کہ لکھ کر دوسرے کو دے دیتا۔

اب میں ان آیتوں اور ان میں مذکور جوابات کو لیتا ہوں۔ سورہ نحل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اسے کوئی اور آدمی سکھاتا ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ وہ شخص تو عجمی ہے اور قرآن کی زبان عربی ہے۔ وہیری کہتا ہے کہ یہ جواب بالکل بودا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ مضمون وہ عجمی بنا کر دیتا تھا۔ آگے عربی میں وہ خود ڈھال لیتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کے دوسرے جواب بھی ایسے ہی بودے ہوتے ہیں۔ اگر قرآن کی دوسری باتیں ارفع اور اعلیٰ ہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ یہ جواب بھی ضرور اعلیٰ ہوگا اور جو مطلب ہم سمجھتے ہیں وہ غلط ہوگا۔ دوسرے اگر یہ جواب بے جوڑ تھا تو کیوں مکّہ والوں نے اسے ردّ نہ کر دیا اور کیوں وہیری والا جواب انہوں نے نہ دیا ان کا تو اپنا اعتراض تھا اور وہ اپنے اعتراض کا مطلب وہیری وغیرہ سے بہتر سمجھتے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ تو بے معنی جواب ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ نہیں آتا کہ مکّہ والوں نے کہا ہو یہ جواب بے جوڑ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جو اعتراض تھا اس کا جواب انہیں صحیح اور مسکت مل گیا تھا۔ اسی لئے وہ خاموش ہو گئے۔

اب رہا یہ امر کہ اچھا پھر سوال و جواب کا مطلب کیا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں کفار کا سوال ایک نہ تھا بلکہ دو تھے اور ان سوالوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی قرآنی جواب کو بے جوڑ قرار دے دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کا ذکر سورۃ نحل میں ہے اور دوسرے کا سورۃ فرقان میں۔ سورۃ نحل کا وہ سوال نہیں جو سورۃ فرقان کا ہے اور سورۃ فرقان میں وہ نہیں جو سورۃ نحل میں ہے۔ چنانچہ سورۃ نحل میں یہ اعتراض نقل ہے کہ ایک عجمی شخص آپؐ کو سکھاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا نام نہیں لیا مگر یہ کہا ہے کہ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ☆ [۴۲] کہ وہ جس کی طرف قرآن کو

منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کسی خاص شخص کا نام لیتے تھے۔ پھر یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ شخص معروف تھا اور مسلمان بھی اس شخص کا نام جانتے تھے۔

سورۃ فرقان کی آیت اس سے مختلف ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کفار کسی خاص آدمی کا نام لئے بغیر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک جماعت رسول کریم ﷺ کو سکھاتی ہے اور رات دن آپ کے پاس رہتی ہے اور آپ بعض دوسرے لوگوں سے اس جماعت کے بتائے ہوئے واقعات کو لکھوا لیتے ہیں۔

یہ فرق نمایاں ہے۔ ایک میں ایک خاص شخص کا ذکر ہے اور دوسری میں غیر معین جماعت کا ذکر ہے۔ ایک میں صرف سیکھنے کا ذکر ہے اور دوسری میں بعض لوگوں سے لکھوانے کا بھی ذکر ہے۔ ایک میں محض تعلیم کا ذکر ہے اور دوسری میں پہلوں کے واقعات اور خیالات کے نقل کرنے کا ذکر ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں جگہ جواب الگ الگ دیا گیا ہے۔ یہ فرق اتنے نمایاں ہیں کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ کیا تو شروع میں ہی بعض غلام آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ پہلے بت پرست یا عیسائی یا یہودی تھے۔ انہیں جب صبح و شام فرصت ملتی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پہنچ جاتے اور دوسرے صحابہؓ کے ساتھ دین سیکھتے اور نمازیں پڑھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مکان پر یہ اجتماع ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی ایمان نہ لائے تھے کہ ایک دن اپنے گھر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے کے ارادہ سے نکلے۔ کسی نے پوچھا کہ کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا محمد جو صابی ہو گیا ہے اس کی خبر لینے جا رہا ہوں۔ اس نے کہا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ انہوں نے کہا کیا ہو گیا ہے؟ اس نے بتایا کہ تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنی بہن کے گھر گئے اور جا کر دستک دی۔ اس وقت ایک صحابیؓ ان کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ عمرؓ ہیں تو صحابیؓ کو چھپا دیا گیا اور بہن اور بہنوئی سامنے ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کس طرح آئے ہو۔ عمرؓ نے کہا بتاؤ تم کیا کر رہے تھے۔ میں نے سنا ہے تم بھی صابی ہو گئے ہو۔ انہوں نے کہا یہ غلط ہے۔ ہم تو صابی نہیں ہوئے۔ عمرؓ نے کہا میں نے تو خود تمہاری آواز سنی ہے۔ تم کچھ پڑھ رہے

تھے اور بہنوئی پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر بہن آگے آ گئی اور ضرب اس کے سر پر پڑی جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ اس پر انہوں نے بڑے جوش سے کہا۔ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو چونکہ وہ ایک بہادر انسان تھے اور ان کا وار ایک عورت پر پڑا جو اُن کی بہن تھی۔ اس سے انہیں سخت شرمندگی محسوس ہوئی اور انہوں نے کہا کہ تم جو کچھ پڑھ رہے تھے وہ مجھے بھی دکھاؤ۔ اس نے کہا تم مشرک اور ناپاک ہو۔ پہلے جا کر نہاؤ پھر بتائیں گے۔ چنانچہ وہ نہائے اور رہا سہا غصہ بھی دور ہو گیا۔ اس کے بعد قرآن کی جو آیات پڑھ رہے تھے وہ انہیں سنائی گئیں۔ حضرت عمرؓ کا دل ان کو سن کر پگھل گیا اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس وقت وہ صحابی جن کو انہوں نے چھپایا ہوا تھا۔ وہ بھی باہر آ گئے حضرت عمرؓ نے کہا بتاؤ تمہارا سردار کہاں ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ انہیں بتایا گیا کہ فلاں گھر میں مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ وہاں گئے۔ وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعض صحابہؓ موجود تھے اور دروازہ بند تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے دستک دی تو صحابہؓ نے پوچھا کون ہے؟ حضرت عمرؓ نے اپنا نام بتایا تو صحابہؓ نے ڈرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ عمرؓ آیا ہے۔ دروازہ کے سوراخ سے انہوں نے دیکھا کہ تلوار ان کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دروازہ کھول دو۔ جب عمرؓ اندر داخل ہوئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا کُرتہ پکڑ کر کہا۔ عمرؓ کس نیت سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا اسلام قبول کرنے کے لئے۔ آپ نے فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ ☆☆☆ یہ سن کر باقی صحابہؓ نے بھی زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ صحابہؓ کو دین سکھانے کے لئے الگ مکان میں بلا لیتے۔ چونکہ آپ دروازہ بند کر کے بیٹھتے تھے تا کہ کفار شرارت نہ کریں۔ اس لئے کفار کے نزدیک اس قسم کا اجتماع بالکل عجیب بات تھی۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہاں قرآن بنایا جاتا ہے اور چونکہ انبیاءِ سابق کے بعض واقعات کی طرف قرآن کریم میں اشارہ تھا وہ یہ خیال کرتے کہ مسیحی اور یہودی غلام یہ باتیں ان لوگوں کو بتاتے ہیں اور دوسرے صحابہؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھوا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِفْتَرٰىهُ

وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ۔ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا۔ یعنی منکر لوگ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ بنالیا گیا ہے اور کچھ لوگ اس میں مدد دیتے ہیں مگر ان کا یہ اعتراض بالبداہت ظلم اور جھوٹ پر مبنی ہے کیونکہ کیا مسیحی غلام ایسا کر سکتے ہیں کہ خود اپنے دین پر ہنسی کرائیں۔ آخر انہیں اس کی کیا ضرورت ہے اور کیا فائدہ ہے کہ وہ اسی بات پر رات دن ماریں کھائیں اور گرم ریت پر گھسیٹے جائیں اور ایک بے فائدہ فریب میں شامل ہوں۔ پس ایسے مخلص لوگوں پر یہ اعتراض کر کے ان لوگوں نے ظلم اور جھوٹ سے کام لیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسے لوگ ایسا جھوٹ بناسکیں۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جن کو تم پرانے قصے سمجھتے ہو وہ قصے نہیں بلکہ آئندہ کے متعلق خبریں اور پیشگوئیاں ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ [۱] تو کہہ دے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے واقف ہے۔ کوئی انسان ایسا کلام نہیں بنا سکتا۔ یہ تو غیب کی باتیں ہیں اور غیب خدا ہی جانتا ہے۔

اب ان جوابوں کو دیکھو کہ کس قدر صحیح اور مضبوط ہیں اور وہیری کا خیال کس قدر بے معنی ہے۔ اگر یہاں بھی وہی اعتراض سورۃ نحل والا ہوتا تو اس کا وہی جواب کیوں نہ دیا جاتا جو وہاں دیا گیا ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اگر یہی سوال سورۃ نحل میں تھا تو اس کا جواب بقول وہیری کے بیہودہ دیا جاتا۔ ایک شخص جو صحیح جواب جانتا ہے اور وہ جواب دے بھی چکا ہے اسے وہ جواب چھوڑ کر اور جواب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ پس یہ جواب لغو نہیں بلکہ معترضین کی اپنی سمجھ ناقص ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سورۃ نحل میں یہ سوال ہی نہیں کہ کوئی اسے مضمون بنا دیتا ہے بلکہ یہ ذکر ہے کہ نادان لوگ ایک ایسے شخص کی نسبت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ کو سکھاتا ہے جو خود عجمی تھا یعنی اپنا مفہوم اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ صرف تھوڑی سی عربی جانتا تھا۔ (عجمی کے یہ بھی معنی ہیں کہ جو اپنا مفہوم اچھی طرح ادا نہ کر سکے چنانچہ لغت میں یہ معنی بھی لکھے ہیں۔) اس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ دوسرے کا قول انسان دو طرح نقل کر سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اس کا مطلب سمجھ کر اپنے الفاظ میں ادا کر دے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ اس کے الفاظ رٹ کر ادا کر دے جیسے طوطا میاں مٹھو کہتا ہے۔ نقل انہی دو طریق سے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم جانتے ہو کہ جس شخص کی طرف تم یہ بات منسوب کرتے ہو وہ اپنا مطلب عربی زبان میں پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ پس

جب وہ مطلب ہی بیان نہیں کر سکتا تو وہ رسول کریم ﷺ کو مضامین کس طرح سمجھاتا ہے کہ وہ عربی میں اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ یہ جواب ہے آدھے حصے کا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ اس کے قول کو نقل کیا جاتا مگر یہ کس طرح ہوسکتا تھا۔ وہ تو عبرانی میں کہتا تھا اور اس کی بات اگر دہرائی جاتی تو عبرانی میں ہوتی مگر قرآن تو عبرانی یا یونانی میں نہیں جس میں تورات یا انجیل لکھی ہوئی ہیں بلکہ عربی میں ہے۔ پس جب نہ وہ شخص اپنا مطلب عربی میں ادا کر سکتا ہے نہ قرآن کسی دوسری زبان کی نقل ہے تو اس کی طرف یہ کتاب کس طرح منسوب کی جاسکتی ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت تک تورات اور انجیل کا کوئی ترجمہ عربی زبان میں نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ بعض صحابہؓ کو عبرانی اس لئے پڑھوائی گئی کہ وہ تورات و انجیل پڑھ سکیں۔ دوسرا ثبوت اس کا یہ ہے کہ مفسرین دنیا بھر کے علوم کا ذکر تفسیروں میں کرتے ہیں مگر جب بائبل کا حوالہ دیتے ہیں تو بالعموم غلط دیتے ہیں۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ عربی میں بائبل نہ تھی۔ وہ سن سنا کر لکھتے اس لئے غلط ہوتا۔

تیسرا ثبوت یہ ہے کہ بخاری میں ورقہ بن نوفل کے متعلق لکھا ہے کہ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتٰبَ بِالْعِبْرَانِيِّ[۲] وہ عبرانی میں تورات لکھا کرتے تھے۔ گویا اس وقت توریت اور انجیل عربی میں نہ تھی۔ پس یقیناً وہ غلام عبرانی یا یونانی میں انجیل پڑھتا تھا اور عربی میں اس کا مفہوم بیان نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح اس اعتراض کو رد کر دیا گیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ جبیر نے کہا تھا کہ بَلْ هُوَ يُعَلِّمُنِي۔ جبیر آخر کار مسلمان ہو گیا تھا۔ عبداللہ بن ابی سرح نے مرتد ہونے پر اس کا راز کفار کو بتا دیا تھا اور وہ اسے سخت تکالیف دیتے تھے۔ آخر فتح مکہ پر آنحضرت ﷺ نے روپیہ دے کر اسے آزاد کروا دیا۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ میں نہیں سکھاتا بلکہ وہ مجھے سکھاتے تھے۔

آٹھواں اعتراض

آٹھواں اعتراض یہ تھا کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اسے کلام حاصل ہوتا ہے اور گو کفار کا کوئی قول اس اعتراض کے متعلق نقل نہیں کیا گیا مگر اس اعتراض کے

اشارے ضرور پائے جاتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۴۳
شیطان اس کلام کولیکر نہیں اُترے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۴۴
یہ شیطان رجیم کا قول نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا یہ بھی اعتراض تھا کہ اس پر شیطان اُترتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس اعتراض کو اور پکا کر دیا ہے اور کفار کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفارِ مکّہ کے سردار جمع ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپؐ کے پاس ادنیٰ درجہ کے لوگ آتے ہیں اور بڑے لوگ آپ کی باتیں نہیں سنتے۔ اگر آپ دین میں کچھ نرمی کر دیں تو ہم لوگ آپ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی آپ کے پاس آنے لگیں گے۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو پھر بڑے بڑے لوگ مان لیں گے۔ (مجھے کیا ہی لطف آیا اس شخص کے اس فقرہ سے جس کا نام نولڈکے ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ یہ روایت بنانے والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے جیسا ہی بیوقوف سمجھتے تھے۔'' غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دین میں نرمی کرنے کا خیال آیا۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے اور سورۃ نجم پڑھنی شروع کی۔ اس وقت شیطان نے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۴۵ کے بعد یہ کلمات آپؐ کی زبان پر جاری کر دیئے کہ وَتِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى۔ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کیا تم نے لات اور عُزّٰی اور منات کی حقیقت نہیں دیکھی۔ یہ بہت خوبصورت دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی بڑی امید ہے۔ چونکہ سورہ نجم کے آخر میں سجدہ آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کر دیا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ آپؐ نے دین میں نرمی کر دی ہے اور بُتوں کو مان لیا ہے۔

اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجر جیسے آدمی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔ گو تاریخی طور پر یہ روایت بالکل غلط ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ محض جھوٹ ہے مگر اس وقت میں کسی تاویل میں نہیں پڑتا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے اور کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہوا؟

اس موقع پر میں ایک مسلمان بزرگ کا قول بھی بیان کرتا ہوں جو مجھے بے انتہا پسند ہے میں تو

جب بھی یہ قول پڑھتا ہوں ان کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ یہ بزرگ قاضی عیاض ہیں۔ وہ فرماتے ہیں شیطان نے رسول کریم ﷺ پر تو کوئی تصرف نہیں کیا البتہ بعض محدثین کے قلم سے شیطان نے یہ روایت لکھوادی ہے۔ گویا اگر شیطان کا تسلّط کسی پر کرانا ہی ہے تو کیوں نہ محدثین پر کرایا جائے۔ رسول کریم ﷺ کو درمیان میں کیوں لایا جائے۔

بعض نادان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سورۃ نجم پڑھتے ہوئے یہ آیتیں بھی پڑھ دیں۔ اس پر جبریل نازل ہوا اور اس نے کہا آپؐ نے یہ کیا کیا۔ میں تو یہ آیتیں نہیں لایا تھا یہ تو شیطان نے جاری کی ہیں۔ یہ معلوم کر کے رسول کریم ﷺ کو سخت فکر ہوا۔ خدا تعالیٰ نے اس فکر کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ [۴۶] فرمایا تم سے پہلے بھی کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا گیا کہ جب اس کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی تو شیطان نے اس میں دخل نہ دے دیا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی بات کو مٹا دیتا ہے اور جو اس کی اپنی طرف سے ہوتی ہے اسے قائم رکھتا ہے۔

کہتے ہیں جب یہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو رسول کریم ﷺ کی تسلی ہوگئی۔ تسلی کس طرح ہوئی اسی طرح جس طرح اس بڑھیا عورت کی ہوگئی تھی جس سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا کُبڑا پن دور ہو جائے یا یہ کہ دوسری عورتیں بھی تمہاری طرح کُبڑی ہو جائیں۔ اس نے کہا مجھ پر تو دوسری عورتوں نے جس قدر ہنسی کرنی تھی کر لی ہے۔ اب باقی عورتیں بھی کُبڑی ہو جائیں تا کہ میں بھی ان پر ہنسوں۔

اس روایت کو درست قرار دینے والوں کے نزدیک رسول کریم ﷺ کی کس طرح تسلی ہوئی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو کہہ دیا کہ تم پر ہی شیطان کا قبضہ نہیں ہوا سب نبیوں پر ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ کا فکر دور ہو گیا۔ کتنی نامعقول بات ہے۔ ان لوگوں نے کبھی اتنا بھی نہ سوچا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شیطان کا ہر نبی اور رسول پر قبضہ پالینا بڑی حکمت کی بات ہے اور پھر علیم کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

میں بیان کرر ہا تھا کہ ایک بزرگ کے قول سے مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ان کا نام قاضی عیاض ہے۔ وہ اس قسم کی روایتیں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان سے یہ تو پتہ لگ گیا کہ شیطان کا تصرف ہوا مگر رسول کریم ﷺ پر نہیں بلکہ ان روایتوں کو نقل کرنے والوں کی قلموں پر ہوا ہے۔ یہ بہت ہی لطیف بات ہے۔

قرآن کریم نے اس کا جو جواب دیا ہے۔ وہ اسی جگہ موجود ہے جہاں کہتے ہیں کہ شیطان نے آیتیں نازل کیں یعنی تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى۔ وَاَنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کے بعد کہتے ہیں کہ یہ آیات اُتریں۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ اِنْ هِىَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ۔ [۲۷] فرمایا کیا تم اپنے لئے تو بیٹے قرار دیتے ہو اور خدا کے لئے لات، منات اور عزّٰی بیٹیاں۔ یہ کس قدر بھونڈی تقسیم ہے جو تم نے کی۔ یہ نام تم نے اپنے طور پر رکھ لئے ہیں۔ خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئے۔خدا نے تو ان بتوں کے لئے اُتارا ہی کچھ نہیں۔

کیا ان آیات کے بعد کوئی شخص ان فقروں کو درمیان میں شامل سمجھ سکتا ہے۔پس یہ آیات ہی بتارہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل نہیں ہوسکتے۔آخر کفار عربی تو جانتے تھے۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتیں بھی اس حصہ کو رڈ کر رہی ہیں۔فرمایا وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ۔ وَمَا يَنْۢبَغِىْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ۔ [۲۸] یعنی اس میں شیطانی کلام کا اس قدر رڈ ہے کہ اسے شیطان اُتار ہی کس طرح سکتا ہے۔(۲) پھر اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا چاہیں تو ملا ہی نہیں سکتے۔ کہیں کوئی عبارت کھپ ہی نہیں سکتی جو کچھ ملائیں گے بے جوڑ ہوگا۔ جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔ پھر آگے چل کر فرماتا ہے۔ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ۔ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۔ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ [۲۹] کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس طرح اُترتے ہیں۔شیطان کا تعلق ہر اَفَّاك اور اَثِيْم کے ساتھ ہوتا ہے یعنی جو بڑا بولنے والا اور گنہگار ہو اس سے شیطان کا تعلق ہوتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو تم خود کہتے ہو کہ اس سے بڑھ کر سچا اور کوئی نہیں۔ اس کے امین ہونے کے بھی تم قائل ہو۔ پھر اس پر شیطان کا تصرف کس طرح ہوسکتا ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ

لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۵۰ کہ شیطان تو اپنی وحی شیطانوں کی طرف کرتا ہے تا کہ وہ تم سے جھگڑیں مومنوں کی طرف نہیں کرتا۔

اب دیکھو وہ روایتیں جو بیان کی جاتی ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسا خطرناک الزام لگاتی ہیں۔شیطان تو اپنے دوست کو ہی کہے گا۔کہ یہ ہتھیار لے جا اور لڑ۔کسی مسلمان کو وہ اپنے خلاف کس طرح بتائے گا۔

اس طرح سورۃ نحل رکوع ۱۳ میں آتا ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۔ ۵۱ یعنی شیطان کا مومنوں پر کوئی تسلط نہیں ہوسکتا جو خدا پر توکل رکھتے ہیں۔شیطان کی حکومت تو انہی پر ہوتی ہے جو اس کے دوست ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری عمر شرک کا رڈ کرتے رہے۔ان سے شیطان کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

نواں اعتراض

نواں اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ یہ شخص مفتری اور کذّاب ہے۔سورۃ صٓ میں آتا ہے۔دشمنوں نے کہا۔هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ اسی طرح سورۃ نحل ۱۴ میں آتا ہے۔قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۵۲ مخالف کہتے ہیں کہ تو مفتری ہے۔اللہ تعالیٰ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ ۵۳ فرمایا یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور سے بنایا ہی نہیں جاسکتا۔اس کے اندر تو پہلی کتابوں کی پیشگوئیوں کی تصدیق ہے۔پھر اس کے اندر الہامی کتابوں کی تفصیل ہے اور اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔یہ کتاب ربّ العٰلمین کی طرف سے ہے۔یہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے پاس سے بنالی ہے۔ان سے کہو کہ تم اس جیسی کوئی ایک ہی سورت لے آؤ۔اکیلے نہیں سب کو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم واقع میں سچے ہو۔

قرآن کریم کے متعلق پانچ دعوے

اس آیت میں پانچ دعوے قرآن کریم کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن اپنی دلیل آپ ہے اور اسے خدا کے سوا کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایسے امور ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں یعنی امور غیبیہ۔ فرماتا ہے۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ [54] کہ آسمان اور زمین میں خدا کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ قرآن میں غیب کی باتیں ہیں اور یہ خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔

دوسرا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی کتابوں کی پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس میں پہلی کتابوں کی تشریح ہے۔

چوتھا یہ کہ ہر امر کو دلیل کے ساتھ ایسے رنگ میں بیان کرتا ہے کہ اس کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ پانچواں یہ کہ قرآن خدا کی صفت رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے ماتحت نازل ہوا ہے تاکہ اس کا فیضان سب قوموں کے لئے وسیع ہو۔

فرماتا ہے اگر قرآن افترا ہے تو ان پانچ صفات والی کوئی سورۃ پیش کرو۔ اگر ان صفات والی سورۃ لے آؤ گے تو ہم مان لیں گے کہ انسان ایسی کتاب بنا سکتا ہے لیکن اگر تم سارے مل کر بھی نہ بنا سکو تو معلوم ہوا کہ ایسی کتاب کوئی انسان نہیں بنا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس سورۃ (یونس) میں یہ دعوے کئے گئے ہیں اس سے پہلے جس قدر قرآن اُتر چکا تھا۔ اس میں یہ پانچ باتیں پائی جاتی تھیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کے اس حصہ میں یہ پانچوں باتیں ہیں۔ اگر ہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔

علمِ غیب

پہلی بات یہ بیان فرمائی ہے کہ قرآن میں وہ باتیں ہیں جو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یعنی قرآن میں علم غیب ہے۔ اس کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو اس کی نہایت ابتدائی سورتوں میں سے ایک سورۃ کوثر ہے جو ایک عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق دشمن کہا کرتا کہ یہ ابتر ہے۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ اس کے بعد اس کا جانشین کون بنے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں فرماتا ہے کہ تو ابتر نہیں بلکہ تیرا دشمن ابتر ہے۔ رسول کریم ﷺ کس طرح ابتر نہیں اور آپ کا دشمن کس طرح ابتر ہے۔ اس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تیرے متعلق فیصلہ کر دیا ہے کہ ہم تجھے ایک عظیم الشان جماعت دیں گے جو روحانی طور پر تیری فرزند ہوگی اور اس میں بڑے بڑے اعلیٰ پایہ کے انسان ہوں گے۔ پھر فرماتا ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس خوشی میں خوب نمازیں پڑھ، دُعائیں کر اور قربانیاں کر۔ پھر جب ہم تیری جماعت کو اور بڑھانے لگیں تو تُو اور عبادت کر اور قربانیاں کر کیونکہ ہم تیری روحانی نسل کو بڑھانے والے ہیں اور یہ روحانی نسل اس طرح بڑھے گی کہ ابوجہل کا بیٹا چھینیں گے اور تجھے دے دیں گے۔ وہ ابتر ہو جائے گا اور تو اولاد والا ہوگا۔ یہی حال دوسروں کا ہوگا۔ ان کے بیٹے چھین چھین کر ہم تمہیں دے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کے بیٹے رسول کریم ﷺ کو دیئے گئے اور وہ روحانی لحاظ سے ابتر ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ جوں جوں رسول کریم ﷺ کو کامیابی ہوتی گئی۔ کفار زیادہ تکلیفیں دیتے گئے۔ اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا جو سورۃ کوثر میں بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ انبیاء رکوع ۴ میں ذکر کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ ۵۵ فرمایا کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے کہ ہم ان کے ملک کو اس کے کناروں کی طرف سے چھوٹا کرتے جا رہے ہیں اور ہر روز ان کی اولادیں محمد رسول اللہ ﷺ کو دے رہے ہیں۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ غالب آئیں گے۔ وہ غالب کس طرح آسکتے ہیں جب کہ ہم ان کے جگر گوشے کاٹ کاٹ کر تیرے حوالے کرتے جا رہے ہیں اور انہی ابتر کہنے والوں کے بچے اور عزیز اسلام میں داخل ہو کر اس کی صداقت ظاہر کر رہے ہیں اور کفار کو بے اولاد اور آنحضرت ﷺ کو با اولاد ثابت کر رہے ہیں۔ چنانچہ مکہ کے بڑے بڑے خاندانوں کے جو بیٹے اور بھتیجے رسول کریم ﷺ کو دیئے گئے ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ارقم بن ابی

ارقمؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ تھے۔ یہ لوگ ابتداء میں ہی ایمان لے آئے تھے اور وہ رؤساء جو رسول کریم ﷺ کو دکھ دینے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے یہ ان کے بیٹے اور بھانجے اور بھتیجے تھے۔ ان کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے کفار کو اور زیادہ غصہ آتا کہ یہ اپنے باپ دادا کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ، ولید بن مغیرہ کے عزیز تھے اور اس نے ان کو پناہ دی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ ایک دن باہر جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان پر سخت ظلم کیا جا رہا ہے مگر آپ کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ انہوں نے ولید کے پاس جا کر کہا کہ میں اب آپ کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا کیونکہ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ دوسرے مسلمانوں کو تو اس طرح دکھ دیا جائے اور میں آپ کی پناہ میں محفوظ رہوں۔ اللہ تعالیٰ مومن کے ایمان کی آزمائش کرتا ہے۔ ادھر انہوں نے پناہ ترک کی اور ادھر یہ حادثہ پیش آ گیا کہ لبید جو ایک بہت بڑے شاعر تھے ایک مجلس میں شعر سنا رہے تھے کہ ایک شعر انہوں نے پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر چیز خدا کے سوا تباہ ہونے والی ہے اور ہر نعمت آخر میں زائل ہونے والی ہے۔ جب لبید نے پہلا مصرع پڑھا تو حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ اس پر لبید نے غصہ سے اس کی طرف دیکھا کہ ایک بچہ میرے کلام کی داد دے رہا ہے۔ اسے اس نے اپنی ہتک سمجھا اور کہا اے مکہ والو! پہلے تو تم میں ایسے بدتہذیب لوگ نہ تھے۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ بے وقوف بچہ ہے۔ اسے جانے دیں حالانکہ بات یہ تھی کہ انہوں نے قرآن سنا ہوا تھا اور اب ان کے نزدیک شعروں کی کچھ حقیقت ہی نہیں رہ گئی تھی بلکہ خود لبید نے مسلمان ہونے پر یہی طریق اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے ایک گورنر کو کہلا بھیجا کہ مجھے بعض مشہور شعراء کا تازہ کلام بھجواؤ۔ جب ان سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا تو انہوں نے قرآن کریم کی چند آیات لکھ کر بھیج دیں۔

جب لبید نے دوسرا مصرع پڑھا اور کہا کہ ہر نعمت زائل ہونے والی ہے تو عثمانؓ نے کہا یہ غلط ہے جنّت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ یہ سن کر اسے طیش آ گیا اور اس نے اہل مجلس سے کہا کہ تم نے میری بڑی ہتک کرائی ہے۔ اس پر ایک شخص نے عثمانؓ کو برا بھلا کہا اور اس زور سے مکّا مارا کہ ان کی آنکھ نکل گئی۔ ولید کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا دیکھا میری پناہ میں سے نکلنے کا یہ نتیجہ ہوا۔

اب بھی پناہ میں آجاؤ۔ حضرت عثمانؓ نے کہا پناہ کیسی۔ میری تو دوسری آنکھ بھی انتظار کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں نکلے۔ ان کے فوت ہونے پر رسول کریم ﷺ نے انہیں بوسہ دیا اور آپؐ کی آنکھوں سے اس وقت آنسو جاری تھے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحبزادہ ابراہیمؓ فوت ہوا تو آپؐ نے فرمایا اَلْحِقِیْ بِسَلَفِنَا الصَّالِحِ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ ۵۶ یعنی ہمارے صالح عزیز عثمان بن مظعون کی صحبت میں جا۔

پہلی کتب کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی کتاب

دوسرا دعویٰ قرآن کریم کے متعلق یہ کیا گیا ہے کہ یہ پہلی کتب کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی کتاب ہے۔ چنانچہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ میں آتا ہے۔

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے۔ تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔'' ۵۷

اس میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ نبی جو آنے والا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ہوگا گویا وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے ہی ہوگا نہ کہ کسی غیر قوم سے پھر اس کی علامت یہ بتائی کہ:۔

''جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی۔'' ۵۸

اب دیکھو قرآن کی باتیں کیسی پوری ہوئیں اور اس کی بیان کردہ پیشگوئیاں کس طرح سچی نکلیں۔ کفار نے جب رسول کریم ﷺ کے متعلق کہا کہ اس کی اولاد نہیں تو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہم اسے اولاد دیں گے اور ابتر کہنے والوں کی اولاد ہی چھین کر دے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ پیشگوئی بڑی شان سے پوری ہوئی۔

حضرت مسیحؑ نے اس پیشگوئی کا مصداق ہونے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ یوحنا باب ۱ آیت ۲۱ میں لکھا ہے:۔

''انہوں نے اس سے پوچھا۔ پھر کون ہے۔ کیا تو ایلیاہ ہے۔ اس نے کہا۔ میں نہیں

ہوں۔کیا تو وہ نبی ہے۔اس نے جواب دیا کہ نہیں۔‘‘

اس طرح اعمال باب ۳ میں لکھا ہے کہ وہ نبی مسیح کی بعثت ثانی سے پہلے اور بعثتِ اوّل کے بعد ظاہر ہوگا بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ:-

’’سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنے نبیوں نے باتیں کیں ان سب نے ان دنوں کی خبر دی ہے۔‘‘[۵۹]

یہ پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری ہوئی کیونکہ آپ ان کے بھائیوں یعنی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھے۔

اسی طرح یسعیاہ آنے والے نبی کی خبر دیتے ہوئے کہتے ہیں:-

’’تب قومیں تیری راستبازی اور سارے بادشاہ تیری شوکت دیکھیں گے اور تو ایک نئے نام سے کہلائے گا۔ جسے خداوند کا مونہہ خود رکھ دے گا۔‘‘[۶۰]

سوائے اسلام کے دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس کا نام خدا تعالیٰ نے رکھا ہو۔ چنانچہ اسلام کے متعلق ہی فرمایا ہے۔ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ☆[۶۰]

دوسری پیشگوئی بھی اسی کے ساتھ لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ:-

’’تُو آگے کو متروکہ نہ کہلائے گی اور تیری سرزمین کا کبھی پھر خرابہ نام نہ ہوگا بلکہ تُو حفیصیاہ کہلائے گا۔‘‘[۶۱]

یہ پیشگوئی بھی اسلام کے متعلق ہی ہے۔ چنانچہ مکّہ کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا[۶۲] جو اس میں داخل ہو وہ امن میں آجاتا ہے۔

پھر حضرت مسیحؑ کہتے ہیں۔

’’مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔‘‘[۶۳]

اب دیکھو اس میں کتنی علامتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ آنے والا نبی ایسی تعلیم دے گا جو مسیح تک کسی نے نہیں دی۔ گویا وہ سب سے بڑھ کر تعلیم دے گا۔

(۲) وہ ساری باتیں کہے گا یعنی کامل تعلیم دے گا اور اس کے بعد اور کوئی اس سے بڑھ کر تعلیم نہیں لائے گا۔

(۳) وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ کلام اللہ لائے گا۔

(۴) اس کلام اللہ میں آئندہ کی خبریں ہوں گی۔

(۵) وہ کلام مجھ (یعنی مسیحؑ) پر دشمنوں کے عائد کردہ الزامات کو دُور کرے گا۔

یہ سب باتیں رسول کریم ﷺ پر صادق آتی ہیں۔ پہلی بات حضرت مسیحؑ نے یہ فرمائی تھی کہ وہ نبی ایسی تعلیم لائے گا جو پہلے کوئی نہیں لایا۔ قرآن کریم اس کے متعلق فرماتا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ یعنی قرآن کریم کے ذریعہ وہ وہ باتیں سکھائی گئی ہیں۔ جو کسی اور کو معلوم نہیں۔ دوسری بات حضرت مسیحؑ نے یہ بیان کی تھی کہ وہ ساری باتیں بتائے گا۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق آتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ آج سارا دین تم پر مکمل کر دیا گیا ہے۔ پھر سورہ کہف رکوع ۸ میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ۔ [۱۴] ہم نے اس قرآن میں ہر ضروری بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کر دیا ہے۔ تیسری بات حضرت مسیحؑ نے یہ بتائی تھی کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ خدا تعالیٰ اسے جو کچھ بتائے گا اسے پیش کرے گا۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى [۱۵] یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ خدا ہی کا کلام پیش کرتا ہے۔ باقی سب کتابوں میں انبیاء کی اپنی باتیں بھی ہیں۔ صرف قرآن ہی ایک ایسا کلام ہے جو سارے کا سارا خدا کا کلام ہے۔ پانچویں بات حضرت مسیحؑ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ نبی ان الزامات کو دُور کرے گا جو مجھ پر لگائے جاتے ہیں۔ اس کے متعلق سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو نَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَلَدُ الزِّنَا کہا گیا تھا اور لعنتی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن نے ان الزامات کی پوری تردید کی۔

کُتب سماویہ کی تفصیل

اب میں تفسیری بات بیان کرتا ہوں کہ قرآن کریم کُتب سماویہ کی تشریح اور تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اس میں علومِ روحانیہ کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اور انہیں کمال تک پہنچایا گیا ہے۔ میں اس کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

تورات میں لکھا تھا:۔

"تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان۔ آنکھ کا بدلہ آنکھ۔ دانت کا بدلہ دانت۔ ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا۔"[۶۶]

اور انجیل میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ:۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔"[۶۷]

مگر قرآن کریم نے کہا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔[۶۸]

یعنی شرارت کے مطابق بدی کا بدلہ لے لینا تو جائز ہے لیکن جو شخص معاف کر دے اور اس میں دوسرے کی اصلاح مدّنظر رکھے اللہ تعالیٰ اسے خود اجر دے گا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

تورات نے ایک حصّہ تو بیان کیا تھا اور دوسرا چھوڑ دیا تھا اور انجیل نے دوسرا حصّہ بیان کیا اور پہلا حصّہ چھوڑ دیا۔ قرآن کریم نے اس تعلیم کو مکمل کر دیا۔ فرمایا بدی کا بدلہ لے لینا جائز ہے لیکن جو شخص معاف کر دے ایسی صورت میں کہ بدی نہ بڑھے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ ہاں جو ایسے طور پر

معاف کرے کہ معافی دینے پر ظلم بڑھ جائے تو اس سے خدا ناراض ہوگا کیونکہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

صدقہ وخیرات اور مرد وعورت کے تعلقات کے متعلق تفصیلی احکام گذشتہ سال کے مضمون میں بیان کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ پہلی کتب میں ان امور کے متعلق صرف مختصر احکام دیئے گئے ہیں مگر قرآن کریم نے ہر ایک حکم کی غرض اور اس کے استعمال کی حدود وغیرہ تفصیل سے بیان کی ہیں۔

دلائل وبراہین سے مزیّن کلام

قرآن کریم کی چوتھی خصوصیت یہ بیان کی کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ ہر ایک امر کو دلیل سے بیان کرتا ہے اور شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ شک ہمیشہ ابہام سے پیدا ہوتا ہے مگر قرآن کریم کے دعووں کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ قرآن میں ہستی باری تعالیٰ، ملائکہ، دعا، نبوت، انبیاء کی ضرورت، قضاء وقدر، حشر ونشر، جنّت ودوزخ، نماز وروزہ، حج وزکوٰۃ اور معاملات وغیرہ کے متعلق دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ یونہی دعوے نہیں کئے گئے۔ مثلاً جنّت کے متعلق آتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتَانِ [۶۹] ہم یہ نہیں کہتے کہ مرنے کے بعد تمہیں جنّت ملے گی اور تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرنے کے بعد کیا معلوم جنّت ملے گی یا نہیں۔ قرآن اسی دنیا میں جنّت کا ثبوت پیش کرتا ہے اور مومنوں کو اسی دنیا میں جنّت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ دیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ [۷۰] یعنی وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر استقامت سے اسلام کی تعلیم پر قائم رہتے ہیں۔ ان پر فرشتے اُترتے ہیں جو انہیں کہتے ہیں کہ تم غم نہ کرو۔ تم کو جنّت کی بشارت ہو۔ گویا اسی دنیا میں انہیں خدا سے کلام کرنے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور جب خدا کا کلام مل گیا تو ریب کہاں رہ گیا۔

قرآن کریم کے ذریعہ صفت رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کا ظہور

پانچویں بات یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم کا اس حالت میں نزول ہوا کہ اس سے رَبُّ

الْعٰلَمِیْنَ کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض انسانوں میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انہیں عفو کی طرف توجہ دلائی جائے۔ بعض میں دیوثی اور بے غیرتی ہوتی ہے انہیں غیرت کی تعلیم دی گئی۔ انجیل نے اس کا خیال نہیں رکھا اس نے ہر حال میں عفو کی تعلیم دی ہے اور تورات نے عفو کا خیال نہیں رکھا ہر حالت میں سزا دینے پر زور دیا ہے مگر قرآن نے دونوں قسم کے لوگوں کا خیال رکھا ہے۔ پھر ہر زمانہ کا خیال رکھا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے۔ چنانچہ فرمایا قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ☆ [5] کہہ دے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

پس قرآن کریم سے پہلی کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے ساری دنیا کو دعوت دی ہو۔ انہوں نے دوسری قوموں کے لئے رستے بند کر دیئے۔ حضرت مسیحؑ کا انجیل میں یہ قول موجود ہے کہ:-

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔" [1]

اور یہ کہ:-

"لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔" [2]

گویا مسیح نے بنی اسرائیل کے سوا کسی اور کو ہدایت دینے سے انکار کر دیا۔

مگر قرآن میں سب قوموں کے ماننے کے لئے خدا تعالیٰ نے سامان جمع کر دیئے۔ مثلاً

(ا) سارے نبیوں کی تصدیق کی۔ اس سے سب کے دلوں میں بشاشت پیدا کر دی لیکن اگر کوئی ہندو عیسائی ہو تو اسے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بدھ اور کرشن جھوٹے ہیں اور اگر کوئی عیسائی ہندو ہو۔ تو اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا قرار دینا پڑتا ہے مگر کتنی خوبی کی بات ہے کہ قرآن نے کہہ دیا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [3] ہم نے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہماری طرف سے نذیر نہ بھیجا گیا ہو۔ اس بنا پر رسول کریم ﷺ نے تمام اقوام سے کہہ دیا کہ مجھے قبول کر کے تمہیں اپنے بزرگوں کو جھوٹا کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی سچے تھے۔ ہاں ان میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ ان کی تعلیم اس زمانہ کے لئے مکمل تھی جس میں وہ آئے

لیکن میں جو تعلیم لایا ہوں یہ ہر زمانہ کے لئے مکمل ہے۔

مفتری ہمیشہ ناکام ہوتا ہے

دوسری دلیل رسول کریم ﷺ کے مفتری نہ ہونے کی قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ مفتریوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۔ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ۔ [۲۷] یعنی لوگ کہتے ہیں کہ یہ نبی جھوٹ پیش کرتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا جھوٹ بنانے والے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں اور وہ عذاب سے ہرگز بچ نہیں سکتے۔ ان کا عذاب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے اور وہ سچی بات سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے کجا یہ کہ وہ سچی باتیں خود بنا سکیں۔ وہ عذاب سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں اور جب دنیا میں ان کا یہ حال ہوتا ہے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا۔

اس میں بتایا کہ مفتریوں کی تو یہ علامت ہوتی ہے کہ ان پر عذاب نازل ہوتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ پر تو کوئی عذاب نہیں آیا بلکہ خدا نے اس کی مدد کی ہے۔

دوسری علامت مفتری کی یہ ہوتی ہے کہ اس کا عذاب بڑھتا جاتا ہے مگر اس رسول کی تو ہر گھڑی پہلی سے اچھی ہے۔

(۳) پھر مفتری کو اپنی تعلیم بدلنی پڑتی ہے مگر کیا اس نے بھی کبھی قرآن کی کوئی بات بدلی پھر یہ مفتری کس طرح ہوسکتا ہے۔

وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کا صحیح مفہوم

دوسرا الزام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ لگایا گیا ہے کہ آپؐ نعوذ باللہ نبوت سے پہلے ضال تھے اور بعد میں بھی گناہ آپؐ سے سرزد ہوتے رہے۔ ان الزامات کی بنا خود قرآن کریم ہی کی

بعض آیات کو قرار دیا گیا ہے۔ ضال کے متعلق تو یہ آیت پیش کی جاتی ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۵؎ ہم نے تجھے ضال پایا پھر ہدایت دی۔ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے ضلالت کی کلی طور پر نفی کر دی ہے۔ فرماتا ہے۔ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى۔ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ ۶؎ ہم نجم کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ نجم اس بوٹی کو کہتے ہیں جس کی جڑ نہ ہو۔ فرمایا ہم اس بوٹی کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی جڑ نہیں ہوتی۔ جب کہ وہ گر جاتی ہے یعنی وہ جتنا اونچا ہونا چاہتی ہے اسی قدر گرتی ہے۔ اس شہادت سے تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا یہ صاحب کبھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ راستہ سے دور ہوا۔ ضَلَّ ظاہری گمراہی کے لئے آتا ہے اور غَوٰی باطنی فساد کے لئے جو فساد اعتقاد سے پیدا ہو۔

فرمایا جو بے جڑ کی بوٹی ہو اس پر تو جتنے زیادہ دن گذریں اس میں کمزوری آتی جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے تعلق نہ ہوتا تو اس کی جڑ مضبوط نہ ہوتی اور یہ کمزور ہوتا جاتا اور خرابی پیدا ہو جاتی مگر تم دیکھتے ہو کہ جوں جوں دن گذر رہے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہو رہی ہے اور یہ دن رات ظاہری اور باطنی طور پر ترقی حاصل کر رہا ہے۔ اگر ضلالت اس کے اندر ہوتی تو اس پر ضلالت والا کلام نازل ہوتا مگر اس پر جو کلام نازل ہوا ہے اسے دیکھو کیا اس میں کوئی بھی ہوائے نفس کا نشان ملتا ہے اگر یہ غاوی ہوتا تو شیطانی اثر اس کے کلام پر ہوتا لیکن اس کا کلام تو پُر شوکت اور قادرانہ کلام پر مشتمل ہے۔ شیطانی تعلقات والا انسان دنیا پر تصرف کیسے حاصل کر سکتا ہے۔

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۃ ضحیٰ میں بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۷؎ تیری ہر پیچھے آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہے۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ یہاں تو کہا کہ تیری ہر پچھلی گھڑی پہلی گھڑی سے اچھی ہوتی ہے لیکن اسی سورۃ میں کہہ دیا کہ تو گمراہ تھا۔ آیا پچھلی گھڑی کا پہلی سے اچھی ہونا ضلالت کی دلیل ہوتا ہے؟

سورۃ ابراہیم رکوع ۴ میں آتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ ۸؎ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کیسی باتیں بیان کرتا ہے۔ پاک کلمہ کی مثال ایک پاک درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑ میں بڑی

مضبوطی ہوتی ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسی طرح صادق کی علامت یہ ہے کہ اس کی تعلیم ترقی کرتی ہے اور اس کی جماعت بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہ رسول جو دن رات ترقی کر رہا ہے۔ اگر ضلالت پر ہوتا ہے تو جتنی زیادہ تعلیم بنتا تا اسی قدر زیادہ نقص ہوتے مگر اس کے کلام کی زیادتی تو اس کی تعلیم کو مکمل بنا رہی ہے۔

پھر بتایا۔ اگر یہ غاوی ہوتا تو شیطانی اثر اس کے کلام پر ہوتا مگر اس کا کلام تو ایسا ہے کہ وہ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۔ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ يُّوۡحٰى ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيۡدُ الۡقُوٰى ۔ [79]

یہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ اس کا پیش کردہ کلام صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے اور اس کو یہ کلام بڑی قوتوں والے خدا نے سکھایا ہے۔

ایک اور آیت بھی اس امر کو حل کرتی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں آتا ہے۔ وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ‌ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ خَلِيۡلًا ۔ [80] فرمایا قریب تھا کہ لوگ تجھے عذاب میں مبتلا کر دیں۔ عام طور پر لوگوں نے غلطی سے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ رسول کو پھسلا لیں مگر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پھسلا سکتے تھے۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ قریب ہے کہ یہ لوگ تجھے سخت عذاب دیں اس کلام کی وجہ سے جو تجھ پر وحی کیا گیا ہے تا کہ تو اس سے گھبرا کر کچھ تبدیلی کر لے اور اگر ایسا ہو تو یہ ضرور تجھے دوست بنا لیں لیکن ان کا خیال ایک جنون ہے وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـئًا قَلِيۡلًا ۔ [81] اگر ہم نے قرآن نہ بھی نازل کیا ہوتا تو بھی تیری فطرت ایسی پاک ہے کہ یہ بات تو بڑی ہے۔ تیری ان سے مشابہت پھر بھی معمولی سی ہوتی مگر اب تو تجھے وحی الٰہی نے ایک صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب ان کی یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ پھر وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کا کیا مطلب ہوا۔ سو اس کا جواب خود اسی سورۃ میں موجود ہے۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی ایک زبردست دلیل دی گئی ہے۔ فرماتا ہے وَالضُّحٰى ۔ وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۔ [82] اے دنیا کے لوگو سنو! عین دوپہر کے وقت کو اور رات کو جب وہ خوب ساکن ہو جاتی ہے اور اس کی تاریکی چاروں طرف پھیل جاتی ہے ہم اس بات کی شہادت میں پیش کرتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کو ہم نے کبھی نہیں چھوڑا اور نہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہم کبھی ناراض ہوئے ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ دوپہر اور آدھی رات اس بات کی کس طرح دلیل ہیں کہ محمد ﷺ سے خدا کبھی ناراض نہیں ہوا اور نہ اس نے آپ کو چھوڑا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں ظاہری دن رات مراد نہیں بلکہ مجازی دن رات مراد ہیں اور یہ محاورہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے کہ رات اور دن سے خوشی اور رنج اور ہوش اور غفلت کا زمانہ مراد لیا جاتا ہے۔ رات تاریکی، مصیبت اور جہالت کو کہتے ہیں اور دن ترقی، روشنی اور علم کے زمانہ کو کہتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تیری عمر کی ان گھڑیوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو خوشی کی تھیں اور ان کو بھی پیش کرتے ہیں جو رنج کی تھیں اور تیرے ہوش کے زمانہ کو بھی اور بچپن کے زمانہ کو بھی جو جہالت کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر اس زمانہ کو بھی جو نبوت سے پہلے کا تھا اور اسے بھی جب نبوت کا سورج طلوع ہو کر نِصْفُ النَّهَار پر آ گیا۔ تجھ پر وہ زمانہ بھی آیا۔ جب کہ تو دایہ کی گود میں تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جو شباب کی تاریکی کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ زمانہ بھی آیا جب جذبات سرد ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جب کہ ہر طرف تیرے دشمن ہی دشمن تھے اور تیرے لئے دن بھی رات تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب ساری قوم تجھے امین اور صادق کہتی تھی۔ ان سب زمانوں کو دیکھ لو۔ کیا کوئی وقت بھی ایسا آیا ہے جب خدا تعالیٰ نے تیری نصرت سے ہاتھ روکا ہو اس کی ناراضگی کسی رنگ میں تجھ پر ظاہر ہوئی ہو۔ بعض لوگ آرام اور عزت حاصل ہونے پر بگڑ جاتے ہیں مگر تجھے جب امن ہوا امیر بیوی ملی، تیری قوم نے تیری عزت کی اس وقت بھی تو نے اچھے کام کئے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ خدا نے اپنا کلام تجھ پر اُتارا۔ تب بھی تو فرمانبردار رہا۔ گویا تیری ہر آنے والی گھڑی پہلی سے اعلیٰ اور بہتر رہی ہے اور خدا کی تائید اور اس کی پسندیدگی بڑھتی چلی گئی۔ اب دیکھو رسول کریم ﷺ کی صداقت کی یہ کتنی بڑی دلیل ہے۔ عجیب بات ہے خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اس کی ساری زندگی بچپن سے لے کر آخر تک دیکھ لو۔ ایک لحہ بھی اس کے لئے گمراہی کا نہیں آیا اور خدا تعالیٰ نے اسے نہیں چھوڑا مگر نادان مخالف کہتے ہیں کہ آپ گمراہ تھے۔ اگر یہی گمراہی ہے تو ساری ہدایت اس پر قربان کی جا سکتی ہے۔
پھر فرماتا ہے۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ۔ تیرا ہر قدم ترقی کی طرف چلتا گیا۔ بچپن میں انسان بے گناہ ہوتا ہے۔ اگر نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ بڑے ہو کر گمراہ ہو گئے تو آخرت اولیٰ

سے بہتر نہ ہوئی مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیری ہر اگلی گھڑی پہلے سے اچھی تھی اور جب ہر اگلی گھڑی اچھی تھی تو ضلالت کہاں سے آ گئی۔

پھر فرماتا ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ ۸۳ عنقریب اللہ تعالیٰ تجھے ایسے انعام دے گا کہ تو خوش ہو جائے گا۔ اس کے متعلق ہم قرآن کریم سے دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی وہ کونسی خواہش تھی جس کے پورا ہونے سے آپ خوش ہو سکتے تھے۔ سورہ کہف رکوع ۱ میں آتا ہے۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۸۴ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنے آپ کو اس لئے ہلاک کر رہا ہے کہ لوگ ہمارے کلام پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ یہ خواہش تھی رسول کریم ﷺ کی کہ آپؐ کی قوم خدا تعالیٰ کے کلام کو مان لے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى تو نے دیکھا ہے کہ تیری ہر گھڑی کو ہم نے پہلی سے اچھا رکھا پھر کیا تمہاری یہ بات ہم رڈ کر دیں گے کہ تیری قوم ہدایت پا جائے۔ ہمیں اس خواہش کا بھی علم ہے اور اسے بھی ہم پورا کر دیں گے۔

پھر فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ ۸۵ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو یتیم تھا جب پیدا ہوا۔ اس یتیمی کے وقت سے خدا نے تم کو اپنی گود میں لے لیا۔ گویا کوئی وقت خدا کی گود سے باہر آپؐ پر آیا ہی نہیں۔ اٰوٰی کے معنی ہیں قرب میں جگہ دی۔ فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى کیا خدا نے تم کو یتیم پا کر اپنے پاس جگہ نہیں دی۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اب اس کے معنی اگر یہ کئے جائیں کہ تجھے گمراہ پایا پھر ہدایت دی تو یہ معنی یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے۔ پس اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم نے تجھ میں محبت کی تڑپ دیکھی اور دنیا کی ہدایت کا سامان دے دیا۔ ان معنوں کی تائید ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے تو انہیں گھر والوں نے کہا۔ تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ۸۶ یوسف کی پرانی محبت تیرے دل سے نکلتی ہی نہیں۔ تو ابھی تک اسی پرانی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کو گمراہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ یوسف علیہ السلام کی محبت میں کھویا ہوا سمجھتے تھے۔ اس لئے ضَلَال کا لفظ انہوں نے شدت محبت کے متعلق استعمال کیا۔ پس وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے یہ معنی ہیں کہ جب تو جوان ہوا اور تیرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ خدا سے ملے بغیر میں

آرام نہیں پا سکتا تو ہم نے تجھے فوراً آواز دی کہ آجا، میں موجود ہوں۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے معلوم ہے کہ جب ہم نے ہدایت دی تو وہ تیرے نفس کے لئے ہی نہ تھی بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی۔ پس لوگ تیرے پاس آئے اور مختلف طبائع کے لوگ آئے پھر ہم نے ان کی کفالت کے لئے قرآن کے ذریعہ تجھے وہ رزق دیا جو ہر فطرت کے انسان کے لئے کافی تھا۔ پس وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى [۸۷] اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے کثیر العیال پایا اور اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ [۸۸] پس اب تو بھی ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالنا کہ ان کی طاقتیں کچلی جائیں نہ اتنی رعایت کرنا کہ بگڑ جائیں۔ اس آیت میں ضَآلّ کے مقابل پر سَآئِل رکھا گیا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہاں بھی ضَآلّ سے مراد خدا کی محبت کے طلبگار کے ہیں۔ بہرحال فرمایا کہ جب کوئی تمہارے پاس ہدایت حاصل کرنے کے لئے آئے تو انکار نہ کرنا بلکہ وہ ہدایت جو ہم نے تجھے دی ہے اسے ساری دنیا میں پہنچانا۔

ضَآلّ کے جو معنی میں نے اس وقت کئے ہیں اس کے خلاف کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۔ ہم نے تجھے ضال پایا اور اس کے نتیجہ میں ہدایت دی اور دوسری طرف فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [۸۹] کہ فسق کے نتیجہ میں کبھی ہدایت نہیں ملا کرتی۔ پھر ضَآلّ کے معنی گمراہ کس طرح کئے جا سکتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ۔ [۹۰] جب ان کے پاس کوئی نشان آتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اسے نہیں مان سکتے جب تک ہمیں ویسا ہی کلام نہ ملے جو رسولوں کو ملا۔ اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔ یہ گناہگار لوگ ہیں۔ ان کو تو ذلت ہی ملے گی۔ اس آیت میں صاف طور پر بتا دیا کہ گناہ کے نتیجہ میں ذلت حاصل ہوتی ہے نہ کہ ہدایت۔

ذَنْب اور اِسْتِغْفَار کی حقیقت

پھر یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ گناہگار تھے۔ اس کے لئے ذَنْب اور

اِسْتِغْفَار کے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں لیکن عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی نہیں سمجھے۔ اِسْتِغْفَار کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ جو مشکلات کسی کے رستہ میں حائل ہوں ان کو ڈھانپ دیا جائے۔ اسی طرح ذَنْب کے معنی گناہ کے بھی ہوتے ہیں اور غیر ضروری باتوں کے بھی۔ پس غَفَر کے معنی ڈھانکنے اور ذَنْب کے معنی زوائد کے ہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اِستِغْفَار کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد آپؐ کے رستہ کی مشکلات کا دُور ہونا ہوتا ہے اور جہاں ذَنْب کا لفظ آتا ہے وہاں زوائد کا دور کیا جانا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھو سورۃ نساء رکوع ۱۶ میں پہلے جنگ کا ذکر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۔ وَّاسْتَغْفِرِ اللهَ[91] اے محمد رسول اللہ جب ہم حکومت دیں گے تو کچھ لوگ ایسے ہونگے جو دین کی باتوں میں خیانت سے کام لیں گے اور کجی کا راستہ اختیار کریں گے ان سے لڑنے کی طرف توجہ نہ کرنا بلکہ بجائے اس کے خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرنا کہ ان کی یہ کمزوری دور ہو جائے۔ (۲) سورہ مومن رکوع ۶ میں بھی پہلے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا[92] فرما کر نصرت کا ذکر ہے اور پھر وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ[93]۔ میں استغفار اور تسبیح کا حکم دیا ہے سورۃ محمد رکوع ۲ میں بھی پہلے ساعت کے آنے کا ذکر ہے یعنی فتح کا اور پھر وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ[94] فرماتا ہے۔ (۴) سورۃ نصر میں بھی پہلے فتح کا ذکر ہے اور پھر آتا ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ[95] (۵) سورۃ فتح میں بھی پہلے فتح کا ذکر ہے اور پھر غفر کا۔ فرمایا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ[96] ان سب حوالوں میں فتح کے ساتھ ذَنْب یا اِسْتِغْفَار کا ذکر ہے یعنی یا تو فتح کے وعدہ کے بعد یا فتح کے ذکر کے بعد۔ چار جگہوں میں تو فتح کے وعدہ کے ساتھ استغفار کا ذکر کیا ہے اور ایک جگہ فتح مبین کا ذکر ہے اور وہاں لِيَغْفِرَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تیری دعا سنی گئی اور ہم نے عام فتوحات کی بجائے تجھے فتح مبین عطا کی ہے تا کہ تیرے ذَنْب بخشے جائیں۔

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ کسی کو فتح و نصرت کا ملنا کیا گناہ ہے اور ہر جگہ فتح کے ساتھ یہ الفاظ کیوں آئے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ استغفار اور ذنب کسی اور قسم کا ہے۔ اگر گناہ مراد تھا تو چاہئے تھا کہ کسی گناہ کا ذکر کیا جاتا مگر ایسا تو ایک جگہ بھی نہیں کیا گیا بلکہ بجائے اس کے یہ بتایا کہ ہم

تجھے فتح و نصرت دیتے ہیں۔ تُو استغفار کر۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس کے معنی کچھ اور ہیں اور وہ یہ کہ فتح کے ساتھ جو لوگ سلسلہ بیعت میں شامل ہو جاتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں ان کی تربیت پوری طرح نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے زوال کا وقت اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جب کہ فتوحات شروع ہوتی ہیں اور لوگوں کی تربیت اچھی طرح نہیں ہو سکتی۔ جب لاکھوں مسلمان ہو گئے اور وہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے تو ان کی تربیت ناممکن تھی۔ اس لئے فرمایا یہ بات بشریت سے بالا ہے کہ اتنے لوگوں کی پوری طرح تربیت کی جا سکے۔ ان کی تربیت خدا ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے دعائیں کر کہ خدا یا تو ہی ان کی نیک تربیت کا سامان پیدا فرما اور پھر خوشخبری دی کہ ہم نے تمہاری دُعائیں سن لی ہیں۔ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ ہم تجھ کو جو فتح عظیم دیں گے وہ ایسی صورت میں دیں گے کہ وہ فتح مبین ہوگی حق و باطل میں تمیز کر دینے والی ہوگی اور صرف جسموں پر ہی نہیں ہوگی بلکہ دلوں پر بھی ہوگی۔ لوگ منافقت سے اسلام میں داخل نہیں ہونگے بلکہ دین کے شوق کی وجہ سے ہونگے اور یہ فتح ہم نے اس لئے دی ہے کہ تربیت کا پہلو مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حق کو واضح کر کے تربیت کے پہلو کو مضبوط کر دیا اور ایسے نائب آپؐ کو بخشے جو ہمیشہ کے لئے دین کے محافظ ہو گئے۔ دیکھ لو ایک تو وہ وقت تھا کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مکّہ چھوڑ کر اس لئے بھاگ گیا کہ جہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو وہاں میں نہیں رہ سکتا مگر پھر وہ وقت آیا کہ وہ مسلمان ہوا اور ایسا مخلص مسلمان ہوا کہ ایک جنگ میں دشمن چُن چُن کر صحابیوں کو مار رہے تھے۔ عکرمہ نے کہا یہ بات مجھ سے دیکھی نہیں جاتی کوئی ہے جو دشمن کے مقابلہ کے لئے میرے ساتھ چلے۔ اس طرح کچھ آدمی ساتھ لئے اور جرنیل سے اجازت لے کر دشمن پر جس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی حملہ کر دیا اور عین قلب پر حملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ گئے۔ اس وقت عکرمہ کو دیکھا گیا تو وہ دم توڑ رہے تھے۔ ان کی پیاس محسوس کر کے جب پانی لایا گیا تو انہوں نے کہا۔ پہلے میرے ساتھی کو پانی پلاؤ۔ اس ساتھی نے دوسرے کی طرف اشارہ کر دیا اور دوسرے نے تیسرے کی طرف وہ سات نوجوان تھے جو زخموں کی وجہ سے دم توڑ رہے تھے مگر کسی نے پانی کو مونہہ بھی نہ لگایا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ پہلے فلاں کو پلاؤ مجھے بعد میں پلا دینا۔ جب سب نے انکار کر دیا تو وہ پھر عکرمہ

کے پاس آیا دیکھا تو وہ فوت ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اس نے دوسروں کو دیکھا تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔

غرض خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ظاہری فتح ہی عطا نہیں فرمائی بلکہ ظاہری فتح کے ساتھ قلوب کی فتح بھی عطا کی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند ترین مقام

پھر قرآن نہ صرف یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے گناہ قرار دیتا ہے بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کا انسان قرار دیتا ہے۔ فرماتا ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کوئی یہ نہ کہے کہ ہمارا نبی گنہگار ہے۔ اگر دشمن ایسا کہتے ہیں تو وہ بکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تو بڑے اعلیٰ اخلاق والا ہے۔

پھر فرمایا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ [97] اے محمد رسول اللہ! کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔

پھر فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [98] تمہارے لئے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے اس کے پیچھے چل کر تم نجات پا سکتے ہو۔

پھر اس سے بھی بڑا درجہ آپ کا یہ بیان فرمایا کہ آپ دوسروں کو پاک کرنے والے ہیں۔ فرماتا ہے۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ ۔[99] ہم نے تم میں سے ہی ایک رسول بھیجا ہے جو ہماری آیتیں پڑھ کر تمہیں سناتا ہے اور گناہگاروں کو پاک بناتا ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ تو کہہ دے کہ اے ماننے والو یا مجھ پر اعتراض کرنے والو! اگر تم اللہ کا محبوب بننا چاہتے ہو تو آؤ اس کا طریق میں تمہیں بتاؤں۔ جس طرح میں عمل کرتا ہوں اسی طرح تم بھی عمل کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ تم کو بھی اپنا محبوب بنا لے گا۔

پھر اس سے بھی آگے ترقی کی اور فرمایا کہ محمد رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہ ہے کہ اس پر جو کلام نازل ہوا ہے اسے بھی ہم کسی ناپاک کو چھونے نہیں دیتے۔ پھر کیا اس کلام کو لانے والا ناپاک

ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ۔ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ [۵۱] یہ قرآن بڑی عظمت والا ہے۔ یہ اس جگہ خدا نے رکھا ہے جہاں کوئی گندہ شخص اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا اور اسے مطہر کے بغیر کوئی چھو ہی نہیں سکتا۔ پھر جس پر یہ کلام نازل ہوا اسے ناپاک کس طرح کہہ سکتے ہو۔

پھر فرمایا ہم نے اسے وہ کتاب دی ہے جس کو آج ہی نہیں بلکہ آئندہ بھی کوئی ناپاک نہیں چھو سکے گا۔ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ۔ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ [۵۲] یہ ہمیشہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی جو دور دور سفر کرنے والے اور نہایت معزز اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہونگے۔

اس وقت یہ دو ہی اعتراض بیان کئے جا سکے ہیں اور وہ بھی بہت مختصر طور پر۔ اب میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دوستوں کو جو اس جلسہ میں شامل ہوئے ہیں اپنی نعمتوں کا وارث بنائے اور وہ جنہوں نے مہمان نوازی میں حصّہ لیا ہے۔ مرد اور عورتیں، چھوٹے اور بڑے ان سب پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ پھر ان پر اپنا فضل نازل کرے جن کے دل اس جلسہ میں شامل ہیں گو وہ خود نہیں آ سکے۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کے سب لوگوں کو توفیق دے کہ جو نور اور صداقت انہیں حاصل ہوئی ہے وہ دنیا کو پہنچائیں۔ ہماری جماعت کے خطا کاروں کو نیک بناوے۔ ہماری جماعت کے کمزوروں کو مضبوط بناوے۔ ہماری جماعت کے بیماروں کو شفا دے۔ ہماری جماعت کے مقروضوں کو قرض سے سبکدوش کرے۔ جن میں ایمان کی کمزوری ہے ان کی اس کمزوری کو دُور کرے۔ ہماری جماعت کے مبلغوں کی مدد اور تائید کرے خدا کے فرشتے ان کی حفاظت کریں۔ وہ اللہ کے محبوب بن جائیں۔ ان کے اعمال، ان کی زبانوں اور ان کی فکروں میں برکت دے۔ پھر اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کے ہر فرد کو خواہ وہ کہیں ہو، اس جلسہ کی برکات میں شریک کرے۔ پھر ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں، دہریوں غرضیکہ سب کے قلوب کو کھول دے تا کہ سب ابن آدم ہو کر بھائیوں کی طرح رہیں۔

پھر میں دوستوں سے خواہش کرتا ہوں کہ جو باتیں انہوں نے جلسہ میں سُنی ہیں ان پر عمل کریں۔ میں ان کے لئے دُعا کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اور میں دوستوں سے بھی امید کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے دُعا کریں گے کہ خدا تعالیٰ مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی کی توفیق دے اور

جو ذمہ داری اس نے مجھ پر رکھی ہے، اس میں مجھے سرخرو کرے۔ یہ بہت بڑا بوجھ ہے اور کوئی انسان بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کے اسے اُٹھا نہیں سکتا۔ اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے اور اس میں خطرات بھی زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے تا کہ جب میں اس کے سامنے حاضر ہوں تو میں نے کیا کہنا ہے وہی خوشخبری دے کہ تو نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

میں پھر دوستوں کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کامل الایمان بنائے اور اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق دے۔ ہم ایسی جماعت بن جائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائے اور ہم اس سے راضی ہوں۔ آمین

۱ التوبۃ:۶ ۲ البقرۃ:۷۶ ۳ البقرۃ:۷۷

۴ الفتح:۱۶ ۵ النساء:۱۶۵ ۶ البقرۃ:۱۰۲

۷ الفاتحۃ:۲

☆۷ استثناء باب ۳۴ آیت ۵ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۸ خروج باب ۳ آیت ۲ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۹ Life of Mahomet by William Muir p.560 published in London 1877.

۱۰ النجم:۴،۵

۱۱ Life of Mahomet by William Muir P.550 published in London 1877.

☆۱۱ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۱ مطبع میمنہ مصر ۱۳۱۳ھ

۱۲ الانعام:۱۲۵،۱۲۶ ۱۳ حٰمٓ السجدۃ:۳۹

۱۴ یونس:۱۷ ۱۵ الاحزاب:۲۲

۱۶ آل عمران:۳۲ ۱۷ الحجر:۷

۱۸ القلم:۲ تا ۷ ۱۹ الانبیاء:۶

۲۰ الانبیاء:۱۱ ۲۱ ص:۵
۲۲ القمر:۳ ۲۳ القمر:۶
۲۴ الفرقان:۹ ۲۵ الفرقان:۲۲تا۲۷
۲۶ الفرقان:۳۱
۲۷ بنی اسرائیل:۴۸ ۲۸ الفرقان:۱۰
۲۹ المائدۃ:۶۸
۳۰ الحاقۃ:۴۳ ۳۱ الطور:۳۰
☆۳۱ ارڑپوپو: نجومی۔احمق۔ضدّی
۳۲ الحاقۃ:۳۹تا۴۸ ۳۳ یٰس:۷۰،۷۱
۳۴ الدخان:۱۴،۱۵
۳۵ النحل:۱۰۳،۱۰۴ ۳۶ الفرقان:۵تا۷
☆۳۶ جبر: حضرموت کے ایک عیسائی خاندان کا غلام۔حضورؐ جبر کے مکان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔اس کے بارے میں کفار نے کہا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھاتا ہے۔بعد میں یہ بھی مشرف بہ اسلام ہوگیا۔
(اسلامی انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۶۵۰ مطبوعہ ۲۰۰۰ء لاہور)
۳۷ روح المعانی جلد ۵ (الجزء الرابع عشر) صفحہ ۲۳۳ مکتبہ امدادیہ ملتان
۳۸ A Comprehensive commentary on the Quran by the Rev.E.M Wherry M.A Vol.III P.47 Published in London 1896.
۳۹ لوقا باب ۱۱ آیت ۱۴ تا ۱۸ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء
۴۰ العلق:۱ تا آخر ☆۴۰ النحل:۱۰۴
☆☆۴۰ سیرت ابن ہشام (عربی) جلد ۱ صفحہ ۳۶۶ تا ۳۷۱ مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۳۶ء

۴۱ الفرقان:۷

۴۲ بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۴۳ الشعراء:۲۱۱ ۴۴ التکویر:۲۶ ۴۵ النجم:۲۰،۲۱

۴۶ الحج:۵۳ ۴۷ النجم:۲۲تا۲۴ ۴۸ الشعراء:۲۱۱،۲۱۲

۴۹ الشعراء:۲۲۲تا۲۲۴ ۵۰ الانعام:۱۲۲

۵۱ النحل:۱۰۰،۱۰۱ ۵۲ النحل:۱۰۲

۵۳ یونس:۳۸،۳۹ ۵۴ النمل:۷۶ ۵۵ الانبیاء:۴۵

۵۶ شرح مواہب اللدنیة جلد ا صفحہ ۲۴۶ مطبوعہ مصر ۱۳۲۵ھ

۵۷ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۵۸ استثناء باب ۱۸ آیت ۲۲ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۵۹ اعمال باب ۳ آیت ۲۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۶۰ یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۲ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

☆۶۰ المائدة:۳

۶۱ یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۶۲ آل عمران:۹۸

۶۳ یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲، ۱۳ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور ۱۹۲۲ء

۶۴ الکهف:۵۵ ۶۵ النجم:۴،۵

۶۶ استثناء باب ۱۹ آیت ۲۱ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۶۷ متی باب ۵ آیت ۳۸تا۴۰ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۶۸ الشوریٰ:۴۱ ۶۹ الرحمٰن:۴۷ ۷۰ حٰم السجدة:۳۱

☆۷۰ الاعراف:۱۵۹

۷۱ متی باب ۱۵ آیت ۲۴ پاکستان بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۷۲ متی باب ۱۵ آیت ۲۶ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۷۳ فاطر:۲۵
۷۴ هود:۲۱تا۲۳
۷۵ الضحیٰ:۸
۷۶ النجم:۲،۳
۷۷ الضحیٰ:۵
۷۸ ابراهیم:۲۵
۷۹ النجم:۴تا۶
۸۰ بنی اسرائیل:۷۴
۸۱ بنی اسرائیل:۷۵
۸۲ الضحیٰ:۲تا۴
۸۳ الضحیٰ:۶
۸۴ الکهف:۷
۸۵ الضحیٰ:۷
۸۶ یوسف:۹۶
۸۷ الضحیٰ:۹
۸۸ الضحیٰ:۱۰،۱۱
۸۹ المائدة:۱۰۹
۹۰ الانعام:۱۲۵
۹۱ النساء:۱۰۶،۱۰۷
۹۲ المومن:۵۲
۹۳ المومن:۵۶
۹۴ محمد:۲۰
۹۵ النصر:۴
۹۶ الفتح:۲،۳
۹۷ الانشراح:۲
۹۸ الاحزاب:۲۲
۹۹ البقرة:۱۵۲
۱۰۰ الواقعة:۷۸تا۸۰
۱۰۱ عبس:۱۶،۱۷

فضائل القرآن

نمبر......۵

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانیؓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

فضائل القرآن

(نمبر......۵)

قرآن کریم کی کُتب سابقہ پر فضیلت کی نویں دلیل

انبیاءِ سابقین کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق پیشگوئیاں

اور

قرآن کریم کی آٹھ اصولی اصلاحات

(فرمودہ ۲۸ ردسمبر ۱۹۳۲ء، برموقع جلسہ سالانہ قادیان)

تشہد وتعوذ کے بعد حضور نے سورہ اعراف کی مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کی:۔

قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهٖ مَنۡ أَشَآءُ ۚ وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ ۚ فَسَأَكۡتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤۡتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمۡ بِاٰيٰتِنَا يُؤۡمِنُونَ۔ اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الۡأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهٗ

مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ (اعراف آیت ۱۵۸،۱۵۹)

اس کے بعد فرمایا:-

کل کی تقریروں کے بعد میرا گلا شام تک تو اچھا تھا لیکن رات کو ملاقاتوں کے بعد گلا بیٹھ گیا۔ ۱۲ بجے کے قریب سردی لگنے کی وجہ سے بات کرنے میں تکلیف شروع ہوئی اور ایک بجے رات جب ملاقاتیں ختم ہوئیں تو گلا بہت کچھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے گو میں اس وقت اونچی آواز سے نہیں بول سکتا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ تھوڑی دیر میں ہی حلق گرم ہونے کے بعد آواز بلند ہوجائے گی۔ شروع میں ممکن ہے کہ تقریر کے بعض حصے احباب تک نہ پہنچ سکیں لیکن احباب کو صبر سے کام لینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید رکھنی چاہئے کہ جبکہ وہ دُور دور سے کلماتِ حق سُننے کے لئے یہاں آئے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس سے امید رکھتے ہوئے مَیں حق کہنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں تو ہم دونوں پر وہ فضل فرمائے گا اور مجھے کہنے اور آپ لوگوں کو سُننے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

دینی مجالس کی اہمیت

مجھے افسوس ہے کہ بعض دوست گو وہ نہایت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ باوجود سمجھانے کے پھر بھی مجلس سے اُٹھ کر چلے جاتے اور باہر پھرتے رہتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر جماعت میں کچھ نمائشی ممبر بھی ہوتے ہیں اور مجلس میں اپنی نمائش کرنے کے بعد جگہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں بھی آتا ہے کہ ایسے نمائشی لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی تھے۔ جب مجلس منعقد ہوتی تو وہ بھی آجاتے۔ گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہر ایک پر نظر پڑتی ہے۔ صحابہؓ اُن کو دیکھتے لیکن جب کام شروع ہو جاتا تو آنکھ بچا کر کھسکنے لگتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتا ہے۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا[2] وہ لوگ جو تم میں سے نظر بچا کر مجلس سے بھاگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو خوب جانتا ہے۔ ایسے نمائشی ممبر یہاں بھی ہوتے ہونگے مگر کئی لوگ ایسے ہیں جو اِس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور وہ جانتے نہیں کہ ان کا یہ فعل کیسا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ تقریر کر رہے تھے کہ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے کہ اس مجلس میں ایک شخص آیا۔ اُس نے دیکھا کہ مجلس بھری ہوئی ہے۔ اُس تک آواز مشکل سے پہنچتی تھی مگر اُس نے یہ خیال کر کے کہ ذکر الٰہی ہو رہا ہے یہاں سے جانا نہیں چاہئے۔ شرم کر کے بیٹھ گیا۔ خدا تعالیٰ نے کہا میں بھی اس کے گناہوں کے متعلق شرم کروں گا اور اُن کے بارے میں گرفت نہیں کرونگا پھر ایک اور شخص آیا۔ اُس نے بھی دیکھا کہ مجلس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں مگر وہ اِدھر اُدھر تلاش کر کے ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے آواز سُن سکے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ جس طرح یہ شخص کوشش کر کے آگے بڑھا میں بھی اِسے اپنے قرب میں جگہ دونگا۔ پھر ایک تیسرے شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔ وہ آیا مگر یہ دیکھ کر آواز نہیں پہنچتی واپس چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح یہ شخص ذکر الٰہی کی مجلس سے واپس چلا گیا اِسی طرح مَیں بھی اسے مُنہ پھیر لونگا اور رحمت کے دروازے اس کے لئے نہیں کھولونگا[3]

غرض ذکر الٰہی کی مجلس کے آداب ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے دل میں مرض تھا اُن کا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی علاج نہ کر سکے۔ یہی فرمایا کہ ایسا شخص آیا اور چلا گیا۔ جب ایسا بیمار دل رکھنے والے کا علاج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ہو سکا تو ہم سے کس طرح ہو سکتا ہے مگر کئی لوگ بے خبری کی حالت میں مارے جاتے ہیں۔ انہیں اِس بات کا علم نہیں ہوتا کہ جو کام وہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ کیسا نکلے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب ذکر الٰہی کی مجلس منعقد ہوتی ہے تو اُس کے خاتمہ تک فرشتے نازل ہوتے اور خدا تعالیٰ کی رحمت لاتے رہتے ہیں۔ ذکر الٰہی کی مجلس ایسی مجلس ہوتی ہے جیسا کہ بادشاہ کا دربار ہو اگر بادشاہ کے دربار سے اُٹھ کر

جانے والا مجرم ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کے دربار سے اُٹھ کر چلا جانے والا کیوں مجرم نہیں ہوگا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجلس میں سب لوگ بیٹھے رہیں اگر کسی ضرورت کی وجہ سے اُٹھنا پڑے تو اجازت لیکر جائیں ۔ اس مجلس میں جو ۱۵-۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ہے لوگوں کا اجازت لینا تو مشکل ہے مگر مَیں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جو لوگ ضرورتاً باہر جائیں وہ ضرورت پوری کر کے جلد واپس آجائیں اور وہ سمجھیں کہ اُن کا اِس مجلس میں بیٹھنا فضول نہیں۔ اوّل تو جو بات بھی کان میں پڑے گی اگر مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑ لیا جائے گا تو وہ نجات کا ذریعہ بن جائے گی لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو بھی اس مجلس میں بیٹھنا نیکی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر احمدی قرآن کریم کا ترجمہ جانتا ہو مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے لیکن جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو انہیں ثواب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس مجلس میں خواہ کسی کو آواز نہ آئے اور تقریر کا مطلب نہ سمجھ سکے تب بھی بیٹھنے پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرا آج کا مضمون اُس گذشتہ مضمون کی ایک کڑی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے مَیں چار سال سے متواتر بیان کرتا آرہا ہوں یعنی آج کا مضمون فضائل القرآن کی پانچویں قسط ہے۔ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو ہستی باری تعالیٰ کے مضمون کی طرح اتنی وسعت حاصل ہوتی ہے کہ اُن کو خواہ کتنی بار بیان کیا جائے اُن میں تکرار پیدا نہیں ہوسکتا۔ فضائل القرآن کے مضمون میں بھی تکرار نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اتنے معارف ہیں کہ چاہے ساری دنیا مل کر قیامت تک انہیں بیان کرتی رہے وہ کبھی ختم نہ ہونگے۔

اِس موضوع پر گذشتہ سالوں میں جو لیکچر دیئے گئے ہیں۔ وہ شائع نہیں ہو سکے اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا منشاء ہے کہ مکمل ایک جلد کی شکل دے کر اِن کو شائع کیا جائے تا کہ قرآن کریم اور دوسرے مذاہب کی الہامی کُتب کا مقابلہ کرتے وقت جماعت کے لوگوں کے لئے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے اور براہین احمدیہ کو مکمل کرنے کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو منشاء تھا اس کے پورا کرنے میں ہم بھی حصہ لے سکیں۔

علمی تقاریر کا فائدہ

بعض دوستوں نے کہا ہے کہ آپ کا سالانہ جلسہ کا علمی لیکچر ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ بہت سے لوگ صرف برکت حاصل کرنے کے لئے لیکچر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اِس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اگر وہ لوگ برکت حاصل کرنے کے لئے بیٹھے رہتے ہیں اور خدا تعالیٰ انہیں برکت دے دیتا ہے تو اِس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ یہی غرض تو یہاں آنے کی ہوتی ہے۔ جب وہ مِل گئی چاہے لیکچر سمجھ کر اور چاہے نہ سمجھتے ہوئے مقصد تو حاصل ہو گیا۔ پس اِس پر کسی کو گلہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ دیکھو اگر خدا تعالیٰ کسی گناہگار کو باز پُرس کئے بغیر جنّت میں داخل کر دے تو کیا وہ جنّت میں داخل ہونے سے انکار کر دیگا۔ وہ تو فوراً آگے بڑھ کر جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ اِسی طرح جسے لیکچر میں بیٹھے رہنے سے برکت حاصل ہو جائے اسے اس بات کا کیا شکوہ ہو سکتا ہے کہ لیکچر میں جو کچھ بتایا گیا ہے اُسے وہ سمجھ نہیں سکا مگر مَیں سمجھتا ہوں یہ بات ہے بھی غلط۔ اس لئے کہ ہماری جماعت کے دوستوں کے دماغ خدا تعالیٰ نے ایسے اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیئے ہیں کہ اپنے ایک دوست کی طرف سے یہ بات سُن کر کہ بعض لوگ لیکچر کو سمجھ نہیں سکتے مجھے بہت تعجب ہوا۔ پچھلے دنوں مرکزی خلافت کمیٹی کے آرگن روزانہ اخبار ''خلافت'' نے ایک کانگرسی ہندو لیڈر کے یہ کہنے پر کہ ''مسلمان جاہل پسماندہ اور ناکافی تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو کنٹرول کرنا آسان نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور ناخواندہ فرقہ کے ہاتھ میں دی جانے لگی ہے۔'' لکھا تھا کہ ''اگر **قادیان جیسے قصبہ کا ٹانگہ والا خالصہ اور دیانند کالج کے گریجوئیٹوں کے منہ بند نہ کر دے تو ہمارا ذمہ۔ پھر مسلمان کبھی صوبہ کی آزادی طلب نہیں کریں گے۔**'' اگر مخالفین کے نزدیک قادیان کے ٹانگہ چلانے والے کو اتنی قابلیت حاصل ہے تو پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اپنوں میں سے کوئی یہ کہے کہ احمدی میرے لیکچر کو سمجھ نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ تو لیکچر کو بخوبی سمجھتے ہیں مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بعض احمدی لیکچر کو نہیں سمجھ سکتے وہ اپنے بھائیوں کو نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اپنے متعلق تو حسن ظنّی سے کام لیا کہ وہ خود لیکچر کو سمجھ سکتے ہیں لیکن دوسروں کے متعلق حسن ظنی اختیار نہ کی اور کہہ دیا کہ وہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ انبیاء پر ایمان لانے والے خواہ مروّجہ علوم سے

ناواقف ہوں دین کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں آسمانی علوم مِلا کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ مَیں اسلام کے تازہ معجزات لایا ہوں اور اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں مگر دوسرے لوگ قصّے کہانیاں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی جماعت کو رُوحانی علوم کے متعلق مشاہدہ حاصل ہے اور آپ پر ایمان لانے کے دن ہی ہر احمدی کو نیا علم حاصل ہو جاتا ہے اور احمدیوں کو خدا تعالیٰ ہر قسم کے اعتراضات کے جواب آپ سمجھا دیتا ہے اگر کوئی تمسخر کرتا ہے تو اُسے بھی جواب مِل جاتا ہے۔ مولوی غلام رسول صاحب راجیکی نے سُنایا کہ وہ ایک جگہ مباحثہ کے لئے گئے مباحثہ کے متعلق مخالف مولوی سے گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک احمدی کو رقعہ دیکر اُن مولوی صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ مولوی صاحب نے انہیں بے علم سمجھ کر چاہا کہ اُسے قابو میں لے آئیں۔ اِس خیال سے اس احمدی کو کہا دیکھو قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق رَافِعُكَ إِلَيَّ لکھا ہے یعنی اُوپر اُٹھانا اِس لئے وہ فوت ہو ہی نہیں سکتے۔ اس احمدی نے کہا افعك کی ف کے نیچے کیا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا زیر۔ احمدی نے کہا افعك اوپر تو لے جاتا ہے مگر یہ زیر اُوپر نہیں جانے دیتی۔ اِس پر مولوی صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ غرض جس رنگ میں دشمن چلتا ہے اُسی رنگ میں ناکام کرنے کے لئے خدا تعالیٰ احمدیوں کو سمجھ عطا کر دیتا ہے۔ ظاہری علوم سے بالکل ناواقف احمدی ایسے ایسے لطیف جواب دیتے ہیں کہ مخالف کے لئے خاموش ہوئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں آپ کا ایک خادم پیراں دِتا ہوا کرتا تھا۔ بہت معمولی سمجھ کا انسان تھا مگر باوجود اس کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس رہنے کا اُس پر ایسا اثر تھا کہ ایک دفعہ بٹالہ تار لے کر گیا۔ اُس زمانہ میں مولوی محمد حسین بٹالوی لوگوں کو قادیان آنے سے روکا کرتے تھے۔ پیراں دِتا کو جو انہوں نے دیکھا تو اُسے پکڑ لیا اور کہنے لگے۔ تُو کہاں چلا گیا۔ وہاں کیا رکھا ہے۔ تمہیں وہاں نہیں رہنا چاہئے۔ اِس رنگ میں بہت کچھ کہا اُس نے کہا مَیں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں اور نہیں جانتا کہ کیا بات ہے لیکن اِتنا ضرور جانتا ہوں کہ مرزا صاحب اپنے گھر بیٹھے رہتے ہیں مگر دُور دُور سے لوگ آتے اور یکّوں کے دھکّے کھا کھا کر اُن کے پاس پہنچتے ہیں اور تم یہاں دوڑے پھرتے ہو مگر کوئی تمہیں پوچھتا تک نہیں۔ یہ ایک علمی دلیل ہے ایک مامور من اللہ کی صداقت کی جو ایک جاہل نے پیش کی۔ ایسے جاہل نے جس کی یہ حالت تھی کہ چند آنے لے کر مٹی کا

تیل دال میں ڈال کر کھا جاتا تھا۔ اُسے علمی الفاظ نہ آتے تھے لیکن جو کچھ اُس نے کہا وہ علمی دلیل تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کی نصرت حضرت مرزا صاحب کے ساتھ ہے اور اُس کی لعنت تم پر پڑ رہی ہے۔

غرض جب کوئی انسان خدا تعالیٰ کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے تو اُس کی عقل تیز ہو جاتی ہے اور وہ روحانیت کے باریک سے باریک معارف بآسانی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ قومیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہم فلاں قسم کی باتیں نہیں سمجھ سکتیں اُن کی عقلی طاقتیں گر جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ وہ موٹی باتیں سمجھنے سے بھی عاری ہو جاتی ہیں لیکن جن لوگوں کو روحانی اور علمی باتیں سنائی جاتی ہیں اور وہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں سے نہ سمجھنے والوں میں بھی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں احمدیہ زمینداروں کے سامنے بھی علمی تقریر کرتا ہوا یہ خیال نہیں کرتا کہ اُن کی سمجھ میں نہ آئے گی لیکن کالجوں کے غیر احمدی طالب علموں کے سامنے بھی علمی تقریر کرتے ہوئے مجھے یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ شائد وہ میری باتیں نہ سمجھ سکیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ احمدی علمی اور روحانی تقریریں سُننے کے عادی ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگ عادی نہیں ہوتے۔ دین کی باتیں سننے کا عادی بنانے کے لئے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ بچّہ کے پیدا ہوتے ہی اُس کے کان میں اذان دی جائے[۵] اگر اِس طرح دین کی باتیں سمجھنے کی بچہ میں قابلیت پیدا ہو سکتی ہے تو احمدیوں کے سامنے علمی باتیں بیان کرنے سے وہ کیوں نہیں سمجھ سکتے۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے خود علوم کو مشکل بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے علوم بنائے ہیں اور ہر طبقہ کے لوگوں میں علوم کو سمجھنے کی قابلیت رکھی ہے خواہ وہ زمیندار ہوں خواہ علمی کام کرنے والے اگر لوگ علوم کو خود مشکل نہ بنا دیتے تو کسی انسان کے لئے اُن کا سمجھنا مشکل نہ ہوتا۔ اب ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ دلیل استقراء سے یہ بات ثابت ہے تو بہت لوگ کہہ دیتے ہیں ہمیں کیا معلوم دلیل استقراء کیا ہوتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تمہارے باپ دادا مرتے چلے آئے ہیں یا نہیں تو ہر شخص اس بات کو سمجھ لے گا۔

غرض خدا تعالیٰ نے کسی علم کو مشکل نہیں بنایا۔ علم کو لوگ الفاظ کے ذریعہ مشکل بنا دیتے ہیں اگر لوگ میری تقریر کو بھی نہ سمجھیں گے تو اس میں میری غلطی ہوگی کہ مَیں نے ایسے الفاظ استعمال نہ کئے

جو اُن کی سمجھ میں آسکتے ورنہ قرآن کا کوئی مضمون ایسا نہیں جسے کوئی انسان سمجھ نہ سکے ہاں مَیں اپنی طرف سے کوشش کرتا ہوں کہ آسان الفاظ میں تقریر کروں۔ باقی روانی میں بعض اوقات مشکل الفاظ بھی نکل جاتے ہیں مگر اس سے مضمون خراب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی فضیلت پر نویں دلیل

مَیں اِس وقت تک قرآن کریم کے افضل ہونے کی آٹھ دلیلیں بیان کر چکا ہوں۔آج نویں دلیل پیش کرتا ہوں۔

نویں دلیل قرآن کریم کی دوسری الہامی کُتب سے یا دوسرے فلسفوں سے افضل ہونے کی یہ ہے کہ وہ تمام گذشتہ مذاہب کی الہامی کتب میں یا مذہبی فلسفوں میں جو غلطیاں ہیں اُن کو واضح کرتا ہے اور نہ صرف اُن کی غلطیاں واضح کرتا ہے بلکہ اُن کی اصلاح بھی کرتا ہے اور یہ سیدھی بات ہے کہ جو غلطی نکالتا ہے وہ اس سے افضل ہوتا ہے جس کی غلطی نکالی جاتی ہے اور غلطی نکالنے والا اُستاد اور ماہرِ فن ہوتا ہے۔ اِس دلیل کے مطابق قرآن کریم کی جو افضلیت ثابت ہوگی وہ موجودہ الہامی کتب اور موجودہ مذاہب پر ثابت ہوگی کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کریم جو غلطی نکالے وہ اصل کتاب میں نہ ہو بلکہ بعد میں داخل ہوگئی ہو۔ یا اس مذہب میں وہ بات نہ ہو اور بعد میں لوگوں نے اس کی طرف منسوب کر دی ہو کیونکہ تمام مذاہب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ان میں کوئی جھوٹی اور غلط بات خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ پس قرآن کریم جہاں کسی سابقہ کتاب کو نامکمل بتائے گا وہاں یہ معنے ہونگے کہ پہلی کتب میں وہ بات نہ تھی اور جہاں یہ ظاہر کرے گا کہ فلاں بات غلط ہے وہاں یہ معنے ہونگے کہ وہ بات خدا نے نہیں بتائی۔ پھر جہاں قرآن فلسفہ کی غلطیاں بتائے گا وہاں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ لوگوں نے اپنی عقل سے وہ باتیں بنالیں جو غلط ہیں۔

مَیں نے کہا ہے کہ پہلی کتابوں میں اصل میں وہ غلطیاں نہ تھیں جو قرآن بتاتا ہے۔ اِس لحاظ سے بھی قرآن کریم اُن سے افضل ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ کتابیں اب محرّف و مبدّل ہیں اور چونکہ دنیا کے سامنے وہ موجود شکل میں آتی ہیں اور قومیں اُن پر عمل کرتی ہیں وہ اُن سے نقصان اُٹھاتی ہیں۔ اِس لئے قرآن کی افضلیت بہر حال ثابت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو سابقہ کتب کی

غلطیاں معلوم ہوتی ہیں اور یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اِس وقت سوائے قرآن کریم کے کوئی قابلِ عمل کتاب نہیں ہے۔قرآن کریم اِس دعویٰ کو خود پیش کرتا ہے۔فرماتا ہے:-

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ـ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(النحل آیت ۶۴-۶۵)

قرآن کریم کے چھ دعوے

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھ دعوے پیش کئے گئے ہیں۔ **پہلا** یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی رسول آتے رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ ـ مجھے اپنی ذات ہی کی قسم کہ پہلی اُمتوں میں بھی رسول بھیجے جاتے رہے ہیں۔ **دوسرا دعویٰ** یہ فرمایا کہ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ اس کے بعد وہ قومیں بگڑ گئیں۔ اُن کو جو تعلیمیں دی گئی تھیں اُن میں انہوں نے نقص پیدا کر دیا اور لوگوں نے اپنے نفسانی خیالات کو خوبصورت سمجھنا شروع کر دیا۔

انسان کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ پہلے وہ بدی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اُس کی تائید میں دلائل لاتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔ایک چور سے مَیں نے پوچھا کہ کبھی تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔اس کے جواب میں اُس نے کہا اصل میں حلال کی کمائی تو ہماری ہی ہوتی ہے۔ ہم خطرات میں پڑ کر مال حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ اِس طرح ہمیں بہت محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔اس لئے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ہمارے لئے حلال ہوتا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ چور بھی اپنی چوری کو جائز قرار دینے کے لئے دلیل پیش کرتے ہیں۔

غرض پہلے انسان بدی کرتا ہے اور پھر اُس کے جواز کی دلیلیں بناتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت میں نیکی رکھی ہے جو بُرے فعل پر اس کو ملامت کرتی ہے۔چونکہ انسان

ہر وقت کی ملامت برداشت نہیں کر سکتا اس لئے اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل پیدا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ اُن کو اُن کے اعمال خوبصورت دکھانے لگتا ہے اور جب لوگ کسی بُرے فعل کے عادی ہو جاتے ہیں تو اُسے اچھا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

تیسرا دعویٰ یہ کیا کہ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ ساری کی ساری قومیں آج بھی ایسی حالت میں ہیں۔ اب تک اس شیطانی عمل کا اثر اور اس کی لعنت اُن پر باقی ہے کیونکہ جو بگاڑ ایک دفعہ پیدا ہوا اُسے خدا ہی دُور کر سکتا ہے کوئی انسان دُور نہیں کر سکتا۔

چوتھی بات یہ بیان کی کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وہ اس نقص کی وجہ سے جہنم میں گرنے کے خطرہ میں ہیں۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن کی مدد کرنا چاہتی ہے۔

پانچویں بات یہ بیان کی کہ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ رحمت کا دروازہ کھولتا۔ جب اُس کے بندے گمراہ ہو گئے۔ پہلی کتابیں خراب ہو گئیں تو خدا تعالیٰ نے رحمت کا دروازہ کھولا۔ پس اے رسولؐ! اُس نے تجھ پر یہ کتاب اُتاری ہے تا کہ تُو انہیں وہ اصل تعلیم بتائے جس سے اختلاف کر کے وہ اِدھر اُدھر چلے گئے تا کہ بگاڑ دُور ہو۔

چھٹی بات یہ بیان کی کہ پھر اسی پر بس نہیں کیا کہ بگاڑ دُور کر دے بلکہ اِس کتاب میں زائد باتیں بھی بیان کی ہیں۔ نہ صرف پہلی کتابوں اور پہلے فلسفوں کی غلطیاں بتائیں بلکہ ایسی باتیں بھی بتائی ہیں جو اس سے پہلے فلسفیوں کے ذہن میں بھی نہیں آئیں اور وہ دو قسم کی ہیں۔ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ایک هُدًى اور دوسری رحمت۔ ہدایتؔ کے معنے ہیں ذہنی اور عقلی ترقی کے سامان اور رحمتؔ کے معنے ہیں عملی ترقی اور آرام و آسائش کے سامان۔ گویا قرآن میں صرف ذہن کی ترقی کے سامان ہی نہیں بلکہ عملی ترقی کے سامان بھی ہیں اور یہی دو چیزیں ہوتی ہیں جن کے حاصل کرنے کے لئے تمام مذاہب اور تمام فلسفے کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں موجود ہیں۔ اِس میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔

الفرُقان قرآن کریم ہی ہے

دوسری آیت جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہے، وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا [7] فرمایا بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اُتارا تا کہ یہ سب زمانوں کے لئے نذیر ہو۔

فرقان کے عربی میں کئی معنے ہیں۔ اُن میں سے دو جو یہاں چسپاں ہوسکتے ہیں اُن کو مَیں لیتا ہوں۔ اوّل یہ کہ كُلُّ مَا فُرِّقَ بِهٖ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ [8] یعنی ہر وہ چیز جس کے ساتھ حق و باطل میں فرق کیا جائے۔ وہ فرقان ہے۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ الصبح والسحر [9] یعنی پَو پھٹنے کو بھی فرقان کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس کتاب کے ذریعہ ایک تو حق و باطل میں تمیز ہوسکتی ہے۔ دوسرے ہم نے اِسے پَو پھٹنے کی طرح بنایا ہے۔ جب پَو پھٹتی ہے تو ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ اِس نے بھی حقیقت ظاہر کردی ہے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ (۱) بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر وہ کلام اُتارا ہے جو حق و باطل میں فرق کر کے دکھاتا ہے۔ (۲) بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر وہ کلام اُتارا ہے کہ جس کی روشنی میں تمام مذاہب کے فلسفے اپنے نقائص آپ دیکھ کر ان کی اصلاح شروع کردیں گے۔ جس طرح پَو پھٹنے پر ہر گھر کا ہر نقص نظر آجاتا ہے۔ اِسی طرح قرآن کی روشنی میں سب مذاہب والوں کو اپنے اپنے ہاں کے نقائص نظر آنے لگ جائیں گے اور وہ اُن کی اصلاح کی کوشش شروع کردیں گے۔

غرض قرآن میں حق و باطل میں فرق کرنے والے دلائل بھی دیئے گئے ہیں اور تعلیماتِ صحیحہ کو ایسے رنگ میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ خود بخود لوگوں پر اُن کے دین کی کمزوریاں ظاہر ہونے لگ گئی ہیں اور انہوں نے اپنے عیوب چھپانے شروع کردیئے ہیں۔

اقوامِ عالم کی شرک سے بیزاری

اب دیکھو یہ دونوں باتیں کس طرح پوری ہوئیں؟ اِن میں سے ایک کو تو مَیں آگے چل کر تفصیل

سے بیان کروں گا مگر یہ جو کہا کہ پوچھنے پر لوگ آپ ہی آپ اپنے نقائص دُور کرنے شروع کر دیتے ہیں اِس کی صداقت اِس طرح واضح ہوتی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ساری قومیں شرک میں مبتلا تھیں۔ یہودیوں نے باوجود اس کے کہ اُن کے ہاں ایک خدا کو ماننے کی تعلیم تھی۔ عزیر کو ابن اللہ قرار دے لیا تھا۔ اِسی طرح زرتشتی مذہب کی بنیاد بھی توحید پر تھی مگر اُس کے ماننے والوں نے بھی خرابی پیدا کر لی تھی اور دو خدا بنا لئے تھے۔ ہندوؤں نے ۳۳ کروڑ معبود بنا رکھے تھے۔ چین میں بدھ مذہب تھا۔ اُس نے ہر چیز کا الگ خدا بنا رکھا تھا۔ مثلاً لکڑی کا خدا الگ تھا اور جب اُس لکڑی کی میز بن جائے تو اس کا الگ۔ ایسے وقت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آئے اور آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ خدا ایک ہے۔ اُس وقت لوگ توحید سے اتنے دُور ہو چکے تھے کہ یہ بات سُن کر انہوں نے قہقہے لگائے۔ آپؐ کے ملک والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۔۱؎ اِس نے تو بہت سے خداؤں کو کوٹ کاٹ کر ایک بنا دیا ہے۔ چونکہ اُن کے واہمہ میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ خدا ایک ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خیال کرتے کہ آپؐ نے سب خداؤں کو کوٹ کر ایک بنا دیا ہے۔ گویا وہ ایک خدا کا عقیدہ پیش کرنا حماقت کی بات قرار دیتے تھے۔ اِسی طرح عیسائیوں کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ تین خدا مانتے ہیں۔ غرض سب کی سب قومیں شرک میں مبتلا تھیں لیکن جب قرآن کا نُور پھیلا تو اب یہ حالت ہے کہ آج ایک عیسائی کھڑا ہو کر بغیر یہ محسوس کئے کہ وہ کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے کہتا ہے کہ توحید خالص سوائے انجیل کے اَور کوئی کتاب پیش ہی نہیں کرتی۔ گویا پہلے تو لوگ توحید کا عقیدہ پیش کرنے کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ہنستے تھے لیکن اب جبکہ سورج نکل آیا تو انہیں اپنے مُنہ کی سیاہی نظر آ گئی اور وہ مُنہ دھونے لگ گئے۔ ہندو ۳۳ کروڑ دیوتا مانتے تھے اور محمود غزنوی سے اِس لئے ناراض تھے کہ اُس نے اُن کے بُت توڑ دیئے لیکن اب ہندو خود بُت توڑتے پھرتے ہیں کیونکہ قرآن کا سورج نکل آیا اور انہیں پتہ لگ گیا کہ بُت پرستی بہت بُری بات ہے۔ غرض جس قوم کو دیکھو مشرکانہ خیالات کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ کتنا بڑا قرآن کے فرقان ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کے ثبوت میں بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر چونکہ یہ ایک ضمنی بات ہے اس لئے مَیں اِسے لمبا نہیں کرتا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مجوس اور ہنود وغیرہ مذاہب میں سے ایک مذہب بھی

ایسا نہ تھا جو پہلے شرک میں مبتلا نہ تھا اور نزولِ قرآن کریم کے بعد اُس نے اپنے پہلو کو نہیں بدلا۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ عقلمند کے لئے صرف یہی افضلیت کا ثبوت کافی ہے۔

غرض اِس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ ہر مذہب وملت اور ہر فلسفہ اور خیال کی غلطیاں نکالی گئی ہیں اور اس کے مقابل پر جو سچی تعلیم تھی وہ بتائی گئی ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایسا ہونا ضروری تھا۔ یہ خیال درست نہیں کہ دوسروں کی غلطیاں نکالنے کی کیا ضرورت تھی اپنی تعلیم پیش کر دینا کافی تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس کی ضرورت تھی کیونکہ لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ہم نے قرآن ساری دنیا کے لئے بھیجا ہے۔ نہ صرف یہود کے لئے نہ صرف نصاریٰ کے لئے۔ نہ صرف ہندوؤں کے لئے۔ پھر نہ صرف اہلِ مذاہب کے لئے بلکہ فلسفہ والوں کے لئے بھی اور جب تک حجت تمام نہ ہو نذیر نہیں ہوسکتا۔ پس ضروری تھا کہ تمام ادیانِ باطلہ اور فلسفۂ باطل اور اوہامِ باطلہ اور وساوس کا اِس میں ازالہ کیا جاتا۔ ورنہ سب دنیا کی طرف اس کا بھیجا جانا جائز نہ تھا۔

اب دیکھو یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے جو قرآن نے کیا۔ اس کے مقابلہ میں اَور کوئی کتاب ایسا دعویٰ پیش نہیں کرسکتی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی اَور ایسا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا جب تک یہ چھ خوبیاں اُس میں نہ ہوں۔ اوّل جب تک سب کُتب کا اُسے علم نہ ہو۔ جب وید اور ژندواَوِستا وغیرہ کا کسی کو پتہ ہی نہ ہو اُس وقت تک کوئی اُن کی غلطیاں کیونکر نکالے گا۔ اِسی طرح اگر فلسفیوں کے خیالات معلوم نہ ہوں تو اُن کا ردّ کس طرح کرے گا۔ یہ دعویٰ وہی کرسکتا ہے جس کے پاس ساری دنیا کے مذاہب اور سارے فلسفیوں کی کُتب کی لائبریری ہو ایسی لائبریری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو نہ تھی بلکہ بیسیوں مذاہب کا آپ کو علم بھی نہ تھا۔ دوسری خوبی اس میں یہ ہونی چاہئے کہ اُس کی نظر ایسی ہو کہ اُسے غلطیاں نظر بھی آجائیں اور ایسی واقفیت ہو جو ساری کتابوں کے مضامین پر حاوی ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ نہ کرسکتے تھے کیونکہ آپ کے پاس مذاہب عالم کی کتابیں ہی موجود نہ تھیں اُن کے پڑھنے پڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسری خوبی یہ ہونی چاہئے کہ سب فلسفوں کا اُسے علم ہو۔ چوتھی یہ کہ سب قسم کے اوہام اور وساوس کا بھی علم ہو کیونکہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم وسوسوں کو بھی دُور کرتا ہے اور یہ کسی انسان کی طاقت میں نہیں ہے کہ انسانوں کے وساوس کا پتہ لگا سکے۔ یہ دعویٰ کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا کہ مَیں انسانوں کے وساوس دُور کرسکتا

ہوں۔ جب تک اُسے سب کے افکار کا پتہ نہ ہو اور یہ پتہ لگانا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ پانچویں اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی کو سب قسم کے اوہام اور وساوس وغیرہ کا علم ہو گیا۔ تب بھی وہ اُس وقت تک اُن کا ردّ نہیں کر سکتا جب تک اُس میں جواب دینے کی طاقت نہ ہو۔ اس لئے پانچویں بات اُس میں یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر قسم کے اعتراض کو ردّ کر سکے۔

چھٹی خوبی یہ ہو کہ اس قدر چھوٹی سی کتاب میں جیسی کہ قرآن شریف ہے ساری کتابوں کی غلط باتوں کا ردّ بھی کر دے اور ساری عمدہ باتیں بیان بھی کر دے۔ عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن بائبل سے چھوٹا ہے۔ حالانکہ بائبل میں صرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خدا محبت ہے۔ یہ چھ باتیں سوائے خدا تعالیٰ کے اَور کسی میں نہیں پائی جا سکتیں۔ خدا تعالیٰ کو ہی پتہ ہے کہ دنیا میں کتنے مذاہب ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کتنے فلسفے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہی کی نظر باریک در باریک باتوں تک پہنچ سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کی نظر انسانوں کے اوہام اور وساوس کو دیکھ سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کی قدرت میں یہ بات ہے کہ سب غلط باتوں کا ردّ کرے اور خدا تعالیٰ ہی چھوٹی سی کتاب میں سب کچھ بیان کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پس یہ دعویٰ سوائے الٰہی کتاب کے اَور کوئی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔[11] پہلی آیت میں تو صرف مذہبی کتب کے ماننے والوں کی غلطیاں نکالنے کا دعویٰ تھا لیکن اس آیت میں سب انسانوں کی خواہ اُن کا مذہبی کتب سے تعلق ہو یا محض عقلی دلائل پر اُن کے خیالات کی بنیاد ہو غلطیاں بیان کرنے کا ذکر ہے۔ دوسری کُتب تو ان اعتراضات تک کو بیان بھی نہیں کرتیں جو مذہب کے خلاف عائد ہوتے ہیں کُجا یہ کہ اُن کے جواب دینے کا دعویٰ کریں۔

دنیا کو چیلنج

یہ اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی دعویٰ قرآن کریم کی افضلیت .3 ثابت کر سکتا ہے اور اس دعویٰ کا پرکھنا بالکل آسان کام ہے۔ لوگ چند عجیب در عجیب اعتراضات مذہب کے بارہ میں پیش کر دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کریم میں اُن کا جواب موجود ہے یا نہیں۔ خود مَیں

نے ساری دنیا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ وہ مذہب پر کوئی اعتراض کریں۔ مَیں اُن کے تمام اعتراضات کا قرآن کریم سے ہی جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔ وہ کتاب کی شکل میں اپنے اعتراضات شائع کردیں۔ پھر میرا فرض ہوگا کہ اُن کا جواب میں قرآن سے ہی دوں اگر مَیں ایسا نہ کرسکوں تو بے شک لوگ مجھے کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے کہ قرآن نے ہر ایک اعتراض کا جواب دے دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی اس آزمائش کے لئے تیار ہو تو خدا تعالیٰ مجھے کامیاب کرے گا۔ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ سورہ فاتحہ جو قرآن کی جڑ ہے مجھے سکھائی ہے۔ اِس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ جب قرآن کریم نازل کرنے والے خدا کے فرشتوں نے مجھے سورۃ فاتحہ سکھائی اور اس کے معارف بتائے اور فرشتہ نے مجھے یہ بھی کہا کہ مَیں تجھے وہ باتیں سکھاتا ہوں جو کسی کو معلوم نہیں تو کسی مخالف کا کوئی ایسا اعتراض نہیں ہوسکتا جس کا مَیں قرآن کریم سے ہی جواب نہ دے سکوں۔ اس لئے مَیں سب مخالفینِ اسلام کو پھر چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کوئی مخالفانہ بات پیش کریں۔ اصولی طور پر اس کا رڈ مَیں قرآن کریم سے ہی دکھادوں گا۔ میرے پاس پچھلے دنوں ایک صاحب آئے اور آکر کہنے لگے۔ مَیں کچھ مذہبی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے کہا بڑی خوشی سے پوچھئے۔ کہنے لگے مرزا صاحب کے دعویٰ کے متعلق پوچھتا ہوں کہ کیا قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مَیں نے کہا ہاں کرتا ہے۔ کہنے لگے کوئی آیت بتایئے۔ مَیں نے کہا کوئی آیت کیا سارا قرآن ہی تصدیق کرتا ہے۔ کہنے لگے یہ کس طرح؟ مَیں نے کہا۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے۔ آپ کوئی آیت پڑھیں مَیں اُس سے ثابت کردوں گا اور خدا تعالیٰ کے تصرف کے ماتحت اُسی سے سمجھادوں گا۔ مَیں نے کہا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [12] ہی پڑھ دیجئے۔ یہ سُن کر وہ کچھ گھبرا سے گئے کہ اس سے شائد اپنا دعویٰ ثابت کریں اس لئے اُس سے چھوڑ کر انہوں نے یہ آیت پڑھی کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ [13] مَیں نے کہا ایمان لانے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان لائے مگر وہ جھوٹ کہتے ہیں اور ایک وہ جو واقعہ میں ایمان لاتے ہیں۔ اب ایسے لوگ جو سمجھتے تو ہیں کہ ایمان لائے مگر درحقیقت ایمان نہیں لائے جب مر کر خدا تعالیٰ کے سامنے جائیں گے تو خدا تعالیٰ اُن سے پوچھے گا کہ تم نے تو ایمان کا دعویٰ کیا تھا مگر حقیقت میں تم ایمان نہیں لائے تھے۔ وہ کہیں گے پھر ہمیں کسی رسول کے ذریعے بتایا

کیوں نہیں گیا۔ مَیں نے اُن صاحب سے پوچھا آج کل کتنے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا بہت کم۔ مَیں نے کہا ایسے ہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ سمجھتے بھی ہیں کہ ایمان لائے مگر حقیقت میں ایمان نہیں لائے ہوتے۔ ان کے لئے کیا ہوگا۔ قرآن کریم سچا ہو ہی نہیں سکتا جب تک ایسے لوگوں کا علاج نہ کرے۔ پس اگر ایسے لوگ ہو سکتے ہیں اور ہیں تو اُن کو راہِ راست دکھانے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور بھی آنا چاہئے۔

قرآن کریم کی پہلی اصولی اصلاح ہستیٔ باری تعالیٰ کے متعلق

اب مَیں مثال کے طور پر بعض اُن باتوں کو لیتا ہوں جو اصولی ہیں اور بتاتا ہوں کہ قرآن کریم نے کس طرح دوسرے مذاہب یا فلسفیوں کے خیالات کی غلطیاں نکالیں اور اُن کی اصلاح کی ہے۔ پہلی بات جو مذہب کا سوال سامنے آتے ہی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آیا اِس دنیا کا کوئی خدا ہے یا یہ دنیا آپ ہی آپ ہے اور اس کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔

اِس بات کو قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خدا کوئی نہیں اور ان کے منبع علم کی بھی تشریح کی ہے مگر مَیں ان مثالوں کے متعلق صرف ایک ایک دلیل دونگا۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔[14] یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایک مقررہ قاعدہ کے ماتحت مر رہے ہیں اور پیدا ہو رہے ہیں ورنہ کوئی ایسی ہستی نہیں جو یہ کام کر رہی ہے۔

جو لوگ دہریہ ہوتے ہیں اُن میں سے کئی ایسے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے ردّ میں دلیلیں دینے لگ جاتے ہیں لیکن جو بڑے بڑے اور ہوشیار دہریہ ہوتے ہیں جیسے ہکسلے وغیرہ وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دلیل خدا کے ہونے کی نہیں ملتی۔ چنانچہ ہکسلے سے پوچھا گیا کہ تیرا مذہب کیا ہے؟ تو اُس نے کہا ''یہ کہ مَیں نہیں جانتا''۔ غرض ان کی بنیاد نفی پر ہے اور خدا تعالیٰ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ بات بتادی ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔ خدا کے منکر صرف یہی

بات کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اِس کے لئے کوئی مثبت دلیل اُن کے پاس نہیں ہوتی۔ صرف وہم اور گمان ہوتا ہے کہ خدا نہیں ہے اور نفی پر قطعیت کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ تو دہریت کا ذکر ہے۔

اَب مَیں یہ بتاتا ہوں کہ دہریت کو قرآن نے کس طرح رَدّ کیا ہے مگر صرف ایک دلیل دونگا اور وہ یہ ہے کہ سورۃ جاثیہ کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۵ کہ اس دنیا میں ایک ایسا بادشاہ نظر آرہا ہے جو آسمان اور زمین دونوں پر قابض ہے اور جس کی طاقتوں کا مظاہرہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ اِس جگہ آسمان سے شرعی نظام اور زمین سے طبعی نظام مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی یعنی شرعی اور زمینی یعنی طبعی نظاموں میں ایک زبردست اتحاد پایا جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب کچھ اتفاق سے اور آپ ہی آپ ہے اگر طبعی نظام آپ ہی آپ ہے تو نبیوں کے کلام سے اُس کا تطابق کیوں ہوتا؟ ان دونوں میں تو ایسا اتحاد ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس دنیا کو چلانے والا کوئی نہیں۔ یہ مشاہدہ اور نظامِ عالم کی دلیلیں میرے لیکچر ''ہستی باری تعالیٰ'' میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ یعنی خدا کے کلام اور طبعی نظام کا آپس میں اتحاد۔ جسے دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہے تو نبیوں کے کلام سے اس کا تطابق کیوں ہوتا ہے؟ پس شرعی اور طبعی نظام کا ایک دوسرے کی تائید کرنا بلکہ طبعی نظام کا شرعی نظام کے تابع چلنا بتاتا ہے کہ اس دنیا کا چلانے والا کوئی ضرور موجود ہے۔ یہ دلیل مجموعہ ہے دلیل مشاہدہ اور دلیل نظام کا اور میرے نزدیک سب دلیلوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ دلیل نظام یہ بتاتی ہے کہ سب دنیا ایک نظام کے نیچے ہے اور دلیل مشاہدہ یہ بتاتی ہے کہ شریعت اپنے ساتھ ثبوت رکھتی ہے اور اِن دونوں دلیلوں کا مجموعہ یہ بتاتا ہے کہ دونوں نظام ایک دوسرے سے متحد ہیں اور یہ اتحاد سب سے بڑا ثبوت ہے ہستیٔ باری تعالیٰ کا اس کے متعلق میں ایک مثال قرآن کریم سے ہی پیش کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ آسمان کا نظام کس طرح زمینی نظام سے متفق ہوا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سو سال ہوئے دعویٰ کیا کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ زمین و آسمان پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ خدا

تعالیٰ کے نشانات میری تائید میں ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ دنیا جو ایک نظام کے ماتحت چل رہی تھی اُس میں ایسے تغیرات رونما ہونے لگ جاتے ہیں جو آسمانی کلام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اُسی ہستی کے احکام کے ماتحت چل رہی ہے جس کی طرف سے قرآن آیا۔

بعثتِ محمدیؐ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا

اِس کے ثبوت کے لئے کہ کس طرح آسمان اور زمین کی بادشاہت ایک ہستی کے ماتحت چل رہی ہے مَیں آج سے چار ہزار سال پیچھے جاتا ہوں۔ آج سے چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں بلند کرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر یہ دُعا کی تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ [۱۶] یعنی اے خدا ہم تجھ سے یہ دُعا کرتے ہیں کہ اس ملک میں جو ہماری آئندہ نسل پھیلے گی۔ اُس میں سے تُو ایک رسول بھیج جس کے یہ کام ہوں کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ۔ وہ تیری آیات انہیں پڑھ کر سنائے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ شریعت کی باتیں انہیں سکھائے وَالْحِكْمَةَ اور احکام کی حکمتیں اُن پر واضح کرے وَيُزَكِّيْهِمْ اور انہیں پاک کرے اور بدیوں سے بچائے۔ یہ دُعا چار ہزار سال پہلے ایسی جگہ پر کی گئی جہاں نہ غلّہ پیدا ہوتا تھا اور نہ اور کسی قسم کی کھیتی۔ زمزم کا چشمہ جو نشان کے طور پر قائم ہوا اس کا پانی بھی کھاری ہے جسے ہندوستانی نہیں پی سکتے۔ اِس کھاری پانی کے چشمہ کے پاس چند گھر آباد تھے۔ وہاں پتھروں کا ایک مکان بناتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب جو لوگ یہاں پیدا ہوں اُن میں تُو اپنا ایک رسول بھیج جو تیری ہستی کے دلائل انہیں بتائے۔ لوگوں کو تیری شریعت سکھائے۔ اس شریعت کی حکمت یعنی باریکیاں بتائے کہ شریعت پر عمل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ پھر اُن کو پاک بنائے۔

اِس دُعا پر اگر غور سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں مندرجہ ذیل امور کی خبر دی گئی ہے۔

اوّل اس عرصہ تک کہ اس نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئے مکّہ قائم رہے گا۔ اب طبعی صورت تو یہ ہے کہ آندھیاں آتی ہیں جو شہروں کے شہر برباد کر دیتی ہیں۔ زلزلے آتے ہیں جو بڑے بڑے شہروں کو تودۂ خاک بنا دیتے ہیں مگر یہاں پہلے سے خبر دے دی گئی کہ تمام قسم کے حادثات اس آبادی کو اُجاڑ نہ سکیں گے اور آخر ایسا ہی ہوا۔

دوسری بات یہ بتائی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ کہا یہ گیا کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس رسول کے آنے تک حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل موجود ہوگی۔ دنیا کے اکثر گھرانے ایسے ہوتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ تین چار سو سال تک اُن کی نسل چلتی ہے اور پھر مٹ جاتی ہے مگر حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے متعلق یہ کہا گیا کہ دو ہزار سال تک یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آنے تک اُن کی نسل بہر حال قائم رہے گی۔ بیماریوں پر یہ پیشگوئی حکومت کرے گی تا کہ وہ اس نسل کو تباہ نہ کر سکیں۔ لڑائیوں اور جنگوں پر یہ پیشگوئی حکومت کرے گی تا کہ وہ اس نسل کا خاتمہ نہ کریں۔ اسی طرح ہر قسم کے حادثات پر یہ پیشگوئی حکومت کرے گی تا کہ وہ اس نسل کو مٹا نہ دیں۔ اولاد کی اولاد ہوتی چلی جائے گی اور یہ نسل ہمیشہ قائم رہے گی۔

تیسری بات اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے ایک رسول آئے گا حالانکہ کوئی شخص دعویٰ کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی نسل میں کس قسم کے انسان پیدا ہونگے۔

چوتھی بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اس قوم کی کایا پلٹ دے گا اور وہ لوگ ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کو پاک کر سکتے ہیں۔ ایک شاگرد کو ایک استاد پاک نہیں کر سکتا۔ بوعلی سینا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کو ایک کتاب پڑھا رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے ایک شاگرد نے کہا کہ آپ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے بھی بڑھ کر ہیں۔ بوعلی سینا مومن آدمی تھے مگر علم النفس کے ماہر تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ ممکن ہے اِس وقت اگر مَیں اسے سمجھاؤں تو اس کی سمجھ میں بات نہ آئے اور یہ ضد میں اُور گمراہ ہو جائے۔ اِس لئے چپ رہے لیکن ایک دن جبکہ سردی کا موسم تھا اور تالاب کا پانی سخت سردی سے جما ہوا تھا انہوں نے اُس شاگرد سے کہا کہ کپڑے اُتارو اور تالاب میں کود پڑو۔ اُس نے کہا آپ یہ

کیسی احمقانہ بات کر رہے ہیں۔ کیا مَیں پانی میں کود کر مر جاؤں۔ انہوں نے کہا اُس دن تو تم مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑا کہہ رہے تھے اور آج اتنی بات بھی نہیں مانتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ تھے کہ آپ کے ماننے والوں نے کبھی نہ کہا کہ ہم مر جائیں گے بلکہ آپؐ جو کچھ کہتے تھے فوراً اُس پر عمل کرتے خواہ موت سامنے نظر آتی اور خوشی خوشی آپؐ کے لئے جانیں دے دیتے۔

غرض یہ کتنی بڑی بات بتائی کہ وہ ایک دو کی نہیں بلکہ قوم کی قوم، کی کایا پلٹ دے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اِس پیشگوئی کے دو ہزار سال بعد مکّہ موجود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل موجود تھی۔ ہوسکتا تھا کہ نسل موجود ہوتی مگر انہیں پتہ نہ ہوتا کہ کس کی اولاد ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا کہ بائبل میں بھی ذکر کر دیا کہ یہ ابراہیم کی نسل ہے۔ اس طرح اُن میں یہ احساس بھی قائم رکھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ پھر ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس قوم کی کایا پلٹ دی۔

حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی پیشگوئی

پھر ہم کچھ اَور نیچے آجاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پھر دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چھ سو سال گذرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں اور وہ آپؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کی یہ بات بتاتے ہیں کہ

”مَیں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔“ [۱۷]

اِس سے ابراہیمی دُعا کی تصدیق کی گئی۔ حضرت اسحاقؑ حضرت اسمٰعیلؑ کے بھائی تھے اور حضرت موسیٰؑ حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے۔ گویا اِن کے بھائیوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کیا گیا اور اس طرح چھ سو سال کے بعد پھر ابراہیمی وعدہ کا تکرار کیا گیا۔ گویا اس میں پھر حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل کے قائم رہنے اور اُن میں سے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی خبر دی جاتی ہے۔

پھر اُس شخص کے متعلق ایک اَور امر بیان کیا جاتا ہے کہ:-

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی۔''[۱۸]

سیناؔ وہی پہاڑ ہے جسے قرآن شریف میں طور کہا گیا ہے۔ اِس سے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کا ظہور مراد ہے۔ شعیرؔ سے بعض نے حضرت مسیحؑ مراد لئے ہیں مگر یہ اُن پہاڑوں کا نام بھی ہے جس میں سے گذر کر حضرت موسیٰؑ آئے اور انہوں نے دشمن پر فتح پائی تھی۔ اس لئے یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔''

آگے فرماتا ہے

''فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔''

اِس میں بھی دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوگا۔ دومؔ یہ کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی وجود کے متعلق ہیں۔ جس طرح پہلی دو بھی ایک ہی کے متعلق ہیں۔

پھر بتایا کہ آتشی شریعت اس کے ساتھ ہوگی۔ اس میں یہ خبر ہے کہ وہ فارانؔ کی پہاڑیوں سے جو مکّہ کے گرد کے پہاڑ ہیں دس ہزار قدوسیوں سمیت آئے گا اور آتشی شریعت اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اِس پیشگوئی میں یہ بتایا گیا ہے کہ (۱) وہ نبی مکّہ سے نکالا جائے گا کیونکہ پہلے بتایا کہ وہ مکّہ میں پیدا ہوگا۔ پھر کہا کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ مکّہ سے نکالا جائے گا (۲) یہ کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک لشکر کے ساتھ مکّہ پر حملہ آور ہوگا۔ (۳) یہ کہ اس کے ساتھ دس ہزار سپاہی ہونگے۔ (۴) یہ کہ وہ لوگ قدوسی ہونگے یعنی يُزَكِّيهِمْ کے مصداق ہونگے۔ (۵) یہ کہ اُس کے ساتھ گناہ سوز شریعت ہوگی۔ یہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کا ترجمہ ہے۔ جب انسان کو معلوم ہو کہ فلاں حکم کے ماننے میں میرا فائدہ ہے تو اس پر عمل کرتا ہے۔ شریعت کا لفظ الکتٰب سے اور گناہ سوز کا مفہوم حکمۃ سے نکلتا ہے کیونکہ حکمت معلوم کرنے کے بعد انسان گناہ کے نزدیک جانے سے احتراز کرتا ہے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ اس پیشگوئی میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ پورا ہوا۔ فارانؔ کی پہاڑیاں

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مکّہ کی پہاڑیاں ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''وادیٔ فاطمہ میں (یہ مکّے اور مدینے کے درمیان ایک پڑاؤ ہے) گل جذیرہ یعنی پنجۂ مریم بیچنے والوں سے پوچھو کہ وہ پھول کہاں سے لاتے ہیں تو لڑکے اور بچّے بھی یہی کہیں گے کہ مِنْ بَرِّيَّةِ فَارَانَ یعنی دشتِ فاران سے[19]۔

بائبیل میں بھی ایسے حوالے موجود ہیں۔ جن سے اشارۃً ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ فاران یہی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیشگوئی

اِس کے بعد اور چار سو سال گذرتے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام آتے ہیں تو وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

''اے یروشلم کی بیٹیو! (یعنی بنی اسرائیل) مَیں تمہیں قسم دیتی ہوں کہ اگر تمہیں میرا محبوب (مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) مِل جائے تو تم اُسے کہیو کہ مَیں عشق کی بیمار ہوں۔''[20]

وہ جواب دیتی ہیں:-

''تیرے محبوب کو دوسرے محبوبوں کی نسبت سے کیا فضیلت ہے۔ اے تُو جو عورتوں میں جمیلہ ہے تیرے محبوب کو دوسرے محبوب سے کیا فضیلت ہے جو تو ہمیں ایسی قسم دیتی ہے۔''[21]

اِس پر وہ فرماتے ہیں:-

''میرا محبوب سُرخ وسفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔ اُس کا سر ایسا ہے جیسے چوکھا سونا۔ اُس کی زُلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوّے کی سی کالی ہیں۔ اس کی آنکھیں اُن کبوتروں کی مانند ہیں جو لب دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہیں۔ اُس کے رُخسار پھولوں کے چمن اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاریوں کی مانند ہیں۔ اُس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے۔ اُس کے ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے جواہر جڑے ہیں۔ اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا

سا کام ہے جس پر نیلم کے گل بنے ہوں۔ اُس کے پیر ایسے جیسے سنگِ مرمر کے ستون جو سونے کے پائیوں پر کھڑے کئے جائیں۔ اُس کی قامت لبنان کی سی۔ وہ خوبی میں رشکِ سرو ہے۔ اُس کا مُونہہ شیرینی ہے۔ ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے (عبرانی میں لکھا ہے وہ محمد یم ہے) اے یروشلم کی بیٹیو! یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے۔"[۲۲]

گویا حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ جب وہ محبوب آئے تو اُسے مان لینا اور پھر خود ہی سوال پیدا کر کے کہتے ہیں کہ اس میں یہ یہ خوبیاں ہونگی۔ ان آیات میں بعض باتیں تو شاعرانہ رنگ رکھتی ہیں اور بعض رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیہ سے قطعی طور پر ملتی ہیں۔ مثلاً لکھا ہے اُس کی زُلفیں پیچ در پیچ ہیں۔ انگریزی بائیبل میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ "His locks are wavy." اور یہی حلیہ حدیثوں میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالطَّوِيْلِ الْمُمَغِطِ وَبِالْقَصِيْرِ الْمُتَرَدِّدِ وَكَانَ رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبِطِ كَانَ جَعْدًا رَجِلًا۔[۲۴] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ تو بہت لمبے قد کے تھے۔ نہ بہت چھوٹے بلکہ آپ میانہ قد و قامت رکھنے والوں میں سے تھے۔ اِسی طرح آپؐ کے سر کے بال نہ تو سخت گھنگھرالے تھے جیسے کہ حبشیوں کے ہوتے ہیں اور نہ ہی بالکل سیدھے تھے بلکہ اس طرح کے گھنگھرالے تھے جس طرح کنگھی کرنے سے بال نیچے سے ذرا خمیدہ ہو جائیں اور مڑ جائیں۔ یہی حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ آپ کے بال لمبے ہونگے یعنی زُلفیں ہونگی مگر بال کچھ پیچ دار ہونگے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کانوں کی لو تک آتے تھے۔ گویا لمبے بال ہونے کے ساتھ یہ بھی پیشگوئی تھی کہ بال نہ پیچدار ہونگے اور نہ بالکل سیدھے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

پھر حضرت سلیمانؑ آپ کا رنگ سُرخ و سفید بیان کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رنگ کے متعلق فرماتے ہیں ابیضُ مشربٌ[۲۵] اور مشرب کے معنے لغت والے یہ لکھتے ہیں کہ ایسا سفید رنگ جس میں سُرخی ملی ہوئی ہو۔[۲۶]

پھر حضرت سلیمانؑ نے یہ فرمایا کہ وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوگا۔ یعنی چھوٹے قد کا نہ ہوگا اور

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بھی آتا ہے کہ آپ کا قد ایسا تھا جو لمبائی کی طرف مائل تھا۔ گویا حضرت سلیمانؑ کی بیان کی ہوئی سب باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زلفیں تو اس قدر مشہور ہیں کہ لوگ ان کے متعلق شعر کہا کرتے ہیں۔

یسعیاہ نبی کی پیشگوئی

اب ہم کچھ اور نیچے چلتے ہیں تو حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے سات سو سال بعد اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تیرہ سو سال بعد یسعیاہ نبی کے زمانہ میں آتے ہیں۔ یہ پھر حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کی بات کو دہراتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا اور سلطنت اس کے کاندھے پر ہوگی اور وہ اس نام سے کہلاتا ہے۔ عجیب۔ مشیر۔ خدائے قادر ابدیت کا باپ (انگریزی میں ہے Everlasting Father یعنی ہمیشہ رہنے والا باپ) سلامتی کا شہزادہ۔ اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ وہ داؤدؑ کے تخت پر اور اس کی مملکت پر آج سے لیکر ابد تک بندوبست کرے گا اور عدالت اور صداقت سے اسے قیام بخشے گا۔ ربّ الافواج کی غیوری یہ کرے گی۔"[۲۷]

اِس میں بتایا کہ جب وہ رسول آئے گا تو لوگ کہیں گے عجیب ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے۔ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا[۲۸] ہم نے یہ کتاب سُنی ہے جو عجیب اور نرالی قسم کی ہے۔ متی باب ۲۱ آیت ۴۲ میں بھی حضرت مسیحؑ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام عجیب رکھا ہے۔ چنانچہ آتا ہے:-

"یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب۔"[۲۹]

دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ اُس کا نام مشیر ہوگا۔ یعنی وہ مشورے دینے والا ہوگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہو کہ لوگ اُس سے مشورے لیتے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ

الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ [۳۰] اے مومنو! تمہاری عادت ہے کہ تم رسول سے مشورے لیا کرتے ہو مگر رسول کا وقت بڑا قیمتی ہے۔ تمہیں چاہئے کہ جب مشورہ لو تو مسکینوں کے لئے صدقہ کیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہوگا اور اگر تم میں سے کوئی صدقہ نہ کر سکے تو اللہ اس کمزوری کو دُور کرنے والا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے بعض اوقات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جا رہے ہوتے تو کوئی بڑھیا آپ کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی کہ مجھے آپ سے مشورہ لینا ہے۔ مسجد میں بھی لوگ آپ سے مشورہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص اتنی دیر آپ سے باتیں کرتا رہا کہ مسجد میں جو لوگ نماز پڑھنے آئے تھے وہ سو گئے۔ [۳۱]

تیسرا نام خدائے قادر بتایا گیا ہے۔ توریت میں خدا کا لفظ مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ ''پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا'' [۳۲] متی باب ۲۱ آیت ۴۰ میں حضرت مسیحؑ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''جب انگورستان کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔''

گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کو حضرت مسیحؑ نے خدا کا آنا بتایا۔

اب ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ میں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۔ [۳۳] یعنی جس طرح ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کے لئے خدا سا بنا کر بھیجا تھا اسی حیثیت سے ہم نے تجھے دنیا کے لئے بھیجا ہے۔

چوتھا نام آپؐ کا ابدیت کا باپ بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ [۳۴] یعنی نبی کا تعلق مومنوں کے ساتھ باپوں سے بھی زیادہ ہے اور اُس کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں مائیں ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باپ ہوئے۔ سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں آتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيّٖن۔ [۳۵] محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں تو کسی کے باپ نہیں لیکن روحانی باپ ہیں رسول ہونے کی وجہ سے اور ابدی باپ ہیں خاتم النّبیین ہونے کی وجہ سے۔

پانچواں نام سلامتی کا شہزادہ بتایا گیا ہے۔ عبرانی میں بادشاہ کی جگہ شہزادہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا اپنے الفاظ میں یہ مطلب ہوا کہ سلامتی کا بادشاہ اور سلامتی اسلام ہے۔ اس لئے اصل نام یہ ہوا کہ اسلام کا بادشاہ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ [۳۶] یوں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بادشاہ تھے۔ فتح مکّہ پر مکّہ والوں کو آپؐ نے بلا کر کہا بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے تو انہوں نے کہا آپ وہی سلوک کریں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ اِس پر آپؐ نے فرمایا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ [۳۷] جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اس طرح بھی آپؐ نے سلامتی ہی دکھائی۔

پھر چھٹی بات آپؐ کے متعلق یہ بیان کی گئی ہے کہ داؤدؑ کے تخت پر اور اس کی مملکت پر آج سے ابد تک بندوبست کریگا۔ یہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے متعلق پیشگوئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ شام اور فلسطین پر قبضہ انہیں حاصل ہوگا۔ پھر اُسی کتاب میں ہم عرب کی بابت الہامی کلام پڑھتے ہیں کہ

> ''عرب کے صحراء میں تم رات کاٹو گے۔ اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وے تلواروں کے سامنے ننگی تلوار اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدّت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔'' [۳۸]

اِس جگہ یہ پیشگوئی بیان کی کہ جو آنے والا نبی ہوگا جب وہ اپنے وطن سے نکالا جائے گا تو ہجرت کے ایک سال بعد اُس کی قوم اس پر حملہ کرے گی۔ ایک رات میدان میں سوئیں گے اور صبح کو جنگ ہوگی جس میں دشمن شکست کھائے گا اور اُس کے بڑے بڑے بہادر مارے جائیں گے یہ

پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بدرؔ کی جنگ سے پوری ہوئی۔

اب دیکھو اس میں کتنی باتیں بیان کی گئیں۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ (۱) پہلے اس رسول کو مکّہ والے اپنے شہر سے نکالیں گے اور (۲) پھر لڑائی کے لئے مکّہ والے آئیں گے اگر وہی جس نے یسعیاہؔ پر یہ کلام نازل کیا تھا دنیا پر قابض نہ تھا اور دنیا اُس کے ہاتھ میں نہ تھی تو اُس نے کیوں اہل مکّہ سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ سے نکلوایا اور ایک سال کے بعد کس نے ان کو حملہ کرنے کے لئے نکالا۔ (۳) پھر جب انہوں نے حملہ کیا تو اس حملہ میں سارے سردار شامل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مکّہ کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس جنگ میں شریک نہ ہوا ہو (۴) پھر اس جنگ میں بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اِن باتوں سے ظاہر ہے کہ خیالات پر اور تلواروں پر اُسی کا قبضہ تھا جس نے یسعیاہؔ کے ذریعہ یہ پیشگوئی کرائی تھی۔ مکّہ میں اس جنگ کی وجہ سے ایسی تباہی آئی کہ ہر گھر میں ماتم برپا ہو گیا اور اس ڈر سے کہ لوگ دل نہ چھوڑ بیٹھیں اُن کو حکماً رونے سے منع کر دیا گیا۔ ایک شخص کے تین بیٹے تھے اور وہ تینوں اس جنگ میں مارے گئے۔ وہ اندر چھپ چھپ کر روتا تھا مگر اُس کی تسلّی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن ایک شخص کا اونٹ گُم ہو گیا اور وہ رونے لگ گیا۔ اُس شخص نے اُس کے رونے کی آواز سُن کر کسی سے کہا دیکھ کیا بین ڈالنے کی اجازت مل گئی ہے اور پھر فوراً باہر نکل کر پیٹنے لگ گیا اور زور زور سے بین ڈالنے لگا۔

غرض ہجرت کے عین ایک سال بعد بدرؔ کی جنگ ہوئی اور اُس میں قیدارؔ کے بڑے بڑے جنگ جُو اور بہادر مارے گئے اور شکست کھا کر بھاگے اور تیماؔ جسے عرب تہامہ کہتے ہیں اس میں ماتم برپا ہو گیا۔

پھر یسعیاہ نبی ہی کہتے ہیں:-

"دیکھ مَیں نے اسے قوموں کے لئے گواہ مقرر کیا بلکہ لوگوں کا ایک پیشوا اور فرمانروا۔ دیکھ تو ایک گروہ جسے تو نہیں جانتا بلاوے گا اور وے گروہ جو تجھے نہیں جانتیں۔ خداوند تیرے خدا اور اسرائیل کے قدوس کے لئے جس نے تجھے جلال بخشا تیرے پاس دوڑتی آئیں گی۔"[۳۹]

اِس میں یہ باتیں بتائیں کہ (۱) وہ لوگوں کے لئے گواہ ہوگا۔ (۲) لوگوں کے لئے پیشوا اور

(۳) فرمانروا ہوگا (۴) ایسی قومیں اُس پر ایمان لائیں گی جنہوں نے بنی اسرائیل کے نام نہ سُنے ہوں گے اور نہ بنی اسرائیل نے اُن کے۔

لوگوں کے لئے گواہ ہونے کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ [۲۴۲] یعنی ہم نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ اس زمانہ میں بھی اور پہلے بھی تا کہ یہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم باقی دنیا پر گواہ ہو اور اس رسالت کو قیامت تک لئے چلے جاؤ۔ گویا وہی الفاظ جو بائبل میں آتے ہیں قرآن کریم میں بھی آئے ہیں۔

(۲-۳) پیشوا اور فرمانروا کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ [۲۴۳] یعنی اے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری فرمانبرداری اختیار کرو۔ مَیں تمہارا پیشوا اور فرمانروا ہوں۔

چوتھی بات یہ بیان فرمائی کہ دوسری قومیں اس رسول پر ایمان لاویں گی۔ سو اس کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (اعراف:۱۵۹) یعنی تو ساری دنیا سے کہہ دے کہ مَیں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔ اب دیکھ لو ہم میں سے کوئی کسی قوم کا ہے اور کوئی کسی قوم کا اور یہ قومیں نہ عربوں کو جانتی تھیں اور نہ عرب انہیں جانتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں سب ایک ہوگئی ہیں۔

پھر یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۲ تا ۵ میں ہی لکھا ہے:-

"تب قومیں تیری راستبازی اور سارے بادشاہ تیری شوکت دیکھیں گے اور تو ایک نئے نام سے کہلایا جائے گا جو خداوند کا مونہہ خود تجھے رکھ دے گا اور تو حفیظاہ کہلائے گی اور تیری سرزمین بعولاہ کیونکہ خداوند تجھ سے خوش ہے اور تیری زمین خاوند والی ہوگی۔" [۲۴۴]

اِس میں بتایا گیا ہے کہ آنے والے موعود کے زمانہ میں اُس کی قوم حفیظاہ کہلائے گی اور اُس کی زمین بعولاہ۔ سارے بادشاہ اس کی شوکت دیکھیں گے اور اُس کا نیا نام رکھا جائے گا۔

پھر لکھا ہے:-

"تب وہ مقدس قوم اور خداوند کے چھڑائے ہوئے کہلائیں گے اور تُو مطلوبہ کہلائے گی اور وہ شہر جو ترک کیا نہ گیا۔"[۴۳]

یہ سب باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً (۱) کہا گیا ہے کہ وہ ایک نئے نام سے کہلائے گا۔ جسے خداوند کا مونہہ خود رکھ دے گا۔ چنانچہ یہ نیا نام اسلام ہے جو خدا تعالیٰ نے خود رکھا اور ارشاد فرمایا کہ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ. خدا نے خود تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب ایسا نہیں جس کا نام خدا نے رکھا ہو۔ نہ موسوی مذہب کا کوئی نام رکھا گیا اور نہ عیسوی مذہب کا بلکہ اُن کے پیرووں کو بھی کبھی اپنا نام نہ سوجھا مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا خود نام رکھے گا اور یہ بات صرف اسلام میں ہی پائی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ بتائی کہ اس کی قوم کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ چنانچہ آتا ہے کہ وہ قوم حفیظاہ کہلائے گی۔ یہ عبرانی لفظ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تم سے راضی ہوا اور قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔[۴۴] یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے وہ جو ابتداء میں ہی جلد ایمان لے آئے اور مہاجرین اور انصار بھی جو بعد میں آئے۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ گویا قرآن صرف یہی نہیں کہتا کہ خدا مسلمانوں سے خوش ہوا بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ بھی خدا سے خوش ہوئے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اُس کا گھر بعولاہ کہلائے گا۔ یعنی اُس کی حفاظت کی جائے گی اور اُس کی زمین خاوند والی کہلائے گی۔ یعنی کبھی تباہ نہ ہوگی۔ اس کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ [۴۵] فرمایا ہم قسم کھا کر کہتے ہیں طور کی یعنی طور کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اِس کتاب کو بھی بطور شہادت پیش کرتے ہیں جو لکھی ہوئی ہے اور ہمیشہ لکھی جائے گی اور اس خانہ کعبہ کی بھی قسم کھاتے ہیں جو ہمیشہ معمور رہے گا اور دُور دُور سے لوگ اس کی طرف آتے رہیں گے اور اس چھت کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ہمیشہ بلند

رہے گی۔ یعنی اس کی عزت ہمیشہ قائم رہے گی۔

گویا بتایا کہ نہ صرف یہ گھر ہمیشہ معمور رہے گا اور کروڑوں انسان اس سے تعلق رکھیں گے بلکہ بلند و بالا لوگ تعلق رکھیں گے اور اس کی عزّت قیامت تک قائم رہے گی۔ غرض قرآن نے یہ خبر دی کہ بیت اللہ قائم رہے گا۔ اِس سے اعلیٰ درجہ کے لوگ تعلق رکھیں گے اور مکّہ سے تعلق رکھنے والی کتاب کا چشمہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

چوتھی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قوم ہمیشہ مقدس کہلائے گی۔ قرآن کریم کا یہ بھی دعویٰ ہے چنانچہ فرمایا۔ بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ۔ كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔ [۴۶] یہ قرآن ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا جو بڑے معزز اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہونگے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ بعض اوقات خرابی بھی تو آسکتی ہے۔ پھر یہ کتاب ہمیشہ مقدس لوگوں کے ہاتھ میں کیسے رہی۔ سو قرآن نے اِس کا جواب بھی دے دیا ہے کہ۔ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ [۴۷] فرمایا۔ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلم) کو خدا نے اُمیوں میں رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ وہ ان کو اللہ کی آیتیں سنائے اور پاک کرے اور کتاب کی تعلیم دے اور حکمت سکھائے۔ اس کے بعد جب مسلمانوں میں خرابی پیدا ہوگی تو وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ خدا اس رسول کو ایک دوسری قوم میں بھیجے گا جو ابھی تک ان سے ملی نہیں گویا یہ قوم ہمیشہ مقدس کہلائے گی کیونکہ اس میں اصلاح کرنے والے آتے رہیں گے۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خداوند کے چھڑائے ہوئے کہلائیں گے۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ (الاعراف:۱۵۸) یعنی دنیا کی گردنوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہم نے اس لئے بھیجا ہے کہ اُن بیڑیوں کو کاٹ دے اور لوگوں کو ان بندھنوں سے نجات دے۔ اس طرح وہ چھڑائے ہوئے کہلائیں گے۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بستی مطلوبہ کہلائے گی۔ قرآن کریم بھی فرماتا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا [۴۸] یعنی قیامت تک کے لئے یہ بات

مقرر کردی گئی ہے کہ جسے طاقت ہو وہ اس بستی میں جائے اور حج کرے کہ یہ بستی مطلوبہ ہے۔

حبقوق نبی کی پیشگوئی

پھر ہم اور آگے چلتے ہیں۔ تو حبقوق نبی فرماتے ہیں:-

''خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔ سلاہ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی۔ مری اس کے آگے آگے چلی اور اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی۔ وہ کھڑا ہوا اور اُس نے زمین کو لرزا دیا۔ اس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا اور قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پُرانی پہاڑیاں اس کے آگے دھنس گئیں۔ اُس کی قدیم راہیں یہی ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر بپت تھی اور زمینِ مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے۔ سورج اور چاند اپنے اپنے مکان میں ٹھہر گئے۔ تیرے تیروں کی روشنی کے باعث جو اڑے اور تیرے بھالے کی چمکاہٹ کے سبب تو قہر کے ساتھ زمین پر کوچ کر گیا۔ تُو نے نہایت غصّے ہو کے قوموں کو روند ڈالا ہے۔ تو اپنی قوم کو رہائی دینے کے لئے ہاں اپنی مسوح کو رہائی دینے کے لئے نکل چلا۔ تو **بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ سلاہ تو نے اس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا۔** وہ مجھے پراگندہ کرنے کو آندھی کی طرح نکل آئے۔ اُن کا فخر یہ تھا کہ مسکینوں کو ہم چپکے نگل جاویں.... ہر چند انجیر کا درخت نہ پھولے اور تاکوں میں میوے نہ لگیں... تس پر بھی خداوند کی یاد میں خوشی کرونگا۔ مَیں اپنی نجات کے خدا کے سبب خوش وقت ہونگا۔''[۴۹]

اِس میں پہلی پیشگوئی تو یہ کی گئی ہے کہ خدا تیمان سے ظاہر ہوا۔ تیمان کے معنے عبرانی مفسّر جنوب کی سرزمین کے کرتے ہیں اور عرب فلسطین سے جنوب کی طرف ہی ہے لیکن عرب لوگ ایک وادی کو وادیٔ تہامہ کہتے ہیں اور مکّہ کو اس وادیٔ تہامہ میں شامل سمجھتے ہیں۔ قاموس میں لکھا ہے۔ وَتِهَامَةُ بِالْكَسْرِ مَكَّةُ شَرَّفَهَا اللهُ تَعَالٰى وَاَرْضٌ مَّعْرُوْفَةٌ۔[۵۰] یعنی تہامہ سے مراد مکّہ

مکرمہ ہے اللہ تعالیٰ اس کے شرف کو بڑھائے اور ایک معروف زمین بھی ہے۔

تاج العروس میں لکھا ہے۔ وَمِنْ اَسْمَائِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التِّهَامِيُّ لِكَوْنِهٖ وُلِدَ بِمَكَّةَ۔ [۵۱] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے ایک نام تہامی بھی ہے کیونکہ آپ کی ولادت مکّہ میں ہوئی۔ بائیبل والے تیمان کو صرف جنوبی علاقہ قرار دیتے ہیں اور تیما کو حضرت اسمٰعیلؑ کا ایک بیٹا قرار دیتے ہیں جو عرب میں آباد تھا۔ پس گو وہ مکّہ کو تہامہ نہ قرار دیں لیکن عرب کا ایک حصّہ ہونے سے انہیں بھی انکار نہیں ہوسکتا اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک وقت ایک قوم ایک جگہ آباد ہوا ور پھر اُٹھ کر ذراہٹ کر دوسری جگہ بس گئی ہو۔

دوسرے یہ ذکر ہے کہ وہ فارانؔ سے ظاہر ہوا اور فارانؔ بھی حضرت اسمٰعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام ہے اور وہ بھی عرب میں تھا۔ اُن کے علاقہ کو یوروپین جغرافیہ والے تسلیم کرتے ہیں کہ عرب میں تھا گو اسے بھی فلسطین کے پاس پاس بتاتے ہیں لیکن اس بارہ میں خود عربوں کی شہادت زیادہ معتبر تسلیم کی جائے گی بہ نسبت دوسری قوموں کے اور عرب لوگ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیانی جنگل کو برّیہ فاران کہتے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وادیٔ فاطمہ نامی پڑاؤ پر اگر پنجۂ مریم بیچنے والوں سے پوچھا جائے کہ تم یہ کہاں سے لائے ہو تو یہی کہتے ہیں کہ ہم برّیہ فاران یعنی دشتِ فاران سے لائے ہیں۔ تاج العروس میں لکھا ہے وَفِي الْحَدِيْثِ ذُكِرَ جِبَالُ فَارَانَ وَهُوَ اسْمٌ لِجِبَالِ مَكَّةَ بِالْعِبْرَانِيِّ [۵۲] کہ حدیث میں فاران کے پہاڑوں کا جو ذکر آتا ہے۔ اس سے مراد مکّہ کی پہاڑیاں ہیں اور یہ نام عبرانی میں مستعمل ہے۔

پھر دوسری اور تیسری پیشگوئی یہ ہے کہ آسمان اُس کی شوکت سے چُھپ گیا اور زمین اُس کی حمد سے معمور ہوگئی۔ یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ [۵۳] یعنی اللہ اور اُس کے ملائکہ اِس نبی پر آسمان سے درود بھیج رہے ہیں۔ اِس لئے اے مومنو! تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو۔ گویا آسمان آپ کی شوکت سے چُھپ گیا۔ حدیث میں آتا ہے آسمان میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور چونکہ سب کے سب ملائکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج رہے ہیں۔ اس لئے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شوکت سے سارا آسمان چھپ گیا۔ آگے بتایا کہ ہم نے بھی زمین کو اُس کی حمد سے معمور کرنا ہے اس لئے اے مسلمانو! اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس نبی پر درود وسلام بھیجو۔ آسمان کی شوکت کے متعلق ہمارا کام تھا وہ ہم نے کر دیا۔ اب زمین کو حمد سے معمور کرنا تمہارے سپرد ہے۔ تم اُٹھتے بیٹھتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجو اور اِس طرح صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا پر عمل کرو۔ غرض دونوں باتیں پوری ہوگئیں۔ آسمان سے فرشتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں اور زمین پر مسلمان اور پھر زمین کا وہ کونسا حصّہ ہے جہاں مسلمان نہیں ہیں۔ اِس طرح زمین بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمد سے معمور ہوگئی۔

چوتھی پیشگوئی یہ بیان کی کہ مری اس کے آگے آگے چلی۔ اس کے معنے یہ ہیں۔ کہ جدھر اُس نے توجہ کی اُدھر ہی دشمن ہلاک ہو گئے۔ یہ پیشگوئی حضرت عیسیٰؑ پر چسپاں نہیں ہوسکتی کیونکہ مری اُن کے آگے نہ چلی بلکہ بقول عیسائیاں وہ مری کے آگے چلے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ وہ دشمنوں سے بچائے گئے لیکن عیسائی کہتے ہیں اُن کے دشمنوں نے انہیں صلیب پر مار دیا۔

پانچویں پیشگوئی یہ کی گئی ہے کہ اُس کے قدموں پر آتشی وبا روانہ ہوئی۔ بائبل کے مفسّر کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں جائے گا وبا آئے گی مگر خدا کے کسی مقدس کی یہ علامت نہیں ہوتی۔ بعض بائبل کے نسخوں میں خصوصاً عربی نسخوں میں لکھا ہے۔ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْحُمّٰى [۵۴] کہ اس کے پاؤں کے پاس سے بخار نکل گیا۔ یعنی جہاں اُس کا پاؤں پڑے گا وہاں سے بخار نکل جائے گا۔ گویا آتشی وبا سے مراد بخار ہے۔ یہ بات بھی رسول کریم صلی الہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت وضاحت سے پوری ہوئی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بخار کی بڑی شدت تھی۔ حتّٰی کہ اسے یثرب اسی لئے کہتے تھے کہ وہاں ملیریا بخار بڑی شدت سے ہوتا تھا۔ جب صحابہؓ وہاں ہجرت کر کے گئے تو سب کو بخار آنے لگا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ قرآن کریم میں بھی مدینہ کا نام یثرب آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا [۵۶] اور یثرب کے معنے عیب اور ہلاکت کے ہیں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے گئے اور صحابہؓ بخار سے بیمار ہو گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو گھبراہٹ پیدا ہوئی اور آپؐ نے یہ دُعا کی کہ اَللّٰهُمَّ الْعَنْ شَيْبَةَ بْنَ رَبِيْعَةَ وَ عُتْبَةَ بْنَ رَبِيْعَةَ وَ اُمَيَّةَ بْنَ خَلْفٍ كَمَا اَخْرَجُوْنَا مِنْ اَرْضِنَا اِلٰى اَرْضِ الْوَبَاءِ۔ اے خدا! شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کو تباہ کر جنہوں نے ہمیں مکّہ کی زمین سے نکال کر بخار کی سرزمین میں پہنچا دیا۔ پھر فرمایا۔ صَحِّحْهَا لَنَا وَ انْقُلْ حُمَّاهَا اِلَى الْجُحْفَةِ [۵۸] یعنی اے خدا! مَیں دُعا کرتا ہوں کہ تو یہاں سے بخار کو نکال دے اور جُحفہ کی طرف بھیج دے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد مدینہ سے بخار دُور ہو گیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اب اِسے یثربؔ نہ کہو کیونکہ اِس میں عیب اور سزا اور ڈانٹ کے معنے پائے جاتے ہیں بلکہ اِسے طیبہؔ کہو۔ [۵۹] غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ میں تشریف لے جانے سے وہاں سے بخار نکل گیا اور اس کی ہوا آج تک نہایت اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔ یہ خبر تھی جو اس پیشگوئی میں دی گئی تھی۔

چھٹی پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ ''وہ کھڑا ہوا اور اُس نے زمین کو لرزا دیا۔'' اِس کے ایک تو ظاہری معنے ہیں۔ وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جو حلیہ لکھا گیا ہے اس میں ایک بات یہ بیان کی گئی ہے کہ اِذَا مَشٰى تَقَلَّعَ كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ فِيْ صَبَبٍ۔ [۶۰] جب آپؐ چلتے تو آپ کا پاؤں زمین پر اس طرح پڑتا کہ گویا پاؤں دھنس گیا ہے۔

دوسرے معنے لرزانے کے یہ ہیں کہ آپ کا بے حد رُعب تھا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ نصرت بالرعب مسیرۃ شھر۔ یعنی ایک ایک مہینہ کے فاصلہ تک کے لوگ آپ کے رعب سے لرزتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی یہ ذکر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ [۶۲] فرمایا وہ خدا ہی ہے جس نے اہل کتاب کے کفار کو اُن کے گھروں سے نکالا۔ تمہیں گمان تک نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے قلعے ہمیں بچا لیں گے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُعب نے اُن کو تباہ کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو تباہ کرنے لگے اور وہ بھاگ گئے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طاقت عطا کی کہ جہاں دشمن کے مقابلہ کے لئے جاتے لوگ آپؐ کے رُعب سے لرز جاتے۔

ساتویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ ''اُس نے نگاہ کی اور قوموں کو پراگندہ کر دیا۔'' اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں اُس پر چڑھ آئیں گی لیکن جب وہ مقابلہ کرے گا تو بھاگ جائیں گی۔ جنگ احزاب کے موقعہ پر ایسا ہی ہوا جس کے متعلق سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ [۶۳] میں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ قومیں جمع ہو کر حملہ کریں گی پھر بھاگ جائیں گی۔

آٹھویں پیشگوئی یہ کی گئی کہ ''قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے اور پُرانی پہاڑیاں اُس کے آگے دھنس گئیں۔'' پہاڑ سے مراد بڑے بڑے آدمی، بادشاہ اور حکمران ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقابلہ میں جب قیصر و کسریٰ آئے تو کس طرح اُن کا نام ونشان مٹ گیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ۔ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ۔ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا۔ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا۔ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ [۶۴] کہ ہم اسلام کی ترقی کے متعلق جن باتوں کی خبریں دے رہے ہیں وہ ہو کر رہیں گی۔ کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔ جب آسمان لرزہ کھا کر پھٹ جائے گا اور پہاڑ اپنی پوری رفتار کے ساتھ چلیں گے۔ اس دن جھٹلانے والوں پر خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ گویا قرآن بھی اس پیشگوئی کی تائید کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے لوگوں کو بھی حبقوق نبی کی اس پیشگوئی کا خیال تھا کیونکہ قرآن کریم میں قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ○ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ○ [۶۵] کہ ہم نے تمہیں یہ قرآن دیا ہے جو اس کا انکار کرے گا قیامت کے دن سزا پائے گا۔ اس کے بعد فرماتا ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ○ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ○ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ○ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ○ [۶۶] یعنی کہتے ہیں کہ پہاڑوں کا کیا حال ہوگا تو کہہ دے کہ میرا رب اِن کو اُکھیڑ کر پھینک دے گا اور ان کو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت میں چھوڑ دے گا کہ نہ تو اس میں کوئی موڑ دیکھے گا اور نہ کوئی اونچائی۔ اُس دن لوگ سچے امام کے پیچھے چل پڑیں گے۔ جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہ ہوگی

اور آوازیں خدائے رحمان کے لئے دب جائیں گی۔ یعنی ادب والی آواز کے سوا تم کوئی اور آواز نہ سنو گے۔

مفسّرین کہتے ہیں ان آیات کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ اُڑائے جائیں گے مگر یہاں پہلے قیامت کا ذکر آچکا ہے جس میں بتایا ہے کہ اُس وقت زمین و آسمان نہ رہیں گے اور جب زمین و آسمان نہ رہیں گے تو پھر پہاڑوں کے علیحدہ ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اِس کا مطلب یہی ہے کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ اسلامی حکومت قائم ہوگی تو اُس کے متعلق سوال کیا گیا کہ یہ اتنی بڑی بڑی موجودہ حکومتیں کہاں جائیں گی۔ اس کے جواب میں بتایا کہ تباہ ہو جائیں گی۔ پھر یَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ بھی بتاتا ہے کہ یہاں مراد اگلا جہان نہیں کیونکہ مومن تو اس جہان میں بھی ایسے داعی کے پیچھے ہوتے ہیں اور کافروں کے متعلق آتا ہے کہ وہ آخرت میں ساتھ جانا چاہیں گے تو انہیں واپس کر دیا جائے گا اور پھر فرمایا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ [12] کہ جو اس دنیا میں اندھا ہے۔ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ اُس وقت کفار کہاں ایمان لائیں گے وہ تو وہاں بھی گمراہ ہی ہوں گے۔ پھر داعی کے پیچھے کیونکر چلیں گے۔ پس مراد یہی ہے کہ ان حکومتوں کو تباہ کر دیا جائے گا اور جو لوگ اِس وقت دشمن ہیں وہ ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ جب مکّہ فتح ہوا تو سارے دشمن ایمان لے آئے۔ پس جبال سے مراد بڑے آدمی اور سردارانِ قوم اور سلاطین ہیں کہ جن کے مارے جانے اور جن کے نظام کو توڑ دیئے جانے پر اسلام کی اشاعت مقدر تھی۔

نویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی کہ ”میں نے دیکھا کہ کوشان کے خیموں پر بپت تھی اور زمین مدیان کے پردے کانپ جاتے تھے۔“ عربی بائیبل میں بپت کی جگہ بلیہ یعنی مصیبت لکھا ہے اور پردے کانپ جاتے تھے کی جگہ انگریزی میں Did tremble کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کوشان کیا ہے۔ بائیبل والے کہتے ہیں کہ کوشان کے معنے کوش میں رہنے والا قبیلہ ہے جو عراق عرب کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ بائیبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ نمرود کے باپ کا نام کوش تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ کوش قبیلہ کے لوگ چھ سو سال تک عراق پر حکومت کرتے رہے۔ مدیان شمالی عرب کا ساحل سمندر کے پاس کا ایک شہر ہے جو مصر سے شام یا عرب کو جاتے ہوئے

راستہ میں پڑتا ہے۔ قرآن کریم میں اُسے مدین کہا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ حکومت قیصر میں شامل تھا اور شام کے صوبہ کے نیچے تھا۔ ان دونوں ملکوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حملہ ہوا اور دونوں حکومتوں کو تباہ کر کے اسلامی حکومت قائم کر دی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتح درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی فتح تھی کیونکہ آپ نے فرمایا قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں مجھے دی گئی ہیں اور جنگ احزاب کے موقع کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک پتھر نہیں ٹوٹتا تھا صحابہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آ کر عرض کیا کہ ایک پتھر نہیں ٹوٹتا۔ آپؐ تشریف لائے۔ فَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَۃً فَکَسَرَ ثُلُثَھَا وَقَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ الشَّامِ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَبْصَرُ قُصُوْرَھَا الْحُمْرَ السَّاعَۃَ ثُمَّ ضَرَبَ الثَّانِیَۃَ فَقَطَعَ الثُلُثَ الْاٰخِرَ فَقَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ فَارِسَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَبْصَرُ قَصْرَ الْمَدَائِنِ الْاَبْیَضَ ثُمَّ ضَرَبَ الثَّالِثَۃَ وَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ فَقَطَعَ بَقِیَّۃَ الْحَجَرِ فَقَالَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ الْیَمَنِ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَبْصَرُ اَبْوَابَ صَنْعَاءِ مِنْ مَکَانِیْ ھٰذَا السَّاعَۃَ [۶۸] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر کُدال اپنے ہاتھ میں لی اور اُسے زور سے پتھر پر مارا تو اس میں سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور پتھر کا تیسرا حصہ ٹوٹ گیا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ مجھے حکومت شام کی کنجیاں دے دی گئی ہیں اور خدا کی قسم مَیں اُس کے سُرخ محلات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ پھر دوسری دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کُدال کو پتھر پر مارا تو پھر اُس میں سے ایک شعلہ نکلا اور پتھر کا ایک اور حصہ ٹوٹ گیا۔ اِس پر پھر آپؐ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ مجھے ایران کی کنجیاں بھی دے دی گئی ہیں اور خدا کی قسم میں مدائن کے سفید محلات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ پھر آپ نے تیسری دفعہ کُدال ماری جس سے پھر اُس میں سے ایک شعلہ نکلا اور باقی پتھر بھی ٹوٹ گیا۔ اس پر آپ نے پھر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ مجھے یمن کی کنجیاں بھی دے دی گئی ہیں اور خدا کی قسم مَیں صنعاء کے دروازے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

غرض حبقوق نبی کی پیشگوئی میں یہ خبر دی گئی تھی کہ آنے والا شام، عراق اور مدائن کو فتح کر لے گا۔ قرآن کریم بھی اِن جنگوں کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے: قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ

الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ تُقَاتِلُوۡنَہُمۡ اَوۡ یُسۡلِمُوۡنَ ۚ فَاِنۡ تُطِیۡعُوۡا یُؤۡتِکُمُ اللّٰہُ اَجۡرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا کَمَا تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا۔[۶۹] یعنی اعراب میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑے گئے ہیں تو اُن سے کہہ دے کہ تم ضرور ایک ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لئے بلائے جاؤ گے جو فنون جنگ میں بڑی ماہر ہے اور تم اُن سے اُس وقت تک جنگ جاری رکھو گے جب تک کہ وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور نہ ہو جائیں اور مسلمان نہ ہو جائیں۔ پس اگر تم اُس وقت خدا کی آواز پر لبیک کہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بڑا اچھا اجر دے گا اور اگر تم اس حکم سے روگردانی اختیار کرو گے جس طرح تم نے اِس سے پہلے روگردانی کی تھی تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک عذاب دے گا۔

اس آیت میں یہ خبر دی گئی تھی کہ اَب عرب کی جنگ تو ختم ہوئی اب باہر سے اَور قومیں آئیں گی جو اِن سے بھی زیادہ لڑنے والی ہونگی اور اُن سے تمہارا مقابلہ ہوگا مگر اِن جنگوں کا بھی آخری نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ عرب سے باہر بھی جنگیں ہونی ضروری تھیں۔ چنانچہ قیصر و کسریٰ کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگیں ہوئیں اور خدا تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ بخشا۔

دسویں پیشگوئی یہ بیان کی گئی ہے کہ ''سورج اور چاند اپنے اپنے مکان میں ٹھہر گئے۔ تیرے تیروں کی روشنی کے باعث جو اُڑے اور تیرے بھالے کی چمکاہٹ کے سبب۔ تو قہر کے ساتھ زمین پر کوچ کرے گا۔ تو نے نہایت غصے ہو کر قوموں کو روند ڈالا ہے۔''

سورج اور چاند کا ٹھہر جانا یہ محاورہ ہے رُوحانی اور جسمانی سلسلوں کے نظام کے ٹوٹ جانے کا۔ سورج دنیوی اور چاند رُوحانی سلسلوں کا نشان ہے۔ جب خیبر فتح ہوا اور حضرت صفیہؓ کی شادی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا مجھے پہلے ہی بتایا گیا تھا کہ میری شادی آپؐ سے ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا۔ کس طرح؟ انہوں نے کہا مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ چاند میری گود میں آ گرا ہے۔ اِس کا ذکر مَیں نے اپنے باپ سے کیا تو اُس نے مجھے تھپڑ مارا اَور کہا تو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔[۷۰] پس چاند سے مراد مذہبی حکومت ہے اور سورج سے مراد دنیوی حکومت۔ مطلب یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم سے پہلے کے رُوحانی اور جسمانی دونوں نظام ٹوٹ جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دونوں سابقہ نظام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد ٹوٹ گئے۔ رُوحانی طور پر سب فیض آپؐ کے سلسلہ کے بعد بند ہو گئے اور جسمانی طور پر آپؐ کے اتباع نے سب حکومتوں کو خواہ کسی ملک کی تھیں تباہ کر دیا اور دنیا کا نظام ہی بدل ڈالا۔ بائیبل کی اگلی آیت اِس کی تفسیر ہے۔

گیارہویں پیشگوئی یہ کی گئی ہے کہ ''تو اپنی قوم کو رہائی دینے کے لئے ہاں اپنی ممسوح کو رہائی دینے کے لئے نکل چلا۔ تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا۔ وہ مجھے پراگندہ کرنے کے لئے آندھی کی طرح نکل آئے۔ اُن کا فخر یہ تھا کہ مسکینوں کو ہم چپکے نگل جائیں۔''

اِس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ وہ موعود جنگ کے لئے نکلے گا تا کہ اپنی کمزور قوم کو ظالموں سے رہائی دلائے اور اِس میں یہ بھی بتایا کہ دشمن بھی جنگ کے لئے نکلے گا کیونکہ لکھا ہے کہ ''وہ پراگندہ کرنے کے لئے آندھی کی طرح نکل آئے۔'' گویا اِدھر سے یہ اور اُدھر سے وہ نکلیں گے اور دونوں کی مٹھ بھیڑ ہو گی۔ دشمن چاہے گا کہ غریب اور کمزور قوم کو دھوکا سے تباہ کر دے مگر وہ خود تباہ ہو گا اور موعود کامیاب ہو گا۔

اب دیکھو کتنی تفصیل سے اِس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اور بدر کی جنگ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مکّہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقابلہ کے لئے عتبہؔ کی کمان میں نکلے۔ ابوجہل سیکنڈ اِن کمان تھا۔ جب عتبہؔ مارا گیا۔ تو ابوجہل نے کمان سنبھال لی۔ غرض مکّہ والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ماننے والوں کو تباہ کرنے کے لئے نکلے۔ اِدھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب اُن کے ارادہ کا علم ہوا تو آپ بھی نکلے تا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کر کے مدینہ کو تباہ نہ کر سکے۔ قرآن کریم میں اِس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ [1] فرمایا۔ اے مسلمانو! اللہ کے رستہ میں لڑائی کرنے میں تمہیں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جبکہ کچھ کمزور مرد، عورتیں اور بچے ہم سے دُعائیں کر رہے

ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس ظالم بستی سے نکال اور ہماری امداد کے لئے کسی کو کھڑا کر۔ آگے فرماتا ہے۔ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۔ [۲۲] یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تُو نکل کھڑا ہو۔ کوئی اور جائے یا نہ جائے تو چل۔ ہاں مسلمانوں کو تحریص دلا اگر وہ شامل ہو جائیں تو ثواب کے مستحق ہونگے۔ نہیں تو عذاب کے مگر تو ضرور چل۔

اِس پیشگوئی میں یہ بھی ذکر تھا کہ وہ فخر سے نکلے اور چوری چُھپے کمزوروں پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ [۲۳] یعنی اے مسلمانو! بدر کے موقعہ پر نکلنے والے کفّار کی طرح نہ بنو۔ جو اِتراتے ہوئے نکلے تھے۔ پھر وہ ظاہر کچھ دکھاتے تھے اور اندر سے اُن کی نیت اَور تھی۔ ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ ایک قافلہ کو بچانے چلے ہیں مگر اُن کی نیت مدینہ منوّرہ کو تباہ کرنے کی تھی۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ قافلہ کو لوٹنے کے لئے نکلے تھے اگر یہی بات تھی اور کفار اِس قافلہ کو بچانے چلے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ وہ تکبّر کرتے نکلے اور پھر یہ کہ کہتے کچھ تھے اور اُن کا اندرونی منشاء کچھ اَور تھا۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں۔ بھلا قافلہ کو بچانے سے اسلام کو کیا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ بائیبل کہتی ہے کہ دشمن چوری سے نکلے اور اُن کی غرض یہ تھی کہ چُپکے سے اس قوم کو جو کمزور تھی تباہ کر دیں اور قرآن بھی اُن کی غرض يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بیان کر کے بائیبل کی تصدیق کرتا ہے لیکن مؤرخ کہتے ہیں کہ کفار صرف اپنے ایک قافلہ کو بچانے کی غرض سے نکلے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ کو لوٹنے کے لئے آئے تھے۔ بائیبل اور قرآن دونوں کا بیان ایک ہے اور مؤرخ جو کچھ کہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ کفّار نے قافلہ کو بچانے کا صرف بہانہ بنایا تھا۔ اِن کی غرض مدینہ پر حملہ کرنا تھی تا کہ مسلمانوں کو تباہ کر دیں۔

ابوجہل کے قتل کئے جانے کی پیشگوئی جو بڑی شان سے پوری ہوئی

بارہویں پیشگوئی۔ اب اِس پیشگوئی کے درمیان کے دو فقرے جنہیں مَیں نے چھوڑ دیا تھا اُن کا ذکر کرتا ہوں اور وہ یہ ہیں۔ ”تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُس کے بھالوں سے مار ڈالا۔“

اِس پیشگوئی میں اِس قدر استعارہ استعمال کیا گیا ہے کہ بظاہر مضمون کا سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہم غور کریں تو معنے کھل جاتے ہیں۔ یہ تو صاف بات ہے کہ بنیاد کی گردن کوئی نہیں ہوتی۔ نہ شریر کے گھر کا سر کوئی ہے۔ پس اس کے کوئی اَور معنے کرنے ہوں گے۔ سو ہم دوسرے حصّہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اس کی تشریح موجود ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے سر سے مراد گھرانہ کا سردار ہے۔ جب یہ حل ہو گیا تو اب بنیاد کی گردن کو ننگا کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اِس نقطۂ نگاہ سے جب اس پیشگوئی پر غور کیا جائے تو ہمیں اس کا پہلا فقرہ یہ نظر آتا ہے کہ ”بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔“ اب دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد کو گردن تک ننگا کرنے کے کیا معنی ہیں۔ بائبل والے کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ بنیاد تک ننگا کر دے مگر جب بنیاد کا لفظ موجود تھا تو پھر گردن تک کہنے کے کیا معنے اور بنیاد کی گردن کا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ جب گردن کا ذکر ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ کسی انسان کے متعلق ہے اور بنیاد عام محاورہ میں اس نیچے کی چیز کو کہتے ہیں جس پر کوئی چیز رکھی ہو۔ انگریزی میں Base عمارت کی بنیاد کو بھی کہتے ہیں اور سر کی جڑ کو بھی کہتے ہیں جہاں سر گردن سے ملتا ہے۔ عبرانی میں Base کا لفظ ہی ہے۔ پس سر کا نچلا حصّہ چونکہ گردن پر رکھا ہوتا ہے اس لئے وہ بنیاد ہے اور مطلب یہ ہے کہ گردن تک نچلے حصّہ کو ننگا کیا جائے گا۔ پھر شریر کے گھر کے سر سے مراد گھرانہ کا سردار ہے کیونکہ شریر کے گھر کا سر کوئی اَور چیز نہیں ہوتی پس اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دشمن کے قبیلہ کے سردار کے سر کو گردن تک ننگا کرے گا اور پھر اُسے جڑ سے کاٹ دے گا۔ اِن معنوں کی اگلے فقرہ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ آگے آتا ہے۔ ”تُو نے اُس کے سرداروں میں سے جو عالی درجہ کا تھا اس کے بھالوں سے مار ڈالا۔“ اس فقرہ سے معلوم ہوا کہ پہلے فقرہ میں کسی دشمن کے قتل کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ پس بنیاد کو گردن تک ننگا کرنے کے معنے یقیناً

سر کو گدی تک ننگا کرنے کے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ جب وہ نبی کمزوروں کو بچانے کے لئے ایک طرف سے نکلا اور دوسری طرف سے اس کے دشمن غریبوں کو مسل ڈالنے کے خیال پر فخر کرتے ہوئے نکلے تو آپس میں جنگ ہوئی اور اس جنگ میں جو دشمنوں کا سردار تھا اُسے اُس نبی یا اس کے کسی تابع نے گردن تک ننگا کر کے اُسی کے ہتھیار سے مار ڈالا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا بدر کی جنگ میں جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ کسی سردار کے سر کو اُس کی گردن ننگی کر کے گدی سے کاٹ دیا گیا ہو۔ جب ہم بدر کی جنگ کا حال پڑھتے ہیں تو ہمیں لفظ بلفظ ایسا ہی ایک واقعہ ملتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے جب جنگ شروع ہوئی اور صحابہ مقابل پر کھڑے ہوئے تو اُن میں دو کم سن لڑکے بھی تھے۔ یہ جنگی قاعدہ ہے کہ بہادر لڑنے والے اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ اُن کے دائیں بائیں بھی بہادر ہوں تا کہ وہ پوری بے فکری سے جنگ میں نمایاں حصہ لے سکیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ ہمارے دل کفار کی تکالیف سے بھرے ہوئے تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ آج ان سے خوب بدلہ لیں گے مگر جب مَیں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ دو لڑکے کھڑے ہیں تو میرا دل بیٹھ گیا کہ آج کیا لڑنا ہے جبکہ دونوں پہلو اتنے کمزور ہیں لیکن ابھی یہ خیال میرے دل میں آیا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے مجھے کہنی ماری اور میرے کان میں آہستہ سے تا کہ دوسرا لڑکا نہ سُن لے، کہا چچا سُنا ہے ابو جہل بڑا شریر ہے مسلمانوں کو بہت دُکھ دیتا ہے وہ کونسا ہے۔ مَیں اُسے مارنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں باوجود اس بہادری کے جو مَیں رکھتا تھا مجھے یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ مَیں ابو جہل کو ماروں لیکن ابھی وہ لڑکا مجھ سے بات کر ہی رہا تھا کہ دوسرے نے مجھے کہنی ماری اور چپکے سے پوچھا چچا وہ ابو جہل کون ہے جو مسلمانوں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں اُسے ماروں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ مَیں ان کی بات سُن کر سخت حیران ہوا۔ ابھی تھوڑی سی جنگ ہوئی تھی کہ عتبہ مارا گیا اور ابو جہل کمانڈر بنا تھا۔ مَیں نے انگلی کے اشارے سے بتایا وہ ابو جہل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا اشارہ کرنا تھا کہ دونوں لڑکے چیل کی طرح جھپٹا مار کر پہرہ میں سے گذرتے ہوئے اُس پر جا پڑے اور اُسے گرا دیا۔ پہرہ کے سپاہیوں نے اُن پر حملہ کیا اور ایک کا ہاتھ کاٹ دیا۔ جو تسمہ سے لٹک رہا تھا۔ اُس نے اُس پر پاؤں رکھ کر اُسے علیحدہ کر دیا تا کہ لڑائی میں حارج نہ ہو۔

ابو جہل گر گیا تھا اور اُسے زخم آئے تھے مگر مرا نہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پوچھا کہ ابو جہل کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تو عبداللہ بن مسعودؓ اس کا پتہ لگانے کے لئے نکلے۔ جب وہ گئے تو دیکھا کہ ابو جہل گرا پڑا ہے۔ انہوں نے اُسے کہا اے دشمنِ خدا! آج بھی تو ذلیل ہوا ہے یا نہیں۔ اُس نے جواب دیا ایک سردارِ قوم کو اِس کی قوم مار دے تو اِس میں کیا ذلّت ہے۔ انہوں نے اس پر حملہ کیا لیکن چونکہ اُن کی تلوار چھوٹی تھی اور اُس کے پاس بھی تلوار تھی۔ اس لئے کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر اُس کے ہاتھ پر اُن کی تلوار لگی اور اُس کی تلوار گر گئی۔ انہوں نے اُس کی تلوار اُٹھالی اور اُسے مارنے لگے۔ اُس نے کہا دیکھ مَیں سردارِ قوم ہوں۔ میری گردن لمبی کر کے کاٹنا۔ تا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے دیکھ کر ڈرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس سے اَور زیادہ غصّہ آیا۔ انہوں نے پیچھے سے ہو کر اُس کی گردن پکڑ لی اور اُس کا خود اُٹھا کر سر کے عین نیچے سے اُس کی گردن کو ننگا کیا اور اُسی کی تلوار سے اُس کا سر کاٹ دیا[۵] اور اِس طرح اُس کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی اور حبقوق نبی کی یہ پیشگوئی کہ تو بنیاد کو گردن تک ننگا کر کے شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ ''تُو نے اُس کے سرداروں میں سے اُسے جو عالی درجہ کا تھا اُسی کے بھالوں سے مار ڈالا۔'' لفظاً لفظاً پوری ہوئی۔

اب دو سوال باقی رہتے ہیں۔ ایک یہ کہ پیشگوئی میں ہے کہ تُو نے دشمن کو مارا لیکن مارا عبداللہ بن مسعودؓ نے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کے متبع کا کام درحقیقت رسول کا ہی ہوتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ پیشگوئی میں بھالا آیا ہے مگر عبداللہ بن مسعودؓ نے تلوار سے مارا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُردو بائیبل میں بھالا لکھا ہے۔ انگریزی میں ٹیڑھی لکڑی۔ فارسی میں سونٹا اور عربی میں تیر۔ اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبرانی لفظ کے معنے نہ بھالا ہیں۔ نہ تیر۔ نہ سونٹا بلکہ ہتھیار کے ہیں جس کا ترجمہ مختلف مترجموں نے مختلف کر دیا ہے۔ یہ میرا خیال ہی نہیں بائیبل کا ایک مفسّر بھی تفسیر بائیبل میں لکھتا ہے:۔

This were better translated thou didst smite through with his own weapons the head of his chieftains.[۶]

یعنی صحیح مطلب یہ ہے کہ اُسی کے ہتھیار سے اس کی گردن کاٹ دی۔

تیرھویں پیشگوئی یہ تھی کہ ''ہر چند کہ انجیر کا درخت نہ پھولے۔ تُس پر بھی مَیں خداوند کی یاد میں خوشی کرونگا۔'' اس میں بتایا کہ یہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ بنی اسرائیل کی مثال بائیبل میں انجیر سے دی گئی ہے۔ چنانچہ انجیل میں آتا ہے کہ مسیح نے ایک انجیر کے درخت پر لعنت کی کہ اُسے پھل نہ لگیں۔ [۸۷] اور اِس کی تفسیر مسیحی مفسر یہی کرتے ہیں کہ یہودی قوم کا خدا سے تعلق کٹ جائے۔ پس اس کا مطلب یہ ہے کہ حبقوق نبی کہتا ہے کہ گو یہود جن میں سے وہ خود ہے تباہ ہو جائیں گے لیکن پھر بھی مجھے اُس نبی کے ذریعہ خدا کے نام کا روشن ہونا اپنی قوم ترقی سے زیادہ پسند ہے اور مَیں اپنی قومی تباہی کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والے جلال کی وجہ سے بخوشی برداشت کرلونگا۔

حضرت مسیح ناصریؑ کی پیشگوئی

اس کے بعد ہم کچھ اور صدیاں پیچھے چلتے ہیں جب کہ حضرت مسیح ناصری کا زمانہ آتا ہے۔ وہ انگورستان کی تمثیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

''پس جب باغ کا مالک آئے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کرے گا۔ انہوں نے اُس سے کہا ان بُرے آدمیوں کو بُری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکہ اور باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اُس کو پھل دیں۔ یسوع نے اُن سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رڈ کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے مَیں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا۔'' [۸۸]

دوسری جگہ حضرت مسیح فرماتے ہیں:-

''مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر مَیں نہ

جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ مَیں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اَور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا رُوح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اِس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اِس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔"[۹۷]

اِن پیشگوئیوں میں حضرت مسیحؑ نے مندرجہ ذیل باتیں بتائی ہیں:۔

اوّل یہ کہ ایک مثیلِ موسیٰؑ آئے گا کیونکہ خدا تعالیٰ کا آنا ایک شرعی نبی کے آنے پر جو مثیل موسیٰؑ ہو دلالت کرتا ہے۔ (۲) یہ کہ وہ بنی اسرائیل سے نہ ہوگا۔ (۳) یہ کہ اُس کی قوم میں ہمیشہ برگزیدہ لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو قوم کی ہدایت کا موجب ہوں گے۔ (۴) یہ کہ وہ موعود کونے کا پتھر ہوگا۔ یعنی اُس پر سب شریعتیں ختم ہو جائیں گی۔ (۵) یہ کہ اُس کا مقابلہ دوسری اقوام سے ہوگا لیکن خواہ اُس پر کوئی حملہ کرے یا وہ کسی پر حملہ کرے دونوں صورتوں میں وہ کامیاب رہے گا۔ (۶) یہ کہ وہ تسلی دینے والا ہوگا۔ (۷) یہ کہ وہ دنیا کو تین چیزوں سے تقصیروار ٹھہرائے گا۔ گناہ سے یعنی بوجہ مسیح کو نہ ماننے کے گناہ کے۔ وہ لوگوں پر الزام لگائے گا۔ یہاں گناہ محدود معنوں میں لیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ ایک قوم کو مسیح کے انکار کی وجہ سے اور دوسری کو راستی سے یعنی مسیح کو چھوڑ بیٹھنے کی وجہ سے اور تیسری کو عدالت سے یعنی اس وجہ سے کہ وہ لوگ شیطان سے تعلق رکھتے ہوں گے قصوروار ٹھہرائے گا۔ گویا یہود انکارِ مسیح، نصاریٰ غلوّ در مسیح اور دیگر اقوام شیطانی تعلقات کی وجہ سے مجرم قرار دی جائیں گی اور سب ہی دنیا اس کے آنے پر مجرم قرار پائے گی۔ (۸) یہ کہ وہ ایسی باتیں کہے گا جو اُس سے پہلے نہ کہی گئی ہونگی۔ (۹) یہ کہ وہ سب سچائیاں بتائے گا جن کے بعد کسی اور سچائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ (۱۰) یہ کہ اُس کی کتاب میں صرف خدا کا کلام ہوگا اور وہ آئندہ کے لئے

بھی رُوحانی ترقی کا رستہ کھلا رکھے گی۔ (۱۱) یہ کہ وہ کتاب مسیح کو عیب سے مبرّا کرے گی۔ (۱۲) یہ کہ مسیح کے راستباز ہونے کا عملی ثبوت دے گی۔ یعنی اس کے کلام کو پورا کر کے اُس کے باخدا ہونے کا ثبوت پیش کرے گی۔

یہ ساری کی ساری باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہایت شان سے پوری ہوئیں۔ اوّل آپؐ مثیلِ موسیٰؑ تھے اور آپؐ نے دعویٰ کیا کہ آپؐ میں خدا ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ [۸۰] یعنی وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری نہیں بلکہ خدا کی بیعت کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ موعود بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں سے نہ تھے بلکہ بنی اسمٰعیل میں سے تھے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپ کی قوم کی ہدایت کے سامان ہمیشہ ہوتے رہیں گے چنانچہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس رسول کو ایک دوسری قوم میں بھی بھیجے گا جو ابھی تک اِن سے ملی نہیں اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

پھر حدیثوں میں آتا ہے حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُلَهَا دِيْنَهَا [۸۱] یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر اس اُمّت میں تجدیدِ دین کے لئے اپنے پاک بندوں کو کھڑا کرتا رہے گا۔

چوتھی بات یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ موعود کونے کا پتھر ہوگا۔ جسے سب معماروں نے رڈ کر دیا۔ یہ اِس لحاظ سے بھی درست ہے کہ بنی اسرائیل ہمیشہ بنی اسمٰعیل کو محروم الارث قرار دیتے رہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دعویٰ کیا ہے کہ آپ کونے کا پتھر ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ مَثَلِيْ وَ مَثَلَ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَ اَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ لَهٗ وَيَتَعَجَّبُوْنَ لَهٗ وَيَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ [۸۲] فرمایا۔ میری اور پہلے انبیاء کی مثال ایک ایسے مکان کی سی ہے جسے ایک شخص نے بنایا

اور اُسے خوب سجایا مگر اس کے ایک کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی۔ لوگ آتے اور اس مکان کو دیکھنے کے لئے اُس کا چکر کاٹتے اور تعجب سے کہتے یہاں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے؟ مَیں وہ کونے کی اینٹ ہوں جس سے اس مکان کی تکمیل ہوئی اور خاتم النّبیین ہوں۔

کونے کے پتھر کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں کہ وہ دو دیواروں کو آپس میں ملاتا ہے اور دیوار کے معنے قرآن میں روحانی سلسلہ کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیوار کی مثال بنی اسرائیل سے دی ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ ان دو دیواروں سے کیا مراد ہے جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کونہ کا پتھر بن کر ملایا۔ سو ایک دیوار تو پہلے انبیاء کی تھی جو مختلف شریعتوں کے تابع تھے اور ایک دیوار قرآن کی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں کے اتصال کا ذریعہ ہیں کیونکہ آپؐ ہی کے ذریعہ آپؐ کی اُمت پہلے انبیاء کو مانتی ہے اور آپؐ ہی کے ذریعہ سے آئندہ آنے والے مامور پہلے نبیوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ دیکھ لو دوسری قوموں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کا تمام اقوام سے تعلق قائم ہے۔ ہندوؤں کے سوا اور کسی قوم کا حضرت کرشن سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مسلمانوں کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے اُن سے بھی ہے کیونکہ قرآن میں آیا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [۵۳] اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ہر قوم میں نبی آئے تو ہمیں کیا علم تھا کہ کرشن جی بھی خدا کی طرف سے تھے۔ پھر دیکھو یہود کو زرتشتی قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک علیحدہ دیوار کھڑی ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کی ہر دیوار کو ملا دیا۔ زرتشت کی ساختہ دیوار سے اسلامی دیوار وابستہ ہے اور دوسرے انبیاء کی دیواروں سے بھی اسلامی دیوار وابستہ ہے۔ پس کونے کے پتھر کے معنے یہ ہیں کہ آپؐ آئندہ آنے والے لوگوں اور پچھلی قوموں میں واسطہ پیدا کردیں گے پہلی دیواریں الگ الگ کھڑی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دیوار علیحدہ تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کی علیحدہ۔ حضرت کرشنؑ کی علیحدہ مگر محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر دیوار میں کونے کا پتھر بن گئے اور آپؐ نے سب کو یہ کہہ کر ملا دیا کہ سب نبی خدا کی طرف سے ہیں اور سب کا ایک ہی سلسلہ ہے۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپ کا مقابلہ سب دنیا سے ہوگا۔ آپؐ پر حملے کئے جائیں گے

اور آپ بھی حملے کریں گے مگر دونوں صورتوں میں وہ نبی ہی جیتے گا۔ اس میں یہ نہیں کہا کہ وہ جیتے گا بلکہ یہ کہا اگر یہ حملہ کرے گا تو بھی جیتے گا اور اگر دشمن تیار ہو کر حملہ کریں گے تو بھی یہی جیتے گا۔ چنانچہ جنگ احزاب۔ اُحد اور بدر میں دشمن چڑھ کر آ گیا مگر ان میں بھی دشمن ہی کچلا گیا اور فتح مکہ۔ خیبر اور تبوک کی جنگ میں آپ گئے اور اُن میں بھی دشمن کچلا گیا۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی تھی کہ آپ تسلی دینے والے ہونگے۔ اس کے متعلق یہ دیکھنا چاہئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا کو تسلی کی ضرورت تھی یا نہیں؟ اگر ضرورت تھی تو کیا ان اقوام کو اُن کے مذاہب تسلی دے سکتے تھے؟ سو اس بارے میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذاہب اپنے ماننے والوں کے لئے تسلی کا باعث نہ رہے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو سب مذاہب اِس سے خالی تھے اور قلبی اطمینان ان میں سے کسی کو حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کوئی قوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل گناہ کی معافی کی قائل نہ تھی۔ ہندو کہتے کہ پرمیشور کسی کا کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ کی سزا دیتا ہے اور انسان کو مختلف جونوں میں جانا پڑتا ہے اور سارے گناہوں کی سزا جونوں میں پڑ کر بھگت لینے کے بعد بھی پرمیشور ایک نہ ایک گناہ رکھ لیتا ہے اور پھر اس کی پاداش میں نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ اِس وجہ سے ہندو اپنے مذہب کے ذریعہ تسلی نہ پا سکتے تھے۔ زرتشتی اور مسیحی ابدی دوزخ کے قائل تھے۔ اِس عقیدہ کے ماتحت جس انسان سے ایک دفعہ بھی کوئی گناہ ہو جائے وہ یہی سمجھتا تھا کہ ابدی دوزخ میں جانا پڑے گا اور اس وجہ سے وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ یہود بھی کسی کو تسلی نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نجات صرف یہود کے لئے ہے باقی سب کے لئے ہلاکت ہے۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی امید کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ کوئی مذہب ابتداء میں ہی ناامیدی کے گڑھے میں گرا دیتا۔ کوئی درمیان میں لاکر منجدھار میں چھوڑ دیتا۔ کوئی آخر میں ابدی دوزخ میں جھونک دیتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر سب کو تسلی دلائی۔ (۱) جو گناہ کی معافی کے قائل نہ تھے، انہیں بتایا کہ تناسخ کے چکّر کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ بڑا رحیم کریم ہے۔ وہ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ

اِنَّہٗ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ۔ [۵۴] یعنی اے رسول! تُو سب بندوں کو کہہ دے کہ مجھے خدا نے تسلی دینے والا بنایا ہے۔ اس لئے وہ لوگ جنہوں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ انہیں خبر دے دے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ توبہ کرو تو وہ گناہ بخش دے گا۔ کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

(۲) پھر اُس نے اُن قوموں کی طرف مونہہ کیا جو کہتی ہیں کہ جو گناہگار مر گئے۔ اُن کے لئے ہمیشہ کا جہنم ہے اور سنایا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے چنانچہ سورہ اعراف: ۱۵۷ میں آتا ہے۔ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ پھر فرمایا۔ اُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ [۵۵] یعنی جہنم ماں کی طرح ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ہمیشہ نہیں رہتا جب تک ناقص ہوتا ہے پیٹ میں رہتا ہے اور جب کامل ہو جاتا ہے پیٹ سے نکال دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ جہنم ماں کی طرح ہے۔ جب ان لوگوں کے گند دُور ہو جائیں گے جن کو اس میں ڈالا جائے گا اور اُن کی صفائی ہو جائے گی تو ہم اُن کو جنّت میں بُلالیں گے۔ پس دوزخ صرف ایک تکمیل اور علاج کا مقام ہے۔ آخر سب خدا تعالیٰ کی بخشش کے نیچے آجائیں گے۔ اِس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قوموں کو بھی تسلّی دی جو یہ سمجھتی تھیں کہ گناہگار رہونے کی حالت میں مرنے پر ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہنا پڑے گا۔

(۳) پھر وہ قومیں جو یہ کہتی تھیں کہ سوائے ہمارے اَور کسی کے لئے نجات نہیں اُن کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ لوگوں کو تسلّی دے دے کہ یہ غلط خیالات ہیں۔ جیسے یہود نے نادانی سے کہہ دیا کہ ہمارے سوا کوئی نجات نہیں پا سکتا اور نسلاً یہ نجات ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ ہدایت کسی ایک قوم سے مخصوص ہے۔ نجات ہم نے دینی ہے اور ہمارا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ قُلۡ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا یعنی تُو لوگوں سے کہہ دے کہ مَیں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ پس ہدایت کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم اس میں برابر کی حقدار ہے۔

اب انسان کے دل میں ایک اور خوف پیدا ہوتا ہے کہ اچھا آپؐ آگئے اور آپؐ کے ذریعہ سب کے لئے نجات کا دروازہ بھی کھل گیا جس کے لئے ہم بڑے ممنون ہیں مگر ہمیں اپنے باپ دادا سے محبت ہے اُن کی کیا حالت ہوگی۔ مسیحیت کہتی ہے کہ وہ جہنم میں جائیں گے کیونکہ وہ کفارہ پر

ایمان نہیں لائے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائیں گے کیونکہ سوائے یہود کے اور کسی کے لئے نجات نہیں۔ زرتشتی کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائیں گے ہندو بھی یہی کہتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خدا تعالیٰ کہتا ہے۔ کہہ دو وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ۔ تم اپنے باپ دادوں کے متعلق مت ڈرو۔ اُن کے وقت بھی ہم نے نبی بھیجے تھے اگر انہوں نے اُن انبیاء کو قبول کر لیا تھا تو خدا انہیں جنت میں لے جائے گا۔ یہ آباء کے متعلق اُن کو تسلی دی۔

اب یہ وسوسہ باقی رہتا تھا کہ انسان گناہ سے تو بچ ہی نہیں سکتا۔ پھر نجات کیسے ہوگی۔ اس کے لئے فرمایا۔ یہ وسوسہ بھی دُور کر دو اور اِن سے کہو لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۔ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ [46] اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو تسلی دے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ انسان کی فطرت گندی ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم نے انسان کو نیک فطرت دے کر بھیجا ہے۔ جب انسان خطا کرتا ہے تب ہم اُسے نچلے درجہ میں بھیجتے ہیں۔ ورنہ بڑے بڑے انعام دیتے ہیں۔ گناہ ایک باہر سے آنے والی چیز ہے۔ اصل میں انسان کے اندر نیکی ہی رکھی گئی ہے۔

غرض اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب کو تسلی دلائی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے لئے نجات کا دروازہ بند ہے انہیں خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نیک نہیں ہو سکتے انہیں نیکی کی اُمید دلائی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ایک دفعہ گناہ کر لیا تو پھر اس کے وبال سے نجات نہیں اُن میں توبہ کا اعلان کیا۔ جو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ گناہگار مر گئے تو ہمیشہ کے لئے گئے۔ انہیں دوزخ کے ایک درمیانی سٹیج ہونے کا علم دیا غرض آپ حقیقی معنوں میں دنیا کو تسلی دلانے والے تھے۔ یہ تو دوسروں کے متعلق فرمایا۔ اس کے بعد اپنے لوگوں کی باری آئی۔ اُن کی تسلی کے لئے خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد سنایا کہ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّیۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ [47] فرمایا۔ جب وہ رسول دنیا کو تسلی دے گا تو اس کی اُمت والے کہیں گے کہ یہ تو ہم پہلے ہی دن حاصل کر چکے ہیں۔ پھر ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا اُن سے مساکین کے لئے چندے لو اور اِس طرح ان کو پاک کرو اور اُن کی ترقی مدارج کے لئے دُعائیں کرو کہ جس

کے لئے تو دُعا کرتا ہے اُس کے لئے تسلّی ہی تسلّی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ تیری دُعا سنے کیونکہ وہ سمیع ہے اور اگر بعد میں آنے والی اُمّت کہے کہ ہمارے لئے کیا ہے تو ان سے کہو خدا علیم ہے۔ اب بھی تمہارے لئے وہ دُعا موجود ہے اور تم اس سے حصّہ لے سکتے ہو۔ اِس طرح اُن کے لئے بھی تسلّی کا سلسلہ جاری کر دیا۔

ساتویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ رسول دنیا کو تین طرح مجرم قرار دے گا۔ (۱) گناہ سے (۲) راستبازی سے (۳) عدالت سے۔ یعنی ایک قوم سے کہے گا کہ یہ مسیح کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس لئے مجرم ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ[۵۸] یعنی بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا اُن پر داؤدؑ اور عیسیٰ بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی تھی۔ اِسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں حضرت مسیح کا انکار کرنے والوں کو مغضوب قرار دے کر اُن سے پناہ مانگی گئی ہے۔ (۲) راستبازی سے اس طرح مجرم قرار دیا کہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد نصاریٰ نے انہیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ تم نے راستبازی تو اختیار کی یعنی مسیح کو قبول کیا لیکن پھر صحیح راستہ کو چھوڑ کر کہیں کے کہیں نکل گئے۔ اس لئے تمہارا نام ضالّ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ[۵۹] سے ظاہر ہے۔ (۳) باقی قوموں کو آپؐ نے عدالت سے مجرم قرار دیا یعنی اِس وجہ سے کہ وہ شرک کی مرتکب ہوئیں اور توحید کو جو عدل کا طریق تھا انہوں نے ترک کر دیا اِسی وجہ سے قرآن کریم میں شرک کا نام غیر عدل رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ[۹۰] ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اس طرح اندازہ نہیں کیا جس طرح کرنا چاہئے تھا۔ اِسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔[۹۱] وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ایمان کو ظلم سے نہیں ملایا۔ انہی لوگوں کے لئے امن مقدر ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ احادیث میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہر شخص تھوڑا بہت ظلم تو کر بیٹھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس جگہ ظلم سے مراد شرک ہے۔

غرض اس پیشگوئی کے مطابق ہر قوم جو اہل کتاب میں سے ہے آپؐ نے اُسے مثیلِ یہود قرار دے کر مغضوبؔ یا مثیلِ نصاریٰ قرار دے کر ضالؔ قرار دیا اور جو قومیں اہل کتاب نہ تھیں اُن کے متعلق عدالت کو اس رنگ میں استعمال کیا کہ فرمایا ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا اور شرک کا ارتکاب کر کے صحیح راستہ سے منحرف ہو گئی ہیں۔ گویا گناہؔ کا لفظ جو انجیل میں استعمال ہوا ہے وہ تفریط کے مترادف ہے۔ راستیؔ افراط کے مترادف اور عدالتؔ توحید سے بے اعتنائی کے مترادف ہے اور تین ہی گروہ قرآن کریم نے قرار دیئے ہیں۔

آٹھویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ایسی باتیں کہے گا جو اس سے پہلے نہیں کہی گئیں۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ [۹۳] تمہیں وہ وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو نہ تمہیں معلوم تھیں اور نہ تمہارے باپ دادا کو۔ اِن باپ دادا میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل ہیں۔

نویں بات یہ بات بتائی گئی تھی کہ وہ سب سچائیاں بتائے گا جن کے بعد کسی اور سچائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ بھی قرآن کریم میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ [۹۴] آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر پُورا کر دیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

دسویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ یعنی اس کا کلام کلّی طور پر الہام پر مشتمل ہوگا۔ یہ پیشگوئی صرف قرآن کریم پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ ورنہ انجیل اور تورات میں تو حواریوں کا کلام بھی درج ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:-

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ [۹۵] یعنی وہ اپنی ہوا و ہوس سے نہیں بولتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے۔ پھر آتا ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ [۹۶] مشرکین میں سے اگر کوئی کہے کہ مجھے پناہ دو، مَیں خدا کی باتیں سُننا چاہتا ہوں تو تم اُسے بلاؤ تا کہ وہ کلام اللہ سُن لے۔

گیارھویں بات یہ بتائی تھی کہ وہ میرا اجلال یعنی بزرگی ظاہر کرے گا۔ یہ بھی رسول کریم صلی

اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ سورہ بقرہ میں آتا ہے۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ[97] یعنی ہم نے عیسیٰ بن مریمؑ کو کھلے کھلے نشانات دیئے اور رُوح القدس کے ذریعہ اس کی تائید کی۔ پھر آتا ہے۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔[98] کہ ان لوگوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا اور نہ صلیب پر چڑھا کر مارا۔ ہاں صلیب پر چڑھایا ضرور تھا اور وہ اُن کے لئے مصلوب کے مشابہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ لوگ جو اس بات میں اختلاف کر رہے ہیں وہ یقیناً شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو اس بات کے متعلق کوئی یقینی علم نہیں وہ صرف ایک وہم کی پیروی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہرگز حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مارا بلکہ اللہ نے اُس کو اپنے حضور میں بڑی عزت اور رفعت بخشی تھی (گویا آپؐ نے حضرت عیسیٰؑ کی وہی بزرگی ظاہر کی جس کا پیشگوئی میں ذکر ہے) اور کیوں خدا ایسا نہ کرتا۔ وہ عزیز اور حکیم ہے۔ یعنی ضروری تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے منکرین صلیب پر لٹکاتے مگر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ صلیب پر فوت نہ ہوتے اس لئے کہ اللہ عزیز اور حکیم ہے۔ چونکہ وہ عزیز یعنی غالب ہے اس لئے ضروری تھا کہ یہود کو بتاتا کہ مَیں غالب ہوں۔ تم عیسیٰؑ کو جسے مَیں نے بھیجا ہے مار نہیں سکتے اور وہ حکیم ہے اِس لئے ضروری تھا کہ یہود حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکاتے تاکہ بعد میں جب عیسائی کہتے کہ مسیح خدا ہے تو مسلمان کہتے اچھا خدا ہے جسے یہود نے صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ پس فرمایا ہم غالب ہیں۔ ہمارا فرض تھا کہ عیسیٰؑ کو صلیب پر مرنے سے بچاتے اور ہم حکیم ہیں اس لئے ضروری تھا کہ صلیب پر چڑھاتے۔

بارھویں بات یہ بتائی کہ وہ مسیح کے راستباز ہونے کا عملی ثبوت دکھائے گا۔ یعنی مشاہدہ کرا دیگا۔ جو فوت ہو گیا اُسے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دکھا نہیں سکتے تھے۔ اُسے اِسی طرح دکھایا کہ فرمایا میری اُمت میں سے ایک سپہ سالار کھڑا ہو گا جس کا نام مسیح ہو گا اور اِس طرح عملاً مسیح کی راستبازی کو ثابت کر دیگا کیونکہ اتنے بڑے آدمی کو اس سے مشابہت دینا یہی معنے رکھتا ہے کہ مسیح بھی بزرگ اور برگزیدہ ہستی تھی۔ چنانچہ حضرت مرزا صاحبؑ جو مسیح موعود ہیں انہوں نے مسیح کی تصویر کھینچ کر دکھا دی۔

قانونِ شریعت اور قانونِ طبعی کی باہم مطابقت کا حیرت انگیز سلسلہ

اب دیکھو یہ نشان کتنا عظیم الشان ہے، کتنا لمبا سلسلہ چلتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام تک جو دو ہزار سال کا زمانہ ہے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ پھر حضرت مسیحؑ کے سلسلہ کے چھ سو سال کے عرصہ میں بھی تغیرات ہوتے ہیں اور آخر وہ انسان ظاہر ہوتا ہے جو اِن کا مصداق تھا اگر صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دعویٰ کرتے اور شریعت لے آتے تو لوگ کہتے یہ کلام آپؐ نے خود بنا لیا ہے مگر یہاں تو قانون شریعت اور قانون طبعی صدیوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر چل رہے ہیں اور ثابت ہو رہا ہے کہ ہمارا خدا آسمانوں کا ہی بادشاہ نہیں بلکہ زمین کا بھی بادشاہ ہے۔ قانون شریعت کہتا ہے کہ مکّہ میں ایک نبی آئے گا اور قانونِ طبعی اس کے لئے سامان مہیا کرتا ہے۔ تباہی اور ہلاکت کی آندھیاں چلتی ہیں۔ قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ وبائیں آتی ہیں اور قوموں کو ہلاک کر کے چلی جاتی ہیں۔ زمانہ کی گردشیں آتی ہیں اور قوموں کا نام و نشان مٹا دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر قریش ان تمام آفات سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ اُن کی تائید ہوتی ہے۔ ابرہہ مکّہ پر چڑھائی کرتا ہے اور کہتا ہے مکّہ اور اہل مکّہ کو میں تباہ و برباد کر دونگا مگر خود اس کا لشکر تباہ ہو جاتا ہے اور وہ ناکام و نامراد لوٹ جاتا اور راستہ میں ہی ہلاک ہو جاتا ہے کیونکہ قانون طبعی کہتا ہے کہ میں اس قوم کو نہیں مٹنے دونگا۔ قوموں میں تغیرّات آتے ہیں۔ مرد نامرد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح خاندانوں کے نام و نشان مٹ جاتے ہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں یہ تغیرّ نہیں آتا۔ اس لئے کہ آپ کی نسل بڑھے اور ترقی کرے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ کی تباہی کی خبر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان میں تباہی کے آثار پیدا ہو چکے تھے مگر اُن کی تباہی کی خبر تو یسعیاہؔ اور حبقوقؔ نے بھی دی تھی اور کئی ہزار سال پہلے دی تھی جبکہ قیصر و کسریٰ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور پھر قانونِ قدرت نے اُن کی تباہی کے سامان اُس وقت پیدا کئے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو گئے۔

اِسی طرح جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ظاہر ہوئے تو ہو سکتا تھا کہ مکّہ سے نکالے نہ جاتے اگر نکالے گئے تھے تو آپ کی قوم آپ پر حملہ نہ کرتی اگر حملہ کرتی تو شکست نہ کھاتی مگر یہ سب

کچھ ہوا۔ اب غور کرو یہ کس نے کرایا؟

اِسی طرح ممکن تھا کہ ابو جہل حملہ نہ کرتا اگر اُس نے کیا تو عبداللہ کو غصہ نہ دلاتا تا کہ وہ اس کی گردن چھوٹی نہ کاٹے مگر اس کے لئے اسباب پیدا ہوئے۔ یہ اسباب کس نے پیدا کئے؟ اِن سے صاف نظر آتا ہے کہ دو ہزار سال سے زمین و آسمان کی بادشاہت ایک ساتھ چل رہی تھی۔ آسمان سے حکم ہو گیا کہ ابراہیمؑ کی نسل کو قائم رکھنا۔ تباہی و بربادی کی آندھیاں آتیں تو انہیں کہہ دیا جاتا کہ دیکھنا مکّہ پر کوئی آنچ نہ آئے۔

اِسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ اتنا عرصہ قبل بتا دینا اور پھر اُس کا ہو بہو پورا ہونا۔ یہ سب باتیں قانون طبعی کے ماتحت تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کے نتیجہ میں فرماتا ہے۔ وَلَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے خدا کے منکر و غور تو کرو کیا یہ قانون آپ ہی آپ چل رہا ہے؟ مَیں دو ہزار سال کی ہسٹری پیش کر کے بتاتا ہوں کہ خدا ہے اور یقیناً ہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے خدا کا ثبوت ملتا ہے اور حضرت مسیحؑ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے متعلق فرمایا کہ اُس وقت خدا خود آ جائے گا۔ یعنی آپؐ کے وجود سے خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت ملے گا اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے پیروؤں سے یہ بھی کہا کہ دُعائیں مانگو کہ اے خدا جیسی تیری آسمان پر بادشاہت ہے ویسی ہی زمین پر بھی آئے۔ یعنی تم ہمیشہ دُعائیں مانگتے رہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں۔ دُعائیں مانگتے رہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ آسمان اور زمین کا خدا ایک ہی ہے۔

اس میں نہ صرف دہریوں کا ردّ ہے بلکہ جینیوں اور آریوں کا بھی ردّ ہے۔ جینی کہتے ہیں کہ روحیں ترقی کرتے کرتے آپ ہی اونچی ہو جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہ غلط ہے۔ ہم خود تغیرات کرتے کرتے کامل رُوح پیدا کرتے ہیں۔ آریہ کہتے ہیں دنیا میں خدا کا تصرف نہیں۔ مادہ اور رُوح آپ ہی آپ سب کچھ کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے دنیا کا سارا انتظام ہمارے احکام کے ماتحت چلتا ہے اور ہر قسم کے تغیرات ہم خود پیدا کرتے ہیں۔

طبعی قانون پر خدائے واحد کی حکومت

ذرا غور کرو! قانون شریعت کا قانون قدرت نے ایک زمانہ دراز تک کس طرح ساتھ دیا اور کس طرح اس کے ماتحت چلا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریبًا پونے تین ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ کیا یہ طبعی قانون پر حکومت نہیں کہ اس وقت تک حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جاری رہے گی۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا نام ایسا روشن ہوگا کہ اُن کی اولاد اس بات کو یاد رکھے گی کہ وہ ان کی اولاد ہے۔ مکّہ قائم رہے گا۔ اُس میں ایک خاص شخص ایک خاص حلیہ کا پیدا ہوگا۔ اس کی قوم اس کا مقابلہ کرے گی اور اُسے گھر سے نکال دے گی۔ وہ نبی حضرت موسیٰؑ کی طرح صاحب شریعت ہوگا۔ وہ پہلے کمزور ہوگا اور گھر سے نکالا جائے گا لیکن خدا تعالیٰ اُسے جماعت دے گا۔ وہ مصائب برداشت کرے گا اور صبر کرے گا لیکن اس کی قوم کا اس پر ظلم بڑھتا جائے گا۔ آخر دشمن خفیہ تدبیر کرے گا کہ اس کے کمزور ساتھیوں کو تباہ کردے اور فخر کرتا ہوا آئے گا۔ یہ واقعہ اس کی ہجرت کے ایک سال بعد ہوگا۔ جب مقابلہ ہوگا تو میدان اس کے ہاتھ رہے گا اور دشمن کے اکثر سردار مارے جائیں گے۔ اُن میں سے رئیس المکفرین عالی خاندان والا اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں اِس طرح مارا جائے گا کہ اُسی دشمن کے ہتھیار سے ایک شخص اس کی گردن تک سر کو ننگا کر کے اُس کا سر کاٹ دے گا۔ اُس کا قد اُونچا لیکن بدنما اونچا نہ ہوگا۔ وہ چلتے وقت زور سے قدم مارے گا (زمین اُس کے قدموں سے لرزے گی) اس کا رنگ سفید لیکن سُرخی مائل ہوگا۔ اُس کے بال گھنگھرالے ہونگے لیکن بالکل گھنگھرالے نہیں۔ اُن میں پیچ پڑے ہونگے۔ اُس کا کلام شیریں ہوگا لیکن سچائی پر مشتمل ہونے کے سبب سے لوگوں کو تلخ معلوم ہوگا۔ اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔ آخر وہ ایک دن فاران کی پہاڑیوں سے ہوتا ہوا مکّہ پر حملہ آور ہوگا۔ دس ہزار سپاہی جو نہایت نیک و پاک ہونگے اس کے ساتھ ہونگے اور وہ مکّہ کو فتح کرلے گا۔ اس کے بعد ملک اس پر ایمان لے آئے گا۔

اُس کے کام ایسے شاندار ہونگے کہ لوگ انہیں دیکھ کر عجیب کہہ اُٹھیں گے۔ وہ نہایت بااخلاق ہوگا اور غریب و مسکین اُس سے مشورہ کرنے میں نہ جھجکیں گے۔ اُس کے کلام میں اُسے

مثیل موسیٰ کہا جائے گا۔ اُس کی قوم کے کاموں سے خدا تعالیٰ خوش ہوگا۔ وہ انہیں مقدس بنائے گا اور ہمیشہ انہیں مقدس بنانے کے سامان پیدا کرتا رہے گا۔ اُس کے مذہب کا نام نیا ہوگا اور خدا تعالیٰ خود وہ نام انہیں دے گا اور اُس میں سلامتی کا لفظ پایا جائے گا۔ (سلامتی کا شہزادہ یعنی سردار اسلام اس کا لفظی ترجمہ ہے) اس کے شہر کو ہمیشہ آباد رکھا جائے گا اور لوگ دُور دُور سے اس کا قصد کر کے آئیں گے۔

وہ جس طرف رُخ کرے گا لوگ مرعوب ہونگے۔ قومیں اس پر مل کر حملہ کریں گی لیکن شکست کھائیں گی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ اور اس کے دشمن ہلاک ہونگے۔ اُس کا مقابلہ ایک طرف شامی حکومت سے اور ایک طرف ایرانی حکومت سے یعنی قیصر و کسریٰ سے ہوگا اور دونوں شکست کھائیں گی۔

اُس کے آنے کے بعد پہلی سلطنتیں اور پہلے دینوں کی برکت مٹ جائے گی اور ترقی رُک جائے گی۔ (عیسائیت نے بظاہر ترقی کی ہے لیکن پہلے عیسائیت نے بذریعہ تلوار بڑھنا چاہا اور بذریعہ تلوار روکی گئی۔ اب بذریعہ تبلیغ بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے تو حضرت مسیح موعودؑ مقابلہ کے لئے پیدا ہو گئے۔) اُس کی قوم میں ہمیشہ مصلح پیدا ہوتے رہیں گے۔ وہ اگلے اور پچھلے لوگوں میں بمنزلہ ایک واسطہ کے ہوگا۔ اُس کی تعلیم سلامتی کی تعلیم ہوگی۔ وہ کسی خاص قوم کے لئے نہ ہوگی بلکہ سب کے لئے ہوگی۔ اُس کا رویہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ کے طور پر ہوگا اور دوسری اقوام اس کے اثر سے اپنے اندر ایک پاک تبدیلی پیدا کر لیں گی۔ اُس کی تعلیم کے ذریعہ سے بے حکمت اور رسمی احکام کو مٹا کر باحکمت تعلیم دی جائے گی۔ اُس کی تعلیم میں ہر قسم کے ضروری امور بیان ہونگے اور وہ بالکل مکمل ہوگی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہوگا کہ وہ نجات کا راستہ ہر قوم اور ہر حالت کے لوگوں کے لئے کھولے گا اور افراط و تفریط اور شیطانی غلامی سے لوگوں کو بچائے گا۔ (غیر الہامی مذہب کلّی طور پر شیطان کے قبضہ میں ہیں) وہ فطرتِ انسانی کی نیکیوں کو اُبھارے گا۔ اُس کی کتاب خالص الہام پر مشتمل ہوگی ایک لفظ بھی دوسرا اُس میں موجود نہ ہوگا۔ وہ گذشتہ انبیاء پر سے الزامات کو دُور کرے گا خصوصاً حضرت مسیحؑ کی پاکیزگی ایک خاص نمونہ کے ذریعہ لوگوں کو عملاً دکھادے گا۔

یہ اخبار ایسی ہیں کہ جو ایک وقت میں نہیں دی گئیں۔ ایک وقت میں ان کے سامان نہیں پیدا کئے گئے۔ قوموں اور شہروں کا زندہ رہنا ہزاروں سال کے طبعی تصرّفات کا نتیجہ ہے۔ ایک خاص حلیہ کے شخص کا پیدا ہونا خاص علم الحیوانات کا نتیجہ ہے۔ دشمنوں اور دوستوں کے دل میں ان خیالات کا پیدا ہونا جو مذکور تھے خاص علم النفس کے ماتحت تغیّرات کا نتیجہ ہے۔ دشمنوں کا زیر ہونا خاص سیاسی تغیّرات کا نتیجہ ہے۔ (مسیحی کہتے ہیں کہ قیصر وکسریٰ پہلے سے کمزور تھے۔ ہم کہتے ہیں اِس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کی مدد کے لئے پیدائش سے بھی پہلے سامان ہو رہے تھے) اِسی طرح خاص تعلیم اور اس کی تفصیلات خاص آسمانی توجہات کا نتیجہ ہیں۔ غرض صاف طور پر یہ سلسلہ آسمانی اور زمینی بادشاہت کے ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اِن سب امور کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانی اور زمینی بادشاہتوں کا اتحاد ایک بالا اور بالا رادہ ہستی کا ثبوت دے رہا ہے فَسُبْحَانَ اللّٰهِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ۔ یہ مَیں نے ہی نہیں کہا بلکہ حضرت مسیح ناصریؑ بھی اس دلیل میں میرے ساتھ متفق ہیں۔ چنانچہ مسیحؑ کی یہ دُعا کہ تیری بادشاہت آئے۔ تیری مراد جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی آئے [۹۹] اِس سے حضرت مسیح کا یہی مطلب ہے کہ ظہور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دُعا کرو کہ اِسی کے ذریعہ سے آسمانی بادشاہت کا ظہور زمین پر ہوگا۔

اب دیکھو یسعیاہ باب ۹ [۱۰۰] اور حضرت مسیح کی پیشگوئی (متی باب ۲۱) کس رنگ میں پوری ہوئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ خدائے قادر ہوگا اور مالکِ ارض وسما ہوگا۔ (یعنی باغ کا مالک) اِس کے یہی معنے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا زبردست ثبوت اور آسمانی اور زمینی نظاموں کا ایک بالا رادہ ہستی کے ہاتھ میں ہونے کا ثبوت آپ کی ذات میں ملے گا اور اُن کے ذریعہ سے لوگ قطعی طور پر خدا تعالیٰ کی ہستی کا علم حاصل کریں گے۔ پس آپ کا آنا خدا کا آنا ہوگا۔

قرآن کریم کی دوسری اصولی اصلاح

قرآن کریم نے جو دوسری اصلاح کی وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہے۔

چنانچہ دوسری اصولی غلطی جو دنیا میں پیدا ہوئی وہ خدا تعالیٰ کے ماننے والوں میں سے بھی اُس گروہ میں پیدا ہوئی جو خدا تعالیٰ کو تو مانتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی زندگی کا منکر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا

دنیا کو پیدا کر کے اب الگ ہو گیا ہے اور اب سب تغیرات آپ ہی آپ ہو رہے ہیں۔ گویا نعوذ باللہ اگر خدا تعالیٰ نہ بھی رہے تو بھی دنیا چلتی رہے گی اور دنیا کے انتظام میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دُعا کے منکر اور ہر امر کو قانونِ قدرت کے تابع قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اِس زمانہ میں علی گڑھ میں سید احمد ایسے ہی خیالات رکھتے تھے اور اس سے پہلے بھی بہت سے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں۔ جو یہ کہتے تھے کہ خدا اب دنیا کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ اسلام نے اِن لوگوں کی غلطی کو بھی دُور کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے:۔قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ؗ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؗ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ؗ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ [۵۱] فرمایا۔ کہو اے اللہ! تو ہی ہے جو ملک کا مالک ہے۔ تُو جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے۔ ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ تو دن کو رات میں اور رات کو دن میں داخل کرتا ہے۔ تو زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنا دیا اب وہ بالکل بے دخل ہے کس طرح پیدا ہوا؟ اصل میں یہ قلّتِ معرفت سے پیدا ہوا ہے مگر فلسفی اس کے متعلق کچھ دلائل بھی دیتے ہیں۔ جو یہ ہیں:۔

اوّل اگر خدا کا تصرّف قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ تو یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت کی غرض باطل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قانون بنایا ہے کہ آگ جلائے اگر کوئی خدا سے دُعا کرے کہ آگ نہ جلائے اور یہ دُعا قبول ہو جائے تو دنیا میں ابتری پھیل جائے گی اور کوئی ترقی نہ ہو سکے گی۔ قانونِ قدرت کی اتباع اِسی لئے کی جاتی ہے کہ اس کا ایک یقینی نتیجہ نکلتا ہے۔ لوگ آگ جلاتے ہیں اس لئے کہ وہ جلتی ہے۔ پانی پیتے ہیں اس لئے کہ پیاس بجھاتا ہے اگر کبھی پانی پینے سے شعلے نکلنے لگ جائیں تو کوئی نہ پیئے۔

دوم قانون کے خلاف تصرف کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ مثلاً ایک نے سامانِ جنگ تیار کیا اور لشکر جمع کیا اور اِس طرح جنگ میں فتح پانے کے متعلق قانونِ قدرت کی اطاعت کی لیکن ایک دوسرے نے دُعا کر کے اُسے شکست دے دی تو یہ انصاف کے خلاف ہے کہ جو قانون کے مطابق کام کر رہا ہے وہ تو نقصان اُٹھائے اور جو مخالف ہے وہ جیت جائے۔

تیسرے اگر تصرف قانونِ قدرت کے مطابق ہے تو پھر بے فائدہ ہے۔ کسی کی دُعا کیسے قبول ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں دُعا کے قبول ہونے کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ مَیں نے روٹی کھائی مگر مَیں نے دُعا کی تھی جو قبول ہوگئی اور میرا پیٹ بھر گیا۔ یہاں دُعا نے کیا اثر کیا؟ یہ تو روٹی نے اپنا اثر دکھایا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر چیز کا سبب موجود ہے بلکہ جسے دُعا کا نتیجہ کہتے ہیں اس کا بھی ہم سبب بتا دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں دُعا کی اور لڑکا پیدا ہوگیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ میاں بیوی ملے تب بچہ پیدا ہوا اور اسی طرح بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو اسباب سے الگ ہو اگر پیشگوئیاں پیش کرو۔ مثلاً کہو بتایا گیا تھا کہ بیٹا ہوگا اور ہو گیا تو پیشگوئی اظہار واقعہ ہے۔ بیٹا پیدا ہونا تھا۔ تمہیں اس کا پتہ لگ گیا اور تمہیں بتا دیا گیا۔ اِس سے دُعا کا کیا تعلق ہوا؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اِس سے قانونِ قدرت کی غرض باطل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی بالعموم سامان ہی پیدا کرتا ہے جن سے انسان کو اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ وہ بغیر اسباب کے تصرّف نہیں کرتا بلکہ اپنی مشیت پوری کرنے کے لئے بعض نئے اسباب پیدا کر دیتا ہے جو لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہوتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر سبب یقینی نہیں مگر پھر بھی لوگ اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جیسے بیماریوں میں علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن کیا کوئی علاج یقینی اور قطعی ہے؟ آخر سب بیمار تو اچھے نہیں ہوتے مگر پھر بھی لوگ علاج پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ استثناء پایا جاتا ہے اور استثناء قاعدہ کو کمزور نہیں بلکہ اُسے مضبوط کرتا ہے۔ اِسی طرح اگر اللہ تعالیٰ بھی کبھی تقدیر خاص جاری کرے تو اِس سے قانونِ قدرت میں کوئی خرابی واقعہ نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک زائد فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کا جلال نظر آ جاتا ہے اور اُن

کا ایمان اپنے ربّ پر بڑھ جاتا ہے۔ (۲) تصرّف انصاف کے بھی خلاف نہیں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ قانونِ قدرت جدھر چل رہا ہو انصاف بھی اُسی طرف ہو۔ مثلاً ایک ڈاکو جاتا ہے اور ایک بچے کی گردن پر تلوار مار کر اُسے اُڑا دیتا ہے۔ اب قانونِ قدرت کہتا ہے کہ جب تلوار گردن پر پڑے تو سر الگ ہو جائے مگر کیا یہی انصاف ہوگا؟ دنیا میں کروڑ ہا مواقع ایسے پیش آتے ہیں جبکہ قانونِ قدرت کو لوگ غلط رنگ میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ ایسے نشان دکھائے جن سے قانونِ قدرت کا غلط استعمال رُک جائے۔ چنانچہ جب ایسے مواقع پر خدا تعالیٰ قانونِ قدرت کے غلط استعمال کو اپنے تصرّف سے روکتا ہے تو بحیثیت مجسٹریٹ نہیں بلکہ بحیثیت مالک روکتا ہے اور دُعا اُسی وقت قبول ہوتی ہے جب دُعا کرنے والا حق پر ہوتا ہے ورنہ دُعا اُس کے مونہہ پر ماری جاتی ہے۔ پس اِس ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے قانونِ قدرت کے صرف ناجائز استعمال کو دُور کیا ہے اور یہ ظلم نہیں بلکہ انصاف کے عین مطابق ہے۔ (۳) یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کا تصرّف قانونِ قدرت کے مطابق ہے تو پھر تصرّف کیسا ہوا یہ بھی درست نہیں کیونکہ اگر تصرّف محض قانون کے مطابق چلے تو بے شک بے فائدہ کہلائے گا لیکن اگر تصرّف قانون کو اپنے مطابق کرنے کے ذریعہ سے ظاہر ہو تو پھر وہ بے فائدہ کیوں ہوا۔ ایسی صورت میں تو اگر تصرف نہ ہوتا تو قانون مخالف رنگ میں ظاہر ہوتا اور نقصان کا موجب بنتا۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہر چیز کا سبب موجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے تصرف کے مدعی یہ تو کہتے ہی نہیں کہ وہ بغیر اسباب کے تصرف کیا کرتا ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دُعا کرنے والے کی تائید میں اسباب پیدا کر دیتا ہے اور اسباب پیدا کرنا دنیا کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے ورنہ بغیر ظاہری اسباب کے تصرف تو بعض دفعہ فساد کا موجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں بھی خدا تعالیٰ نے اسباب کو مخفی کیا وہاں عوام کو ٹھوکر لگی۔ جیسے دیکھ لو مسیح کی پیدائش یہود کے لئے ٹھوکر کا موجب ہوئی اور انہوں نے حضرت مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا لیکن یحییٰؑ کی پیدائش اُن کے لئے کسی ٹھوکر کا موجب نہ تھی۔ اِسی طرح سارہؑ کے ہاں بچہ پیدا ہونا بھی لوگوں کے لئے کسی ٹھوکر کا موجب نہ بنا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت اسحاقؑ اور یحییٰؑ کی پیدائش میں ظاہری اسباب موجود تھے مگر حضرت مسیحؑ کی پیدائش میں وہ اسباب نہیں تھے۔ اس لئے ان کو ٹھوکر لگی۔

حالانکہ مریم میں بچہ کے پیدا کرنے کی خاصیت پیدا کرنا یا زکریاؑ اور سارہؑ میں پیدا کرنا بالکل ایک ہی بات تھی۔ پس اسباب کا مخفی کرنا بسا اوقات فضل کی بجائے فتنہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اسباب کا پیدا کرنا انسان کے لئے رحم کے طور پر ہے اور لوگوں کو فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔ ہم اس بات کے ہرگز قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر اسباب کے کچھ کر ہی نہیں سکتا یا جہاں اسباب ہوں وہاں اللہ تعالیٰ کا تصرّف نہیں ہوتا بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ دُعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ جن سے کام ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ اسباب کسی کو نظر نہیں آتے لیکن دُعا کے نتیجہ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تجارت میں ترقی دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کئی اسباب بنائے ہوئے ہیں مگر ہر شخص کو پورے سامان میسّر نہیں آتے۔ جب دُعا کی جائے تو وہ اسباب مہیّا ہو جاتے ہیں اور ایسا انسان ترقی کر جاتا ہے لیکن اگر خدا تعالیٰ یوں ہی کسی کے گھر دس ہزار روپیہ پھینک دے تو فوراً پولیس آ کر اُس کو پکڑے کہ کہیں سے چوری کر کے لایا ہے۔ پس اسباب کا پیدا کرنا بسا اوقات خود اُس شخص کے لئے مفید ہوتا ہے جس کے لئے وہ تصرّف کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مان لیا خدا اسباب پیدا کرتا ہے مگر ایک منکر کو کس طرح منواؤ گے کہ خدا نے اسباب پیدا کئے اور اس طرح اس کا تصرّف ظاہر ہوا یا فلاں موقعہ پر عام قانون جاری ہوا اور فلاں موقعہ پر تصرف۔ اِس کے دو جواب ہیں۔ اوّل یہ کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے اس کا ہر فعل ہی تھوڑے یا بہت تصرّف میں ہوتا ہے مگر بعض اوقات اپنے خاص تصرّف کے ماتحت اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ جن میں بندہ پر کوئی اعتراض نہیں آتا اور اُس کی طاقت کا ایک نشان ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے بدرؔ کے موقع پر ہوا۔ خدا تعالیٰ نے آندھی چلا دی اور ساتھ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کنکر چلائے۔ کفار آندھی کی وجہ سے دیکھ نہ سکتے تھے کیونکہ آندھی کا رُخ اُن کی طرف تھا اور مسلمان خوب زور سے اُن پر حملہ کرتے تھے اِس قسم کی مثالوں کے متعلق دشمن کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ خاص تصرّف ہوا اور جس کی تائید میں ایسا نشان ظاہر ہوا اُس پر کوئی الزام بھی نہیں آتا لیکن ایسی مثالیں کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں اور لمبے زمانہ تک دلیل رہتی ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نیا انسان بھیج دیتا ہے اور اس کی تائید میں ایسے نشانات دکھائے جاتے ہیں۔

اَب رہا یہ اعتراض کہ کیوں نہ سمجھیں کہ پیشگوئیاں صرف اظہارِ حقیقت ہوتی ہیں اُن میں خدا

کا کوئی تصرّف نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اظہارِ حقیقت بھی تو کسی غرض کے لئے ہوتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کسی سے کہتا ہے کہ تمہارے ہاں بیٹا ہوگا تو یہ کیوں قبل از وقت بتاتا ہے۔ اس کی کوئی غرض ہونی چاہئے۔ یا کسی کو بتاتا ہے کہ تم مرجاؤ گے تو اُس کے بتانے کی بھی کوئی حکمت ہونی چاہئے اور وہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ خوشخبری اس لئے دیتا ہے تا انسان اس کے لئے کوشش کرے اور ڈراتا اِس لئے ہے تا کہ آنے والی مصیبت سے انسان بچ سکے ورنہ اگر کوئی پیشگوئی بے مقصد ہو تو وہ فضول ہے اگر خیر کے حصول اور شر سے بچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تو پھر بتانے کے معنے ہی کیا ہوئے اور اگر کہو کہ قبل از وقت بتانے کی غرض ہوشیار کرنا ہے تو یہ بھی تو تصرّف ہے۔ کسی کو بتا دینا کہ ایسے اسباب پیدا ہو رہے ہیں تم اُن کے مقابل میں ایسے ایسے اسباب پیدا کرلو۔ یہ بھی تو تصرّف ہی ہے خواہ بالواسطہ ہی سہی۔ یہ تو فلسفیوں کا اعتراض تھا جس کا جواب دیا گیا۔ دوسرا اعتراض عملی لوگوں کا ہے وہ کہتے ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں مگر قبول نہیں ہوتی۔ ہم نے دعا مانگی کہ بیٹا ہو مگر نہ ہوا۔ ہم نے مقدمہ جیتنے کی دُعا مانگی مگر نہ جیتے۔ قرآن نے ان سب باتوں کا جواب دیا ہے اور اپنے دعویٰ کے دو ثبوت دیئے ہیں ایک فلسفیانہ اور ایک مشاہدہ کا۔ فرماتا ہے:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ○ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ○

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ۔ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ [۱۰۳]

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تصرّف کے کئی دلائل دیئے ہیں۔(۱) پہلی دلیل یہ دی ہے کہ اِس دنیا کی پیدائش میں طبعی قانون کا ہی اجراء نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی قانون بھی عمل کر رہا ہے۔تم تو کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ دخل دے مگر ہم ایک اَور نکتہ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ دیکھو اِس دنیا کو کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا اس لئے کہ انسان کھائے پیئے اور پھر مر جائے۔ یہ تو مقصد نہیں۔ پھر کیا اس لئے کہ انسان کو اعلیٰ مدارج اور اعلیٰ ترقیات پر پہنچایا جائے اگر یہ ہے تو معلوم ہوا کہ دنیا کا اصل مقصد قانونِ طبعی کا اجراء نہیں بلکہ قانونِ اخلاقی کا اجراء ہے۔ دنیا کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اِس میں انسان پیدا ہو اور وہ با خدا انسان بنے۔ چنانچہ فرمایا۔اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لئے بڑے نشانات ہیں۔ عقلمند وہ ہیں جو خدا کو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔تب وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ اے خدا! تُو نے اِس دنیا کو بغیر مقصد کے پیدا نہیں کیا۔ اب دیکھو قانونِ طبعی تو ہر ایک کو نظر آتا ہے اس کے متعلق سوچنے اور غور کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ سوچتے ہیں اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس دنیا کو بغیر وجہ کے پیدا نہیں کیا گیا اور پھر وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تُو ہمیں توفیق دے کہ ہم اس مقصد کے مطابق زندگی بسر کریں۔ وہ مقصد کیا ہے یہ کہ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۚ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ یعنی اے خدا! ہمیں وہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی اور اخلاقی ترقیات عطا کر جن کی وجہ سے انسان با خدا ہو جاتا ہے اور ان باتوں سے بچا جن سے انسان خدا سے دُور ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس کے لئے کوشش شروع کر دی ہے تُو توفیق دے کہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

(۲) دوسری دلیل یہ دی ہے کہ الٰہی تصرّف کے بغیر بالکل ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ روحانی اور اخلاقی قانون ملیا میٹ ہو جائے کیونکہ نبی دنیا میں خدا تعالیٰ کے جلال کے اظہار کے لئے آتا ہے اور دنیا کو کمزور ہونے کے باوجود دکھاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا تصرّف کیسا کامل ہے۔ اس وقت دنیا کلّی طور پر قانونِ قدرت پر چل رہی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ہر قسم کی خرابیاں پورے زور پر ہوتی ہیں۔ پس جب قانونِ قدرت کے ذریعہ زیادہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو خدا تعالیٰ نبی کے ذریعہ قانونِ اخلاق اور قانون روحانیت کو قائم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ دو کُشتی کرنے والوں میں سے جو اپنا ہوتا ہے اُسے غالب کرنے کے لئے سہارا دے دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح جب قانونِ قدرت قانون اخلاق کے خلاف چلنے لگتا ہے اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اپنا کوئی نبی مبعوث کر کے قانون اخلاق کو قائم کر دیتا ہے۔ پس اگر دنیا کی پیدائش کی غرض کو پورا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ الٰہی تصرّف ہوتا کہ جب رُوحانی اور اخلاقی قانون کو کچلنے کیلئے کوئی زبردست فرد یا گروہ طبعی قانون سے مدد لے رہا ہو تو وہ اُس کے راستہ کو تبدیل کر دے۔ اسی لئے فرمایا کہ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ مَیں نے دنیا کو روحانی ترقی کے لئے بنایا ہے۔ مَیں اُسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اب مشاہدہ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دُعا قبول نہیں ہوتی۔ فرمایا ہر ایک دُعا خدا قبول نہیں کرتا لیکن یہ نہیں کہ کوئی دُعا بھی قبول نہیں کرتا اگر خدا کے تصرّف کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس امر سے دیکھو کہ ہم کفّار کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۗ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ سامانوں کو دیکھو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس ہر قسم کے سامان موجود تھے۔ قانونِ قدرت پوری طرح اُن کی تائید میں تھا مگر ہمارا قانون اخلاق چونکہ اِس سے مقدّم ہے اس لئے ہم بتاتے ہیں کہ یہ لوگ جو اپنے لشکروں اور سامانوں سے ڈراتے پھرتے ہیں خدا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ اِن سامانوں والوں کو ہلاک کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب کر دے گا۔ ہاں فرماتا ہے کہ چونکہ طبعی قانون بھی ہمارا ہے اس لئے اس کا اعزاز بھی قائم رہنا چاہئے اور شرعی اور اخلاقی قانون پر اعتماد کر کے اِسے ترک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اِس میں اللہ تعالیٰ کی ہتک ہے۔ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ ۲۰۱
اے مومنو! ہم نے دشمن کے اس اعتراض کا جواب دے دیا کہ خدا دُعا نہیں سنتا ہے۔ ان کو ہم نے بتا دیا ہے کہ وہ دُعائیں سُنتا ہے اور ایسے تصرّفات کرے گا کہ تم باوجود ساز و سامان کے جیت نہیں سکو گے اور جو تمہارے مقابلہ میں بے سرو سامان ہیں وہ جیت جائیں گے مگر تم بھی غلطی نہ کرنا کہ کہہ دو ہمیں قانونِ قدرت کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ وہ قانون بھی میرا ہی بنایا ہوا ہے۔ پس اے مومنو! صبر سے کام لینا، جتھہ بندی کرنا، ہر قسم کے سامان تیار رکھنا تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

ہاں کبھی خدا تعالیٰ کا منشاء یہ بھی ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ جیسے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھانسی کی تکلیف تھی۔ یہ کھانسی اتنی شدید تھی کہ جب اُس کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحکیم نے پیشگوئی کر دی کہ مرزا صاحب کو سل ہو گئی ہے اور اس بیماری سے فوت ہو جائیں گے۔ ادھر پیشگوئی شائع ہوئی اُدھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دوائی پلانے کا کام میرے سپرد تھا اور مجھے کمپونڈری کرنے کے لحاظ سے یہ خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علاج کے متعلق میری ہدایات ماننی چاہئیں۔ اُن دنوں ایک دوست آئے جو تحفہ کے طور پر کچھ پھل لائے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس وقت لیٹے ہوئے تھے اور اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے آپ کو کھانسی کا شدید دورہ ہو چکا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا پھل ہے؟ مَیں نے عرض کیا۔ کیلے اور سنگترے ہیں اور ساتھ ہی مَیں نے عرض کیا کہ آپ نہ کھائیں کیونکہ آپ کو شدید کھانسی ہے۔ آپ نے پھل اپنے پاس رکھ لئے۔ آپ کھاتے جائیں اور مسکراتے جائیں۔ مَیں کُڑھنے لگا کہ حضرت مولوی صاحب (یعنی حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ) کو کیا جواب دوں گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میری حالت دیکھ کر فرمایا۔ تمہیں بُرا لگتا ہے لیکن مجھے الہام ہوا ہے کہ کھانسی دُور ہو گئی ہے۔ تو بعض مواقع پر خدا تعالیٰ ایسے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے کہ قانون قدرت کی پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق بھی ایسے واقعات پائے جاتے ہیں۔ غزوہ حنین میں جب صحابہؓ کی سواریاں بدک گئیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف ۱۲ آدمی رہ گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ذرا پیچھے ہٹ جائیں کیونکہ دشمن کا شدید حملہ ہے۔ جس صحابیؓ نے آپؐ کی سواری کے جانور کو پکڑا ہوا تھا

اُسے آپؐ نے فرمایا چھوڑ دو اور پھر سواری کو ایڑ لگا کر آگے بڑھے اور فرمایا ؎

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

اور باوجودیکہ اُس وقت چاروں طرف سے تیر برس رہے تھے مگر آپؐ کو نہ لگے۔ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے تصرّف کے ماتحت جو اسباب پیدا ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے۔

اِس جواب میں دُعا والے اعتراض کا جواب بھی آ گیا۔ یعنی خدا تعالیٰ کے طبعی اور اخلاقی قانون پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ اس لئے دُعا دونوں کے توازن کے ماتحت اور قانون کے ماتحت ہی قبول ہوتی ہے اور جو اس کے خلاف چاہتا ہے وہ بیوقوف ہے۔ بہر حال اخلاقی اور روحانی قانون میں اندھیر نگری نہیں ہے۔

تیسری اصولی اصلاح توحید کے متعلق

تیسری اصلاح قرآن کریم نے توحید کے متعلق کی ہے۔ اس کے متعلق پہلی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ خدا کے مقابلہ میں اَور خدا مقرر کرنے شروع کر دیئے گئے تھے۔ یہ خرابی خواہ شرک فی الذات کی صورت میں ہو۔ جیسا کہ مسیحیوں، ہندوؤں اور زرتشتیوں میں ہے اور خواہ شرک فی الصفات ہو جیسا کہ یہود میں ہے کہ وہ عُزیر کو ابن اللہ کہتے تھے۔ ملک صدق سالم کو ازلی ابدی بن ماں باپ کے مانتے تھے۔ الیاسؑ اور کئی اَور لوگوں کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے تھے۔ اسلام نے ان سب شرکوں کو مٹایا ہے اور ایک خالص توحید قائم کی ہے۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۫ وَّ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ۔ لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ[6] یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ ہر ایک کام کے لئے کافی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اُس کے ہاتھ میں ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں وہی گھاٹے میں پڑتے ہیں۔

اِس میں چار دلیلیں ہر قسم کے شرک کے ردّ میں دی گئی ہیں (۱) فرمایا تمام چیزوں کے دیکھنے سے صاف طور پر نظر آئے گا کہ وہ دو ہستیوں کی پیدا کردہ نہیں بلکہ ایک ہی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور سب کی پیدائش ایک ہی قانون کے ماتحت ہے۔ بچہ کو کسی اَور نے اور خوراک کو کسی اَور نے پیدا

نہیں کیا بلکہ بچہ پیدا ہی اس خوراک سے ہوتا ہے جو تم کھاتے ہو اور جو چیزیں کھائی جاتی ہیں ان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ فرمایا۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ۔ اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کا خالق ہونا دلیل ہے اِس بات کی کہ اور کوئی خدا نہیں ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ دی کہ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ خدا ہی سب چیزوں کا محافظ ہے یعنی سب چیزوں کی حفاظت ایک قانون کے ماتحت ہے۔ مثلاً کسی کا بیمار بیٹا اچھا ہوتا ہے تو اگر وہ یونہی اچھا ہو جاتا تو کہا جاتا کہ اس کو اچھا کرنے والا کوئی اَور ہے اور سورج چاند کو بنانے والا کوئی اَور مگر اب چونکہ اچھا کرنے میں سورج چاند کا بھی دخل ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ جس نے سورج چاند پیدا کئے اُسی نے اچھا کیا۔

(۳) تیسری دلیل یہ دی کہ تمام ضرورتیں رُوحانی وجسمانی اُسی سے پوری ہوسکتی ہیں۔ فرمایا لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ جب انسان کی ساری ضروریات خواہ وہ جسمانی ہوں یا رُوحانی خدا ہی پوری کرتا ہے تو پھر عُزیر یسوعؑ اور ملکؔ صدق وغیرہ کی ضرورت نہ رہی۔ کسی اَور خدا کی کیا ضرورت رہی کہ اُس کو معبود قرار دیا جائے۔

(۴) چوتھی دلیل یہ دی کہ خدا کی توحید کے مؤید ہمیشہ جیتتے اور دشمن ناکام ہوتے ہیں فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جو لوگ توحید کے منکر ہوتے ہیں وہ توحید کے ماننے والوں کے مقابلہ میں ہارتے ہیں۔ یہ عملی ثبوت ہے خدا کی توحید کا۔

پس شرک فی الذات اور شرک فی الصفات دونوں غلط ہیں۔ جہاں بعض لوگوں نے مشرکانہ خیالات سے توحید میں نقص پیدا کیا ہے۔ وہاں بعض لوگ توحید کے شوق میں وحدۃ الوجود کے قائل ہو گئے اور ذرّہ ذرّہ کو خدا بنا دیا۔ قرآن کریم نے اِس کی بھی تردید کی ہے۔ اِن لوگوں نے اپنی طرف سے توحید کی تائید کی تھی اور کہا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اَور وجود تسلیم کریں تو اس سے شرک لازم آتا ہے مگر انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ اس طرح انہوں نے ہر چیز کو خدا قرار دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا بھی ردّ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ فرمایا۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ [۷۷] فرمایا۔ تم کہتے ہو کہ سب کچھ خدا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ہر وہ چیز جو پیدا ہوئی ہے ہلاک ہوتی ہے اگر

یہ سب کچھ خدا ہے تو تغیّر پذیر نہیں ہو سکتا لیکن اس کا تغیّر پذیر ہونا خود ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ خدا کا حصّہ نہیں کیونکہ اگر حصّہ میں تغیّر ہو سکتا ہے تو کل میں تغیّر بھی لازمی ہے۔

اِس طرح قرآن کریم نے انسانوں پر جو لعنتیں کی ہیں ان سے بھی وحدة الوجود والوں کی تردید ہوتی ہے۔ لعنت کے معنے دُور کئے جانے کے ہیں اگر ہر چیز خدا کا حصّہ ہے تو ایسے لوگوں کو دُور کیوں کیا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سختی کی گئی ہے مگر اس طرح وحدة الوجود کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہر چیز خدا کا حصّہ ہے تو کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ اس کے حصّے نہایت گندے اور ناپاک ہیں مگر یہ خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اگر وحدة الوجود والوں کو کہیں کہ تم تو اچھے ہو مگر تمہارا دل بڑا ناپاک ہے تو لڑ پڑیں گے مگر خدا تعالیٰ کا جن چیزوں کو جزو قرار دیتے ہیں اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ گندی ہیں۔

بعض لوگوں نے اُن کے برعکس یہ نظریہ قائم کیا کہ دنیا کو خدا سے بالکل جُدا کر دیا اور کہہ دیا کہ خدا عرش پر ہے اور دنیا اس سے بالکل الگ ہے۔ وہ مخلوق سے بالکل جُدا آسمان پر قائم ہے اور وہاں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ نظریہ موحد یہود اور موحد زرتشتیوں کا ہے اور بدقسمتی سے اہلحدیث کا بھی ہے۔ اسلام نے اسے بھی ردّ کیا ہے فرماتا ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ [۱۰۸] یعنی اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ عرش پر الگ تھلگ بیٹھنے والا تو اوّل۔ آخر اور ظاہر۔ باطن نہیں ہو سکتا اور نہ ہر چیز کو جاننے والا ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق: آیت ۱۷) ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اَب جب تک وہ سارے جسم پر تصرّف نہ کرے رگِ جان کے کِس طرح قریب ہو سکتا ہے۔

غرض اسلامی تعلیم یہ ہے کہ نہ تو ہر شئے خدا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام پر محصور ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر انسان اِسے سمجھ نہ سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ بھی ہے اور پھر الگ بھی ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اور اعتراضوں کے جواب کے سلسلہ میں یہ دیا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ [۱۰۹] فرمایا یہ اعتراض جہالت کا نتیجہ ہے۔ مخلوقات کے

متعلق تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی نہیں ہو سکتیں لیکن خدا کی تو کوئی مثل ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی ذات کو اپنی ذاتوں پر قیاس کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ پس اسے اپنے اُوپر قیاس نہ کرو۔ جو طاقت سے بالا ہو اُس کے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ تم خدا کو سمیع کہتے ہو تو کیا یہ بھی کہتے ہو کہ اُس کے تمہاری طرح کان ہیں۔ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا بغیر کانوں کے سُنتا ہے اور بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے اور کہتے ہو خدا کے دیکھنے اور سُننے کے متعلق ہمارا قانون نہیں چلتا تو پھر جگہ کے متعلق اپنا قانون کیوں چلاتے ہو۔ پس جو ہستی تم سے بالا ہے اُس کے سمجھنے کی کوشش فضول ہے۔ فرماتا ہے۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا [11] یعنی اے مخاطب! جس بات کا تجھے علم نہ ہو اُس کی اتباع ہرگز نہ کیا کر کیونکہ کان اور آنکھ اور دل اِن سب کے متعلق تجھ سے پوچھا جائے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ صرف آنکھ اور کان کا تجسس ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دل بھی تجسس کرے گا تو پکڑا جائے گا۔ درحقیقت یہ ضروری نہیں کہ کسی چیز کے سمجھنے کے لئے اُس کی مُنہ بھی سمجھی جائے۔ انسان سمجھ اُسی قدر سکتا ہے جس قدر سمجھنے کی اس میں طاقت ہو۔ انسان کا علم دو قسم کا ہوتا ہے۔ بعض چیزوں کے خالی وجود کا اُسے علم ہوتا ہے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح ہیں اور بعض چیزوں کے متعلق پتہ ہوتا ہے کہ کس طرح ہیں اور اُن کی کیا حقیقت ہے۔ پھر بعض کے متعلق اُس کے منبع تک کا علم ہوتا ہے۔ غرض جس جس قدر اس کا ادراک چل سکتا ہے اُسی قدر وہ بھی چل سکتا ہے مگر فرمایا وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ [12] اللہ تعالیٰ کے متعلق جس قدر سمجھنے کی خدا تعالیٰ نے تمہیں طاقت دی ہے اُتنا ہی تم سمجھ سکتے ہو۔ اس سے آگے بڑھو گے تو ٹھوکریں کھاؤ گے۔

چوتھی اِصلاح۔ خدا تعالیٰ اور بندے کا تعلق

چوتھی اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا اور بندہ کے متعلق کی ہے اس بارہ میں ایک وسوسہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بندہ کی ہدایت کے لئے کوئی کلام نہیں اُتارا۔ خود ہی انسان تجربہ سے اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لیتا ہے۔ فلاسفر وغیرہ کہ خدا کے قائل ہیں لیکن الہام و شریعت کے نہیں اُن کا یہی نظریہ ہے۔ قرآن کریم اُسے ردّ کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ

الْهُدٰى۔ [۱۱۲] یاد رکھو روحانی معاملات میں آپ ہی رستہ نہیں بنایا جا سکتا۔ صرف اللہ ہی یہ رستہ دکھا سکتا ہے۔ آگے اس کی وجہ بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے: قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ [۱۱۳] اُس کی بات ہو کر رہنے والی ہے اور جس دن صور پھونکا جائے گا حکومت صرف اُسی کو حاصل ہو گی۔ وہ پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی جانتا ہے وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔

اِس آیت میں مندرجہ ذیل دلائل دیئے گئے ہیں:-

اوّل یہ کہ خدا کا کلام غلطی سے پاک ہوتا ہے اور ہدایت کے لئے غلطی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ دنیوی امور کے متعلق تو ہو سکتا ہے کہ ایک غلط بات بھی مان لی جائے اور اس کا کچھ نقصان نہ ہو۔ مثلاً باپ دادا پانی کو مفرد مانتے آئے تو اس سے کوئی نقصان نہ ہوا لیکن اگر خدا تعالیٰ کے متعلق غلطی کی جائے اور خدا کو ایک نہ مانیں تو اس کا نتیجہ جہنم ہو گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ روحانی ہدایت خدا ہی دے تا کہ وہ غلطی سے پاک ہو نہ کہ تجربہ سے حاصل کی جائے۔

دوم۔ جس مقصد کے لئے کلامِ الٰہی کی ضرورت ہے یعنی مابعد الموت ترقیاتِ روحانی ان کے اسرار خدا تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ پس اس منزل کے لئے جس کا علم انسان کو نہیں وہ کیونکر اپنے لئے قوانین بنا سکتا ہے؟ چونکہ اس دنیا میں جو تم عمل کرتے ہو اُس کی غرض ابدی زندگی میں ایسی طاقت کا حاصل ہونا ہے جس سے کہ وہاں کام کر سکو اور تمہیں پتہ ہی نہیں کہ اگلے جہان کی کیا حالت ہے تو اُس کے لئے سامان کس طرح مہیا کر سکتے ہو۔ اُس ملک پر صرف خدا کا تصرّف ہے اِس لئے خدا ہی اس کے متعلق سامان کی تیاری کرا سکتا ہے۔

سوم۔ یہ کہ وہ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے وہ ظاہری اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اگلے جہان کو جانے دو۔ اِسی جہان کو دیکھ لو۔ تمہاری فطرت میں بڑی بڑی طاقتیں ہیں مگر انسان خود اُن کو نہیں جانتا۔ یہ سب باتیں خدا ہی جانتا ہے۔ اِس لئے ترقی کے سامان بھی وہی کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اَور یہ کام نہیں کر سکتا۔

چہارم یہ کہ وہ علیم و خبیر ہے۔ جہاں اُسے انسانی طاقتوں کا علم ہے وہاں وہ انسانی کمزوریوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ اِس لئے فرماتا ہے چونکہ ہم ہی جانتے ہیں کہ کیا کیا طریق تمہیں بتانے

چاہئیں۔ اس لئے ہم ہی سامان پیدا کرتے ہیں کیونکہ حکیم اور خبیر ہستی ہی قواعد تجویز کر سکتی ہے۔ اِسی بنا پر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ روحانی راہنما کے لئے طبیب ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ممکن ہے وہ دوسروں کو ایسی باتیں بتادے جو انسانی صحت کے لئے سخت مضر ہوں۔

دوسرا وسوسہ خدا تعالیٰ کے کلام کے متعلق یہ تھا کہ کہتے تھے کہ خدا کلام تو اُتارتا ہے مگر الفاظ میں نہیں بلکہ دل میں خیال پیدا کر دیتا ہے۔ آج کل یہ غلطی برہمو سماج کو لگی ہوئی ہے بلکہ مسیحیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کو بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کا مُنہ اور زبان ہے کہ وہ الفاظ بولتا ہے؟ اِس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خدا لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ہے جس طرح وہ بے کان کے سُنتا ہے۔ بے آنکھ کے دیکھتا ہے۔ اِسی طرح بے زبان کے کلام بھی کر سکتا ہے اور یہ معترض خدا تعالیٰ کے دیکھنے اور سُننے کی طاقت کو تسلیم کرتے ہیں پھر اعتراض کیسا۔ یہ الزامی جواب ہے۔ حقیقی جواب یہ دیا کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ [۱۱۴] فرمایا۔ اِن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی طاقتوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ جب انہوں نے یہ بات کہی کہ کسی بندہ پر اُس نے کلام نازل نہیں کیا اگر نہیں نازل کیا تو موسیٰؑ پر کس نے کتاب نازل کی تھی؟ جس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہوں نے کچھ چھپائے اور کچھ ظاہر کئے۔ پھر وہ کون ایسی باتیں سکھاتا ہے جو اُن کے باپ دادے بھی نہیں جانتے تھے۔ کہو اللہ ہی سکھاتا ہے۔ پھر اُن کو چھوڑ دے تا کہ لغو باتوں میں لگے رہیں۔

یہ منکرینِ کلام کا ردّ کیا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کی مثال دی گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال تھا کہ اور نبیوں سے تو رؤیا وغیرہ کے ذریعہ سے کلام ہوا ہے یا وحی خفی قلبی سے لیکن حضرت موسیٰؑ سے کلام الفاظ میں ہوا۔ چنانچہ گنتی باب ۱۲ آیت ۱، ۲ میں لکھا ہے کہ ہارون اور مریم نے شکوہ کیا کہ موسیٰؑ نے کوشی عورت سے کیوں شادی کی۔ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ حالانکہ خدا جس طرح اس سے باتیں کرتا ہے ہم سے بھی کرتا ہے۔ اِس پر خداوند ناراض ہوا اور انہیں موسیٰؑ سمیت بلوایا اور کہا ''میری باتیں سنو اگر تم میں سے کوئی نبی ہوتا تو مَیں جو خداوند ہوں اپنے تئیں رؤیا میں

اسے معلوم کرواتا اور اس سے خواب میں باتیں کرتا۔ پر میرا بندہ موسیٰؑ ایسا نہیں ہے کہ وہ میرے سارے گھر میں امانت دار ہے۔ مَیں اس سے آمنے سامنے صریح باتیں کرتا ہوں اور نہ کہ پوشیدہ باتیں۔"[۱۱۵]

بنی اسرائیل کے نزدیک اس قسم کا کلام حضرت موسیٰؑ سے پہلے نبیوں کی نسبت سے ہی نہیں ہوا بلکہ بعد میں بھی جو نبی آئے اُن سے بھی یہی فرق کیا جاتا۔ چنانچہ استثنا باب ۳۴ میں حضرت موسیٰؑ کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:-

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰؑ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا۔ جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔"[۱۱۶]

قرآن کریم نے بھی حضرت موسیٰؑ کا کچھ امتیاز تسلیم کیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں نبیوں کے ذکر میں آتا ہے۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا[۱۱۷] اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے خوب اچھی طرح کلام کیا۔ تَكْلِيْمًا آمنے سامنے کلام کرنے کو کہتے ہیں۔ بائبل میں بھی عام طور پر نبیوں کی رؤیا بیان ہوئی ہیں۔ اِس سے آہستہ آہستہ یہود میں بھی جیسا کہ مسلمانوں میں سے بعض میں ہوا یہ خیال پیدا ہو گیا کہ الہام قلبی ہوتا ہے نہ کہ لفظی۔ مسیحی آج تک اِس خیال کی بنا پر قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ موسیٰؑ پر لفظی الہام نازل ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ باقی نبیوں کو چھوڑو۔ موسیٰؑ کی نسبت الفاظ میں وحی کا دعویٰ موجود ہے یا نہیں اور جو حضرت موسیٰؑ کو ماننے والے نہیں ہیں جیسے ہندو اور برہمو سماج والے اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ۔ تم قلبی وحیاں کہتے ہو یہ تو شروع سے چلی ہی آتی ہیں مگر کیا کوئی ایسی وحی ہے جو اس علم کو بیان کرے جو قرآن کریم میں ہے۔ پس اگر باوجود اپنے قلبی القاؤں کے تم قرآنی علوم سے بے بہرہ رہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم نے وہ وہ باتیں سکھا دیں جو تمہارے باپ دادوں کو بھی معلوم نہ تھیں تو تم کس طرح حقیقی الہام کی افضلیت اور ضرورت کا انکار کر سکتے ہو۔

پانچویں اصولی اصلاح خدا تعالیٰ کی خالقیت کے متعلق

پانچویں اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی صفت خالقیت کے متعلق کی۔ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو تو مانتے ہیں لیکن اُسے خالق تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ رُوح اور مادہ آپ ہی آپ پیدا ہو گئے۔ بعض فلاسفروں اور ہندوؤں کا بھی یہی خیال ہے۔ جیسا کہ آریہ کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے اِسے ردّ کیا ہے اور اس کی تردید میں دلیلیں دی ہیں۔ فرمایا۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۱۱۸] یہ خیال کہ رُوح اور مادہ اپنے طور پر ہی چلے آتے ہیں بالکل غلط ہے۔ ہم نے کسی چیز کو مفرد پیدا نہیں کیا بلکہ ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے۔ چنانچہ تم دنیا کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھو تو تمہیں کوئی چیز مفرد نظر نہیں آئے گی۔ سب مرکّبات ہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چیز جہات رکھتی ہے۔ رنگ رکھتی ہے۔ قوام رکھتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے مفردات کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ مرکّبات کو پیدا کیا ہے تو یہ کہنا کہ مادہ ازل سے ہے کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ سائنس نے بھی اِسی کی تائید کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔

(۲) پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ایک ہی خدا ہے اور ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ سوائے اس کے جس پر خدا کی توجہ ہو گئی۔ تم سب اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہاں بتایا کہ ہر چیز تباہ ہو رہی ہے۔ کوئی ایسی چیز دکھاؤ جو ٹوٹتی نہیں۔ جن چیزوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ تباہ نہیں ہوتیں۔ اُن کے متعلق اب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بھی تباہ ہو رہی ہیں اور جن کو اب سمجھتے ہیں کہ تباہ نہیں ہو رہیں ان کے متعلق آئندہ سمجھ لیں گے کہ وہ بھی تباہ ہو رہی ہیں۔ پس ہلاکت بھی ثابت کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں قائم نہیں۔ پھر فرمایا۔ خدا ہر چیز کا حاکم ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب اس نے رُوح اور مادہ کو پیدا ہی نہیں کیا تو ان کے ذریعہ جو چیزیں بنتی ہیں یا بنی ہوئی ہیں اُن کا وہ حاکم کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا تم یہ مانتے ہو یا نہیں کہ خدا رُوح اور مادہ پر حکومت

کرتا ہے اگر یہ مانتے ہو تو کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسی ہستی جو ظالم نہیں ہے بلا وجہ اُن پر حکومت کر رہی ہے حالانکہ اُن کے پیدا کرنے میں اُس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ غرض ہر چیز کا جوڑے کی صورت میں ہونا ان کے نقص پر اور ہلاکت اُن کے مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حکومت اور اس کی طرف رجوع اُس کے خالق ہونے کا ثبوت ہے۔

چھٹی اصولی اصلاح اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے متعلق

چھٹی اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت کے متعلق کی ہے۔ اِس کے بارے میں دو نقص پیدا ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک تناسخ کا عقیدہ ہے جو بڑی شدت سے اختیار کر لیا گیا اور کہا جانے لگا کہ دنیا میں بعض انسان ادنیٰ اور ذلیل حالت میں ہیں اور بعض اچھی حالت میں ہیں۔ یہ فرق ان کے پچھلے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح بعض سُکھ میں ہیں اور بعض دُکھ میں۔ یہ بھی گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے یہ بات غلط ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔[119] جب کافر مرنے لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں خدایا ہمیں پھر دنیا میں واپس لوٹا دے تا کہ ہم جو کچھ چھوڑ آئے ہیں وہ جا کر تیرے راستہ میں لٹا دیں اور نیک اعمال کریں۔ فرمایا یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک کلمہ ہے جو اُن کی زبان سے نکل رہا ہے کیونکہ مجرم جب سوچتا ہے کہ مَیں جہنم میں گیا تو کیا ہو گا تو وہ گھبرا کر کہتا ہے کہ مجھے واپس لوٹا دو۔ اِسی خیال کے ماتحت تناسخ کا عقیدہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں خواہش ایجاد کی ماں ہے۔ تناسخ کا عقیدہ اس گھبراہٹ سے پیدا ہوا ہے کہ اگر بدعمل مرے تو پھر کیا کریں گے۔ درحقیقت یہ جاہل مجرم دماغ کی اختراع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک بات ہے جو اپنے ماحول میں مجرم رُوح کہے گی اور یہ اُس کی ایک طبعی خواہش ہے مگر یہ پوری نہیں کی جا سکتی۔ کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اِس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے کہ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ ۱۲۰ یعنی تو ان سے پوچھ کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے اور کون اس کا مالک ہے۔ اس کا جواب وہ کیا دیں گے۔ تو خود ہی اِن سے کہہ دے کہ اللہ ہی اِس کا مالک ہے۔ اُس نے اپنے نفس پر رحمت فرض کر لی ہے اور اُس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تناسخ کے چکّر میں رُوحوں کو نہیں ڈالے گا بلکہ وہ تم کو قیامت کے دن تک جمع کرتا چلا جائے گا اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے، وہ اپنی بداعمالی کی وجہ سے اس قیامت کے مسئلہ پر یقین نہیں لاتے۔ لَيَجْمَعَنَّكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تناسخ کا رد کیا گیا ہے کیونکہ فرمایا انہیں ہم قیامت تک رکھیں گے اور لوٹائیں گے نہیں۔

اِس میں دلیل یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور مالک کا اختیار ہے کہ جس چیز کو جس مقام پر چاہے رکھے۔ کیا مالک کو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس چمڑے کی جوتی کیوں بنائی۔ پیٹی کیوں نہیں بنائی۔ یا یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کے لٹھے کے ایک ٹکڑے کا پاجامہ اور دوسرے کا کُرتا کیوں بنایا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے تم جو کہتے ہو یہ ظلم ہو گیا کہ ایک کو امیر اور دوسرے کو غریب بنایا۔ تم بتاؤ کہ مَیں ہر چیز کا مالک ہوں یا نہیں اگر مالک ہوں تو مَیں نے جو کام کسی کے سپرد کیا، وہی ٹھیک ہے۔

اِس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پھر اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ خدا جسے چاہے بہشت میں بھیج دے اور جسے چاہے دوزخ میں ڈال دے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مجھے حق حاصل ہے مگر مَیں نے اپنے اُوپر فرض کر لیا ہے کہ مَیں ایسا نہیں کرونگا۔ چنانچہ فرمایا كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اُس نے اپنی جان پر رحمت فرض کر لی ہے اور اس وجہ سے باوجود مالک ہونے کے کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالتا اور یہی سبب ہے کہ وہ مُردوں کو اس دنیا میں واپس نہیں کرتا بلکہ اُس نے فیصلہ کا دن یوم قیامت اور فیصلہ کا طریق دوسرا مقرر کیا ہے اور جب ہم غور کرتے ہیں تو واقعہ میں تناسخ رحم کے خلاف اور حشر رحم کے مطابق نظر آتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح تناسخ کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے رحم میں فرق آتا ہے۔ تناسخ کی غرض اصلاح بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اِس چکّر میں پڑنے سے رُوح کی اصلاح ہو جاتی ہے مگر انسانی اصلاح حقیقت کے علم سے ہوتی ہے۔ جہالت سے نہیں ہو سکتی۔ اب غور کرو تناسخ کے

رو سے انسان کو کوئی حیوان یا پرندہ یا درندہ بنا دینے سے اس کے لئے اصلاح میں آسانی پیدا کرنا ہے یا مشکل۔ انسان کو خدا نے عقل دی۔ دولت دی۔ بھلائی بُرائی کی سمجھ دی بدیوں سے بچنے کی طاقت دی مگر اس نے گناہ کیا۔ اِس پر اُسے بے عقل اور بے وقوف حیوان بنا دیا اور اس طرح اس کے لئے نیکی کرنا اور زیادہ ناممکن کر دیا گیا۔ پس انسان کو انسانیت کی بجائے ادنیٰ حالت میں لے جانا خدا کی رحمت کے بالکل خلاف ہے اور اصلاح سے اُسے دُور کرنا ہے اور اگر انسان ہی بنا کر دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو بھی دو حالتیں ہونگی۔ وہ پہلی زندگی سے واقف ہوگا یا ناواقف اگر واقف ہوگا تو اخفا باقی نہ رہا۔ پھر نجات کوئی معنے نہیں رکھتی کیونکہ اُس پر حقیقت کھل گئی کہ اس وجہ سے مجھے سزا دی گئی تھی اور اگر ناواقف ہوگا تو پھر اصلاح کس طرح کر سکے گا۔ ساری عمر اسی چکّر میں پڑا رہے گا اور ممکن ہے کہ بجائے نیکی کرنے کے بدی میں اَور بڑھ جائے۔

پس رحمت کا طریق وہی ہے جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جو یہ ہے کہ جو نیکیاں کر چکا، اگلے جہان میں اُن نیکیوں کو بڑھنے کا موقع دیا جائے اور جو گناہ کر چکا اُس کے زنگ کو جہنم میں دُور کیا جائے تا کہ کم از کم اُس کی آئندہ نجات کی صورت تو پیدا ہو جائے جونوں کے چکّر میں تو نہ پڑا رہے۔

دوسری چیز جس کی وجہ سے مالکیت کی صفت کے متعلق لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے وہ کفارہ ہے۔ یہ غلطی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صفت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نصاریٰ نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ گناہگار کو بخش دے تو یہ ظلم ہوگا اور وہ کہتے ہیں خدا تعالیٰ چونکہ کسی کا گناہ بخش نہیں سکتا اس لئے اُس نے اپنے بیٹے کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں کے گناہ کے بدلے پھانسی پائے۔ یہ خیال بھی مالکیت کی صفت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ مالک تو جسے چاہے بخش سکتا ہے۔ وہی نہیں بخش سکتا جو مالک نہ ہو۔ ہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام نے تسلیم کیا ہے کہ خدا تعالیٰ بعض گناہ نہ بخشے گا۔ لیکن مالکیت کے ماتحت اس کا بھی علاج ہو جاتا ہے۔ فرماتا ہے۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ [۱۲۱] یعنی وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میری راہ میں تکلیف دی گئی اور وہ لوگ جنہوں نے جنگ کی اور مارے گئے۔ اُن کی بدیوں کے اثر کو اُن سے یقیناً مٹا دوں گا اور جو

دوسرے کا قرضہ ان کے ذمہ ہوگا وہ اپنی طرف سے ادا کر دونگا۔ اِس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے کہ اُن کی طرف سے ہم آپ کفارہ دے دینگے۔ اس کفارہ اور عیسائیوں کے کفارہ میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ عیسائی کہتے ہیں کہ خدا چونکہ معاف نہیں کرسکتا اس لئے اُس نے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔ اسلام کہتا ہے خدا تعالیٰ مالک ہے وہ معاف کرسکتا ہے لیکن وہ کسی دوسرے کا حق ضائع نہیں کرتا خود اجر دے دیتا ہے۔

ساتویں اصولی اصلاح خدا تعالیٰ کی ربوبیتِ عالمین کے متعلق

ساتویں اصولی اصلاح قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت عالمین کے متعلق کی ہے۔ ہر قوم نے خدا تعالیٰ کی ربّ العالمین کی صفت کا انکار کر رکھا تھا اور ہدایت کو صرف اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ حتّٰی کہ مسیحیت جو تبلیغی مذہب ہے اُس نے گو آئندہ کے لئے دروازہ کھولا تھا مگر گذشتہ کے متعلق وہ بھی یہودی مذہب سے ہی ہدایت وابستہ قرار دیتی تھی۔ قرآن کریم نے آئندہ کے لئے تو یہ اعلان کیا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو لوگوں سے کہہ دے کہ مَیں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں اور گذشتہ کے متعلق فرمایا۔ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ۔ ہر قوم میں خدا تعالیٰ کے نبی آتے رہے ہیں۔

(۲) دوسرے بعض قوموں کو بعض پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ایک قوم کو معزز قرار دیا جاتا تھا اور دوسری کو ذلیل ٹھہرایا جاتا۔ چنانچہ ہندوؤں نے برہمن اور شودر کی تقسیم کے ذریعہ اور یہود نے کہانت کو بنی لاوی میں مخصوص کر کے مساوات کو مٹا رکھا تھا۔ اسی طرح بعض قوموں نے بادشاہت کی وجہ سے اپنے آپ کو فضیلت کا حقدار قرار دیا۔ اسلام نے اِسے بھی ربّ العالمین کی صفت کے خلاف قرار دیا اور فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآٮِٕلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ۔ [۱۲۲] کہ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو کئی گروہوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض لوگ بڑے اور بعض چھوٹے

ہیں بلکہ یہ قومیں محض جاننے اور پہچاننے کے لئے بنائی گئی ہیں تا کہ تم میں امتیاز قائم رہے۔ ورنہ تم میں اگر کوئی معزز ہے تو وہی جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے اور اللہ یقیناً بہت علم رکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کون تقویٰ سے کام لے رہا ہے اور کون تکبر اور تفاخر کی راہ اختیار کر رہا ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمدّنی برتری کی وجہ سے دوسروں کو حقیر قرار دینا ناجائز قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اصل فضیلت تقویٰ میں ہے۔ ذات پات اور قومیت کی قیود میں نہیں۔

پھر سیاسی برتری کو بھی اُس نے ردّ کیا اور فرمایا۔ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ [۱۲۳] یعنی فرعون نے اپنے ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا اور اُس کے رہنے والوں کو اُس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ بعض کو کہتا کہ یہ حاکم قوم کے لوگ ہیں اور دوسروں کے متعلق کہتا کہ وہ محکوم قوم کے لوگ ہیں۔ اُس نے بہت بڑے تکبّر سے کام لیا اور وہ مفسدین میں سے تھا۔ ہم نے اس قسم کا کوئی قانون نہیں بنایا کہ کوئی قوم ہمیشہ کے لئے حاکم ہو اور کوئی قوم ہمیشہ کے لئے محکوم ہو۔ جیسے انگریز ہیں ویسے ہی دوسرے لوگ ہیں۔ انگریزوں کو کوئی حق نہیں کہ وہ کہیں ہم ہمیشہ کے لئے حاکم ہیں اور دوسرے ہمیشہ کے لئے محکوم ہیں۔

آٹھویں اصولی اصلاح اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم کے متعلق

آٹھویں اصولی اِصلاح قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ حکیم کے متعلق کی۔ قرآن کریم سے پہلے قریباً ہر مذہب میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ گویا اس دنیا کی پیدائش کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو مُکتی کے قائل تھے۔ بدھ نِروانا کے قائل تھے۔ یہود حکومتوں اور بادشاہتوں کے ملنے کے۔ نصاریٰ موت سے نجات اور امن کے۔ زرتشتی جنّت کے مگر باوجود اس کے ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے دنیا کی پیدائش کا مقصد کہا جا سکے۔ سب محدود مقاصد ہیں جو پیدائش کی حقیقت کو نہیں کھولتے۔ قرآن کریم نے اس سوال کو بھی حل کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ پیدائش عالم کا مقصد یہ ہے کہ انسان جو عالمِ صغیر ہے عرفانِ الٰہی کو حاصل کرے جسے دوسرے لفظوں میں لقا بھی کہتے ہیں کیونکہ جب کوئی چیز اپنے اندر ہوتی ہے تبھی انسان اُسے پہچان سکتا ہے

مثلاً زید بکر کو پہچانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بکر کی تصویر زید کے اندر ہے ورنہ وہ اُسے پہچان نہیں سکتا۔ پس عرفان کے معنے ہیں اللہ اپنے بندے کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک ہندو تو کہتا ہے کہ بندہ خدا میں داخل ہو گیا مگر اس طرح تو انسان کی کوئی حِس ہی باقی نہ رہی۔ پھر اُسے مزا کیا آیا۔ مثلاً ایک گاجر آدمی نے کھالی تو گاجر کو کیا لطف آیا لیکن اسلام کہتا ہے کہ خدا بندہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اس کی حِس قائم رکھتا ہے اور اسلام بتاتا ہے کہ یہ مقصد کسی خاص انسان کے لئے نہیں بلکہ ہر فردِ بشر کو اِس مقام تک پہنچایا جائے گا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ [۲۴] مَیں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ تذلّل کے لئے پیدا کیا ہے تا کہ وہ میرے نقش کو لے لیں اور میری صفات کو اپنے اندر داخل کر لیں مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ بات یعنی خدا تعالیٰ کی لقا کا مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے لئے فرمایا۔ قَالَ عَذَابِيٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی مَیں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مَیں اُسے ہمیشہ عذاب میں رکھوں گا۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے اور اس کے لئے بھی مَیں نے رحمت پیدا کی ہے مگر مومنوں کے لئے تو اُسے فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ مومن جو تقویٰ اختیار کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

غرض بنی نوع انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ خواہ کوئی ہو۔ یہودی ہو، نصرانی ہو، ہندو ہو یا مسلمان ہو جلد یا بدیر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر کے اس کی صفات کو اپنے اندر پیدا کر لے اور یہ وہ مقصد ہے کہ جس میں دنیا کی کوئی قوم اسلام کی شریک نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو صرف اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اُس کے جلال کا مظہر بنے اور اس غرض کے لئے خدا تعالیٰ نے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ اِسی طرح ابو جہل کو پیدا کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تو سیدھا رستہ اختیار کر کے اس مقصد کو پالیا اور ابو جہل کو مار پیٹ کر اس مقصد کی طرف لایا جائے گا۔ بہر حال اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو آگے ہوگا وہ آگے ہی رہے گا اور جو پیچھے چلے گا وہ پیچھے ہی رہے گا۔

۱؎ **الاعراف:**۱۵۷تا۱۵۹ ۲؎**النور:** ۶۴

۳؎ **بخاری کتاب العلم باب مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ**...الخ

۴؎

۵؎ **ترمذی ابواب الاضاحی باب الاذان فی اذن المولود+مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹ المکتب الاسلامی بیروت ۱۴۰۳ھ**

۶؎ **النحل:** ۶۴، ۶۵ ۷؎ **الفرقان:** ۶

۸؎ ۹؎ اقرب الموارد جلد ۲ صفحہ ۹۲۰ زیر لفظ 'فرق' مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء

۱۰؎ **صٓ:**۲ ۱۱؎ **قٓ:** ۱۷ ۱۲؎ **الاخلاص:**۲

۱۳؎**البقرة:** ۹ ۱۴؎ **الجاثية:**۲۵ ۱۵؎ **الجاثية:**۲۸

۱۶؎ **الفرقان:**۱۳۰

۱۷؎ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء

۱۸؎ استثناء باب ۳۳ آیت ۲ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۹؎ فصل الخطاب جلد ۲ صفحہ ۳۸ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۵ھ

۲۰؎ غزل الغزلات باب ۵ آیت ۸ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۲۱؎ غزل الغزلات باب ۵ آیت ۹ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء (مفہومًا)

۲۲؎ غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰ تا ۱۶ برٹش انڈیا فارن سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء (مفہومًا)

۲۳؎ "His Locks are bushy and black as a raven"
(The song of song, Chapter V verse:11, The Holy Bible Victorian street London, 1903.

۲۴؎، ۲۵؎ **شمائل الترمذی باب ما جاء فی خلق رسول اللہ** مطبع مجتبائی دہلی ایڈیشن ۱۳۴۲ھ

۲۶؎ **لسان العرب** زیر لفظ ''شرب'' مطبوعہ بیروت ۱۳۷۶ء

۲۷؎ یسعیاہ باب ۹ آیت ۶، ۷ برٹش اینڈ فارن سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۲۸؎ **الجن:** ۲

۲۹؎ متی باب ۲۱ آیت ۴۲ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۳۰؎ **المجادلة:** ۱۳

۳۱؎

۳۲؎ خروج باب ۷ آیت ا نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۳۳؎ **المزمل:**۱۶ ۳۴؎ **الاحزاب:** ۷

۳۵؎ **الاحزاب:**۴۱ ۳۶؎ **الحج:** ۷۹

۳۷؎ **سیرت ابن هشام عربی** جلد ۴ صفحہ ۵۵ مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی مصر ۱۹۳۶ء میں ''**اذهبوا فانتم الطلقاء**'' کے الفاظ ہیں+**شرح مواهب اللّدنية** جلد ۳ صفحہ ۴۰۲ دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان ایڈیشن ۱۹۹۶ء

۳۸؎ یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۳۹؎ یسعیاہ باب ۵۵ آیت ۴،۵ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء(مفہوماً)

۴۰؎ **الحج:**۷۹ ۴۱؎ **آل عمران:** ۳۲

۴۲؎ یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۲ تا ۵ (مفہوماً)

۴۳؎ یسعیاہ باب ۶۲ آیت ۱۲ (مفہوماً)

۴۴؎ **التوبة:**۱۰۰ ۴۵؎ **الطور:**۲ تا ۷ ۴۶؎ **عبس:**۱۶،۱۷

۴۷؎ **الجمعة:**۳،۴ ۴۸؎ **آل عمران:**۹۸

۴۹؎ حبقوق باب ۳ آیت ۳ سے ۱۸ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۵۰؎ القاموس جلد ۲ زیر حرف ''مُر'' مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۲ھ

۵۱؎ تاج العروس جُزء ۸ صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ مصر ۱۳۰۷ھ

۵۲؎

۵۳؎ **الاحزاب:**۵۷

۵۴؎ حبقوق الاصحاح الثالث آیت ۸ الکتاب المقدس صفحہ ۹۰۳ الطبعة السابعة

بیروت ۱۸۹۴ء

۵۵ بخاری ابواب فضائل المدینة باب کراهیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعری المدینة

۵۶ الاحزاب: ۱۴

۵۷، ۵۸ بخاری ابواب فضائل المدینة باب کراهیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تعری المدینة

۵۹ بخاری ابواب فضائل المدینة باب حرم المدینة

۶۰ شمائل ترمذی باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۶۱ بخاری کتاب الصلوۃ باب جعلت لی الارض مسجدا وطهورا

۶۲ الحشر: ۳ ۶۳ القمر: ۴۶ ۶۴ الطور: ۸ تا ۱۲

۶۵ طٰہٰ: ۱۰۱، ۱۰۰ ۶۶ طٰہٰ: ۱۰۶ تا ۱۰۹ ۶۷ بنی اسرائیل: ۴۳

۶۸ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۱۹ حاشیہ مطبوعہ میمنہ مصر ۱۳۱۳ھ

۶۹ الفتح: ۱۷

۷۰ الاصابة فی تمییز الصحابة الجزء الرابع صفحہ ۳۴۷ مطبعة السعادة بجوار محافظة مصر ۱۳۲۸ھ

۷۱ النساء: ۷۶ ۷۲ النساء: ۸۵ ۷۳ الانفال: ۴۸

۷۴ بخاری کتاب المغازی باب فضل من شهد بدرا

۷۵ شرح مواهب اللدنیة جلد ۲ صفحہ ۲۹۶ مطبوعہ بیروت لبنان ۱۹۹۶ء

۷۶ The Old Testament with a brief commentry by various authors London, Habakkuk Chapter 3 Verse 14

۷۷ متی باب ۲۱ آیت ۱۹ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۷۸ متی باب ۲۱ آیت ۴۰ تا ۴۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۷۹ یوحنا باب ۱۶ آیت ۷ تا ۱۴ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۸۰ الفتح: ۱۱

۸۱ ابو داؤد کتاب الفتن باب مایذکر فی قرن المائۃ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۶ء

۸۲ بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبوۃ

۸۳ فاطر: ۲۵ ۸۴ الزمر: ۵۴ ۸۵ القارعۃ: ۱۰

۸۶ التین: ۵ تا ۷ ۸۷ التوبۃ: ۱۰۳ ۸۸ المائدۃ: ۷۹

۸۹ الفاتحۃ: ۷ ۹۰ الانعام: ۹۲ ۹۱ الانعام: ۸۳

۹۲ بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ لقمان باب لاتشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

۹۳ الانعام: ۹۲ ۹۴ المائدۃ: ۴ ۹۵ النجم: ۴، ۵

۹۶ التوبۃ: ۶ ۹۷ البقرۃ: ۸۸ ۹۸ النساء: ۱۵۸، ۱۵۹

۹۹ لوقا باب ۱۱ آیت ۲ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۰۶ء

۱۰۰ یسعیاہ باب ۹ آیت ۶ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۰۱ متی باب ۲۱ آیت ۴۳ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور ۱۸۷۰ء

۱۰۲ اٰل عمران: ۲۷، ۲۸ ۱۰۳ اٰل عمران: ۱۹۱ تا ۱۹۸

۱۰۴ اٰل عمران: ۲۰۱ ۱۰۵ بخاری کتاب المغازی قول اللہ تعالیٰ و یوم حنین...

۱۰۶ الزمر: ۶۳، ۶۴ ۱۰۷ القصص: ۸۹ ۱۰۸ الحدید: ۴

۱۰۹ الشوریٰ: ۱۲ ۱۱۰ بنی اسرائیل: ۳۷ ۱۱۱ البقرۃ: ۲۵۶

۱۱۲ الانعام: ۷۲ ۱۱۳ الانعام: ۷۴ ۱۱۴ الانعام: ۹۲

۱۱۵ گنتی باب ۱۲ آیت ۶ تا ۸ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۱۶ استثناء باب ۳۴ آیت ۱۰ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لندن مطبوعہ ۱۸۸۷ء

۱۱۷ النساء: ۱۶۵ ۱۱۸ الذّٰریٰت: ۵۰ ۱۱۹ المؤمنون: ۱۰۰، ۱۰۱

۱۲۰ الانعام: ۱۳ ۱۲۱ اٰل عمران: ۱۹۶ ۱۲۲ الحجرات: ۱۴

۱۲۳ القصص: ۵ ۱۲۴ الذّٰریٰت: ۵۷

فضائل القرآن

نمبر......٦

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ترتیبِ قرآن کا مسئلہ اور استعارات کی حقیقت

اِستعارات اور تشبیہات سے پیدا شُدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کا طریق

(تقریر فرمودہ ۲۸؍ دسمبر ۱۹۳۶ء برموقع جلسہ سالانہ)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد درج ذیل آیات تلاوت فرمائیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ○ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ○ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ○ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ○ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ○ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ○ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ○[1]

اس کے بعد فرمایا:-

میرا آج کا مضمون پھر اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو تین سال پہلے میں بیان کر رہا تھا یعنی فضائل القرآن۔ درمیان میں تین سال اِس میں ناغہ ہو گیا کیونکہ رمضان کی وجہ سے لمبی تقریر نہیں کی جا سکتی تھی۔ اِس دفعہ بھی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مَیں لمبی تقریر نہیں کر سکتا چونکہ میں اِس مضمون کے بیان کرنے کا ارادہ کر چکا تھا اِس لئے مَیں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس مضمون کا کوئی حصہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

قرآن کریم کے سِوا اور کسی کتاب کو اَفْضَلُ الْکُتُب ہونے کا دعویٰ نہیں

تمام مذاہب جو دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ اپنی فضیلت اور برتری کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ اپنی مذہبی کتب کے متعلق بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ اَفْضَلُ الْکُتُب ہیں لیکن اُن کی کتب کو یہ دعویٰ نہیں۔ مَیں نے آج تک سوائے قرآن کریم کے کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جس میں یہ لکھا ہو کہ وہ دوسری مذہبی کتب سے افضل ہے۔ ہاں قرآن کریم بے شک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تمام الہامی کتابوں پر فضیلت رکھتا ہے مگر یہ کہ وہ کس طرح افضل ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب دینا مسلمانوں کے ذمّے ہے۔ غیر مذاہب والے یا تو قرآن پڑھتے نہیں یا بوجہ اِس کے کہ قرآن تعصب کی نگاہ سے پڑھتے ہیں صاف دل ہو کر اس کا مطالعہ نہیں کرتے یا بوجہ اس کے کہ وہ قلب مطہر نہیں رکھتے اور قرآن فرماتا ہے کہ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[2] میرے مطالب اور معانی مطہر قلوب پر ہی کُھل سکتے ہیں، قرآن کریم کے مطالب اُن پر نہیں کُھلتے۔ پس یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن تک قرآن کریم کے مطالب پہنچائیں اور ثابت کریں کہ قرآن کریم نہ صرف ایک اعلیٰ کتاب ہے بلکہ وہ ساری الہامی کتابوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں پانچ لیکچر مَیں پہلے دے چکا

ہوں۔ ایک ۱۹۲۸ء میں تمہیدی طور پر مَیں نے دیا تھا مگر اُس وقت طبیعت بہت علیل تھی اس لئے صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی میں نے بعض باتیں بیان کی تھیں۔ پھر ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں چار تفصیلی لیکچر مَیں نے فضائل القرآن پر دیئے گو بعض اُس وقت بھی چھوڑنے پڑے تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک کتاب براہین احمدیہ لکھی ہے۔ اس میں آپ نے اپنے اِس ارادہ کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلام کی سچائی اور برتری ثابت کرنے کے لئے مَیں تین سَو دلائل دوں گا۔ مَیں نے جب اس مضمون پر غور کیا تو گو میں نے دلائل کو گِنا نہیں مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اسلام کی برتری اور فضیلت کے تین سَو دلائل ان نوٹس میں موجود ہیں جو مَیں نے اِس مضمون کے سلسلہ میں تیار کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص میرے اِن نوٹوں کو پڑھ لے تو میں سمجھتا ہوں بہت سی باتیں اُس پر واضح ہو جائیں گی۔ یہ مَیں اس لئے کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ مَیں اِس مضمون کو مکمل بیان کر سکوں یا نہ کر سکوں اس لئے میں نے ذکر کر دیا ہے۔ یہ تمام مصالحہ نہایت اختصار کے ساتھ بلکہ بعض جگہ محض اشارات میں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں مَیں نے جمع کر دیا تھا اور جلسہ سالانہ کے موقع پر انہیں بیان بھی کر دیا تھا۔ مجھے اُن دلائل کی تعداد تو یاد نہیں جو بیان کر چکا ہوں اس لئے میں نمبر کا نام نہیں لے سکتا صرف ضمناً بغیر نمبر دینے کے مَیں آج فضیلتِ قرآن کے ایک خاص پہلو کا ذکر کر دیتا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اِس مضمون کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی تو اوّل تو یہ قرآن کریم کی تفسیر کا ایک نہایت اعلیٰ دیباچہ ہوگا دوسرے براہین احمدیہ کی تکمیل بھی ہو جائے گی۔ یعنی اُس رنگ میں جس کا شروع میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اظہار فرمایا تھا گو بعد میں اس کی تکمیل اور رنگ میں بھی ہوگئی یعنی وحی اور الہام اور آپ کی ماموریت اور نبوت کی شان نے اسلام کو جس رنگ میں تمام مذاہب پر غالب ثابت کیا وہ تین سَو دلائل کے اثر سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود بھی تحریر فرما دیا تھا کہ اب یہ سلسلہ تالیفِ کتاب بوجہ الہاماتِ الٰہیہ دوسرا رنگ پکڑ گیا ہے اور اب ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں بلکہ جس طرز پر خدا تعالیٰ مناسب سمجھے گا بغیر لحاظ پہلی شرائط کے اس کو انجام دے گا کیونکہ اَب اِس کتاب کا وہ خود متولّی ہے اور اُس کی مشیّت کسی اَور رنگ میں اِس کی تکمیل

چاہتی ہے لیکن اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ پہلی خواہش بھی پوری ہو جائے تو دشمنوں کا یہ اعتراض مٹ جاتا ہے کہ آپ نے براہین احمدیہ کو مکمل نہیں کیا اور وعدہ کے باوجود قرآن کریم کی فضیلت کے تین سو دلائل پیش نہیں کئے۔

براہین احمدیہ اور مولوی چراغ علی صاحب حیدرآبادی

آج کل تو ''زمیندار'' اور ''احسان'' وغیرہ مخالف اخبارات یہ بھی لکھتے رہتے ہیں کہ کوئی مولوی چراغ علی صاحب حیدرآبادی تھے وہ آپ کو یہ مضامین لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ جب تک اُن کی طرف سے مضامین کا سلسلہ جاری رہا آپ بھی کتاب لکھتے رہے مگر جب انہوں نے مضمون بھیجنے بند کر دیئے تو آپ کی کتاب بھی ختم ہوگئی۔ گو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی چراغ علی صاحب کو کیا ہو گیا کہ اُنہیں جو اچھا نکتہ سوجھتا وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لکھ کر بھیج دیتے اور اِدھر اُدھر کی معمولی باتیں اپنے پاس رکھتے۔ آخر مولوی چراغ علی صاحب مصنّف ہیں۔ براہین احمدیہ کے مقابلہ میں اُن کی کتابیں رکھ کر دیکھ لیا جائے کہ آیا کوئی بھی ان میں نسبت ہے؟ پھر وجہ کیا ہے کہ دوسرے کو تو ایسا مضمون لکھ کر دے سکتے تھے جس کی کوئی نظیر ہی نہیں ملتی اور جب اپنے نام پر کوئی مضمون شائع کرنا چاہتے تو اُس میں وہ بات ہی پیدا نہ ہوتی۔ پس اوّل تو انہیں ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مضمون لکھ لکھ کر بھیجتے؟ اور اگر بھیجتے تو عُمدہ چیز اپنے پاس رکھتے اور معمولی چیز دوسرے کو دے دیتے۔ جیسے ذوقؔ کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ ظفرؔ کو نظمیں لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے مگر ''دیوانِ ذوق'' اور ''دیوانِ ظفر'' آج کل دونوں پائے جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر صاف نظر آتا ہے کہ ذوقؔ کے کلام میں جو فصاحت اور بلاغت ہے وہ ظفرؔ کے کلام میں نہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ ظفر کو کوئی چیز دیتے بھی تھے تو اپنی بچی ہوئی دیتے تھے اعلیٰ چیز نہیں دیتے تھے حالانکہ ظفر بادشاہ تھا۔ غرض ہر معمولی عقل والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر مولوی چراغ علی صاحب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مضامین بھیجا کرتے تھے تو انہیں چاہئے تھا کہ معرفت کے عُمدہ عُمدہ نکتے اپنے پاس رکھتے اور معمولی علم کی باتیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لکھ کر بھیجتے مگر مولوی چراغ علی صاحب کی کتابیں بھی موجود ہیں اور حضرت مسیح

موعود علیہ السلام کی کتابیں بھی۔ انہیں ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر دیکھ لو کوئی بھی ان میں نسبت ہے؟ انہوں نے تو اپنی کتابوں میں صرف بائیبل کے حوالے جمع کئے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم کے وہ معارف پیش کئے ہیں جو تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کو نہیں سوجھے اور ان معارف اور علوم کا سینکڑواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی ان کی کتابوں میں نہیں۔

الہامی کتاب کے سمجھنے میں ایک دِقّت

میرا آج کا مضمون اِس بات پر ہے کہ ہر الہامی کتاب میں بعض ایسے مُشکل مضامین ہوتے ہیں جن کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شُبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ آسانی سے حل نہیں ہوتے یا ان کے متعلق آپس میں بحث شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے اِس کا یہ مطلب ہے اور کوئی کہتا ہے اِس کا وہ مطلب ہے۔ ایسی صاف بات نہیں ہوتی جیسے مثلاً یہ حکم ہے کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ نماز قائم کرو۔ جو شخص عربی جانتا اور اسلام سے واقفیت رکھتا ہے وہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ سنتے ہی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز قائم کرو۔ یہ جھگڑا پیدا نہیں ہوتا کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ سے مراد نماز نہیں روزہ ہے یا روزہ نہیں حج ہے۔ آگے نماز کی کیفیات میں فرق ہو سکتا ہے، خشوع خضوع میں فرق ہو سکتا ہے، عرفان میں فرق ہو سکتا ہے مگر اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز قائم کرو بلکہ جونہی کسی کے منہ سے یہ فقرہ نکلے گا کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ یا قرآن کریم میں یہ حکم دیکھے گا فوراً سمجھ جائے گا کہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نمازیں پڑھو مگر جو مشکل مسائل ہوتے ہیں اُن کو بعض لوگ سمجھتے ہیں اور بعض نہیں سمجھتے اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ جو باخبر ہیں اُنہیں وہ مسائل سمجھائیں۔ خواہ اِس وجہ سے کہ وہ خود غور نہیں کرتے یا اِس وجہ سے کہ ان کا دل کسی گناہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا فضل جذب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ مشکل مضامین بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں ایک علمی مضامین جو باریک فلسفے پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً توحید ہے اس کا اتنا حصہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا ایک ہے مگر آگے یہ صوفیانہ باریکیاں کہ کس طرح انسان کے ہر فعل پر خدا تعالیٰ کی توحید کا اثر پڑتا ہے اس کے لئے ایک عارف کی ضرورت ہوگی اور یہ مسائل دوسرے کو سمجھانے کے لئے کوئی عالم درکار ہوگا۔ ہر شخص یہ باریکیاں نہیں نکال سکتا لیکن

اتنی بات ضرور سمجھ لے گا کہ قرآن دوسرے خدا کا قائل نہیں۔ دوسرے یہ مشکلات ایسے مطالب کے متعلق پیدا ہوتی ہیں جو علمی تو نہ ہو مگر وہ اُس زبان میں بیان کئے گئے ہوں جسے تشبیہ اور استعارہ کہتے ہیں۔

استعارات کو حقیقت قرار دینے کا نتیجہ

استعارہ میں جب بھی بات کی جائے تو گو وہ باریک نہیں ہوتی مگر عوام الناس اُس زبان کو نہ جاننے کی وجہ سے اس کے ایسے معنی کر لیتے ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ جب شام کی جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو سالارِ لشکر بنا کر بھیجا اور فرمایا کہ اگر زید مارے جائیں تو جعفر بن ابی طالب کمان لے لیں اور اگر جعفر مارے جائیں تو عبداللہ بن رواحہ کمان لے لیں تو جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ویسا ہی وقوع میں آیا اور حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ تینوں شہید ہو گئے اور حضرت خالد بن ولیدؓ لشکر کو اپنی کمان میں لے کر بحفاظت اُسے واپس لے آئے۔ جس وقت مدینہ میں یہ خبر پہنچی تو جن عورتوں کے خاوند مارے گئے تھے یا جن والدین کے بچے اِس جنگ میں شہید ہوئے تھے اُنہوں نے جس حد تک کہ شریعت اجازت دیتی ہے رونا شروع کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اظہارِ افسوس کے لئے نہ اس لئے کہ عورتیں جمع ہو کر رونا شروع کر دیں فرمایا۔ جعفرؓ پر تو کوئی رونے والا نہیں۔ میرے نزدیک اِس فقرہ سے آپ کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ کوئی جعفر کو روئے بلکہ مطلب یہ تھا کہ ہمارا بھائی بھی آخر اِس جنگ میں مارا گیا ہے جب ہم نہیں روئے تو تمہیں بھی صبر کرنا چاہئے کیونکہ حضرت جعفرؓ کے رشتہ دار وہاں یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے یا حضرت علیؓ تھے اور یہ جس پایہ کے آدمی تھے اس کے لحاظ سے ان کی چیخیں نہیں نکل سکتی تھیں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً اس بات کے اظہار کے لئے کہ میرا بھائی جعفرؓ بھی مارا گیا ہے مگر مَیں نہیں رویا فرمایا جعفرؓ پر تو کوئی رونے والا نہیں۔ انصار نے جب یہ بات سُنی تو چونکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو پورا کرنے کا بے حد شوق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے اپنے گھر جا کر عورتوں سے کہنا شروع کیا کہ یہاں رونا

دھونا چھوڑ دو اور جعفرؓ کے گھر چل کر روؤ۔ چنانچہ سب عورتیں حضرت جعفرؓ کے گھر میں اکٹھی ہوگئیں اور سب نے ایک کہرام مچا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آواز سُنی تو فرمایا کیا ہوا؟ انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے جو فرمایا تھا کہ جعفرؓ پر کوئی رونے والا نہیں اس لئے ہم نے اپنی عورتیں حضرت جعفرؓ کے گھر بھیج دی ہیں اور وہ رو رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ جاؤ انہیں منع کرو۔ چنانچہ ایک شخص گیا اور اُس نے انہیں منع کیا۔ وہ کہنے لگیں تم ہمیں کون روکنے والے ہو؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو آج افسوس کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جعفرؓ کو رونے والا کوئی نہیں اور تُو ہمیں منع کرتا ہے۔ وہ یہ جواب سُن کر پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کیونکہ بعض لوگوں کو دوسروں کی ذرا ذرا سی بات پہنچانے کا شوق ہوتا ہے اور عرض کیا وہ مانتی نہیں۔ آپ نے فرمایا اُن کے سروں پر مٹی ڈالو۔ مطلب یہ تھا کہ چھوڑو اور اُنہیں کچھ نہ کہو۔ خود ہی رو دھو کر خاموش ہو جائیں گی مگر اُس کو خدا دے اُس نے اپنی چادر میں مٹی بھر لی اور اُن عورتوں کے سَروں پر ڈالنی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا پاگل کیا کرتا ہے؟ وہ کہنے لگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مٹی ڈالو۔ اس لئے مَیں تو ضرور ڈالوں گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اُسے ڈانٹا اور فرمایا تُو بات کو تو سمجھا ہی نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تو یہ تھا کہ اُن کا ذکر چھوڑو اور جانے دو۔ [3] وہ خود ہی خاموش ہو جائیں گی۔ یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم مٹی ڈالنا شروع کر دو۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک استعارۃً کلام تھا مگر وہ واقعہ میں مٹی ڈالنے لگ گیا۔ تو بعض دفعہ لوگ استعارہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بعض دفعہ لفظی معنے ایسے لے لیتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہوتے ہیں اور اس طرح بات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے۔

خیطِ ابیض اور خیطِ اَسود کا غلط مفہوم

میں نے یہ عرب کی مثال آپ لوگوں کے سامنے پیش کی ہے۔ اب میں پنجاب کی ایک مثال دے دیتا ہوں۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ سحری کا وقت اُس وقت تک ہے جب تک سفید دھاگا سیاہ دھاگا سے الگ نظر نہیں آتا۔ یہ ایک استعارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک پَو پھٹ نہ

جائے کھاتے پیتے رہو مگر پنجاب میں بہت سے زمیندار رمضان کی راتوں میں سفید اور سیاہ دھاگا اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور چونکہ دھاگا اچھی روشنی میں نظر آتا ہے اس لئے وہ دن چڑھے تک خوب کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ اب یہ اسی استعارہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور چونکہ بعض لوگوں کی نگاہ نسبتاً کمزور ہوتی ہے اس لئے ممکن ہے وہ دن چڑھنے کے بعد بھی اس آیت کی رُو سے کھانے پینے کا جواز ثابت کرلیں کیونکہ انہیں سورج کی روشنی میں ہی اِس فرق کا پتہ لگ سکتا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب جب اپنے طالب علمی کے زمانہ میں لاہور پڑھتے تھے تو ایک احمدی دوست کے گھر پر رہتے تھے۔ رمضان کے دن تھے۔ ایک رات انہوں نے یہ خیال کرکے کہ یہ بچہ ہے اُسے کیا جگانا ہے روزے کے لئے نہ جگایا مگر میر صاحب کو جیسا کہ بچوں کا عام طریق ہے روزے رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن کی آنکھ ایسے وقت میں کھلی جب کہ سحری کا وقت گذر چکا تھا اور روشنی پھیل گئی تھی۔ اِدھر گھر کے مالک کو خیال آیا کہ ان کا دل میلا ہوگا انہیں روٹی کھلا دینی چاہئے۔ چنانچہ میر صاحب دروازہ کھولنے لگے تو وہ کہنے لگا ہیں! ہیں! کھولنا نہیں روشنی آئے گی مَیں اندر سے کھانا پکڑا دیتا ہوں۔

انبیاء کی پیشگوئیوں میں بھی استعارات پائے جاتے ہیں

غرض بعض لوگ استعارہ کے اس طرز پر معنی کرتے ہیں کہ اس کو حقیقت بنا لیتے ہیں اور پھر اس کا کچھ کا کچھ مفہوم ہو جاتا ہے اور الہامی کتابوں میں تو بالخصوص بہت مشکل پیش آتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اس کی کسی آیت کے دوسرے معنی ہم نہیں کرنے دیں گے۔ اسی طرح نبیوں کی پیشگوئیوں میں استعارات پائے جاتے ہیں بلکہ ہر انسان روزانہ استعارے استعمال کرتا ہے مگر نبیوں کے کلام میں جب کوئی استعارہ آجائے گا تو لوگ کہیں گے کہ ہم اس کے کوئی اور معنی نہیں کرنے دیں گے ورنہ یہ ثابت ہوگا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ نبی بھی جھوٹ بولتے ہیں بلکہ خدا اور اُس کے انبیاء کا کلام تو الگ رہا لوگ بزرگوں کے کلام میں بھی انتہا درجہ کی سختی سے کام لیتے ہیں اور اُن کے استعارات کو سمجھنے کی بجائے حقیقت قرار دیتے ہیں۔

ایک لطیفہ

ہمارے شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی نے ''سِلکِ مروارید'' نام سے ایک ناول لکھا ہے جس میں قصہ کے طور پر ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو بڑی بڑی بحثیں کرتی اور مولویوں کا ناطقہ بند کر دیتی تھی۔ ہماری کاٹھگڑھ کی جماعت کے ایک دوست تھے انہوں نے یہ کتاب پڑھی تو ایک دفعہ جب کہ جلسہ سالانہ کے ایام تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام یا حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کا زمانہ تھا، دوستوں نے اُن سے پوچھا کہ کیوں بھئی! جلسہ پر چلو گے؟ انہوں نے کہا اب کے تو کہیں اور جانے کا ارادہ ہے۔ انہوں نے پوچھا کہاں جاؤ گے؟ تو پہلے تو انہوں نے نہ بتایا مگر آخر اصرار پر کہا کہ اِس دفعہ میرا ارادہ سہارنپور جانے کا ہے کیونکہ وہاں ایک بڑی بزرگ اور عاملہ عورت رہتی ہیں جن کا ذکر ''سِلکِ مروارید'' میں ہے اُن کی زیارت کا شوق ہے۔ (شیخ یعقوب علی صاحب نے ناول میں لکھا تھا کہ وہ سہارنپور کی ہیں) انہوں نے کہا۔ نیک بخت! وہ تو شیخ صاحب نے ایک ناول لکھا ہے جس میں فرضی طور پر سہارنپور کی ایک عورت کا ذکر کیا ہے یہ تو نہیں کہ سہارنپور میں واقعہ میں کوئی ایسی عورت رہتی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ اچھا! تم شیخ یعقوب علی صاحب کو جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی ہیں جھوٹا سمجھتے ہو۔ وہ کہنے لگے کہ اِس میں جھوٹا سمجھنے کی کیا بات ہے وہ تو ایک قصہ ہے اور قصوں میں بات اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ وہ دوست کہتے ہیں کہ پہلے تو اُسے ہماری بات پر یقین نہ آیا مگر جب ہم نے بار بار اُسے یقین دلایا تو کہنے لگا اچھا! یہ بات ہے؟ مجھے قادیان پہنچنے دو۔ میں جاتے ہی حضرت صاحب سے کہوں گا کہ ایسے جھوٹے شخص کو ایک منٹ کے لئے بھی جماعت میں نہ رہنے دیں فوراً خارج کر دیں۔ میں تو پیسے جمع کر کر کے تھک گیا اور میرا پختہ ارادہ تھا کہ سہارنپور جاؤں گا مگر اب معلوم ہوا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اب اس بیچارے کے لئے یہی سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ایسی عورت کوئی نہیں یہ ایک فرضی قصہ ہے جو اس لئے بنایا گیا ہے کہ تا وہ لوگ جو قصے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں وہ اس رنگ میں احمدیت کے مسائل سے واقف ہو جائیں۔

استعارات کو نہ سمجھنے والے طبقہ کی ذہنیت

غرض مذہبی کتابوں میں یہ مشکل ہوتی ہے کہ جہاں کوئی استعارہ آیا وہاں ایک طبقہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ہم آگے چلنے نہیں دیں گے جب تک تم اِس بات کو اُنہی الفاظ میں تسلیم نہ کرو جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں۔ دودھ کی نہروں کا ذکر آجائے تو جب تک وہ یہ تسلیم نہ کرلیں کہ منٹگمری اور لاہور اور شیخوپورہ کی بھینسیں خدا تعالیٰ نے رکھی ہوئی ہونگی انہیں دودھ کی نہروں کا یقین ہی نہیں آتا۔ کیلے کا ذکر آجائے تو جب تک بمبئی کا کیلا جنت میں نہ مانیں اُن کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ شراب کا ذکر آجائے تو گو وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ جنت کی شراب زیادہ صاف ہوگی مگر یہ نہیں مانیں گے کہ شراب سے مراد کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے اور اگر حور وغلمان کا ذکر آجائے تو پھر تو ان کے منہ سے رالیں ٹپک پڑتی ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ میں مدارس دیکھنے کے لئے لکھنؤ گیا۔ اتفاقاً وہاں ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا۔ مَیں بھی جلسہ دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ ایک مولوی عبدالکریم صاحب پروفیسر تھے۔ اُن کی تقریر اُس وقت نماز کی خوبیوں کے متعلق تھی۔ سامعین اگرچہ کم تھے مگر اُن میں سے اکثر مسلمان تھے اور وہ بھی مولوی طرز کے۔ ایک مسلمان بیرسٹر بھی شریک تھے جو میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب نے تقریر شروع کی اور کہا کہ لوگو! نماز پڑھنی چاہئے۔ نماز کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو جنت ملتی ہے اور جنت کیا ہوتی ہے؟ اس کے بعد انہوں نے جنت کی جو کیفیت بیان کرنی شروع کی اُس کا ذکر میرے لئے ناممکن ہے۔ اس کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا مَیں بیان کر دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا وہاں بہترین شکل کی خوبصورت تصویریں ہونگی اور جس تصویر کو دیکھ کر انسان کا دل للچائے گا وہ فوراً خوبصورت عورت بن جائے گی اور پھر مرد و عورت کے تعلقات شروع ہو جائیں گے اور ان تعلقات کا جنت کی طرح اختتام نہیں ہوگا۔ یہ نقص اس بات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے قرآن میں دو چار لفظ حور کے پڑھ لئے اور نتیجہ نکال لیا کہ جو کچھ یہاں ہے وہی کچھ وہاں بھی ہوگا۔ میرے پاس جو بیرسٹر بیٹھے تھے وہ کہنے لگے اچھا ہوا یہ لیکچر رات کو رکھا گیا اگر دن کو رکھا جاتا اور لوگ زیادہ تعداد میں شامل ہو جاتے تو ہماری بڑی ذلت ہوتی۔ تو الہامی

کتابوں میں خصوصًا یہ مشکل پیش آتی ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس میں جو تشبیہ یا استعارہ استعمال ہوا ہے وہ حقیقت ہے، اس کے دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

علمی مضامین کے سمجھنے میں عوام کی مشکلات

اسی طرح الہامی کتابوں کے اعلیٰ علمی مضامین کا سمجھنا بھی عام لوگوں کے لئے بڑا مشکل ہوتا ہے جس کی کئی وجوہ ہیں۔

اوّل الہامی کتابوں کی ترتیب عام کتابوں سے جُدا ہوتی ہے۔ عام کتابوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ مثلاً پہلے مسائلِ وضو بیان کئے جائیں گے پھر مسائلِ عبادت بیان کئے جائیں گے پھر ایک باب میں مسائلِ نکاح بیان کئے جائیں گے اسی طرح کسی باب میں طلاق اور خلع کا اور کسی میں کسی اور چیز کا ذکر ہوگا اور جس جگہ مسائل بیان ہونگے اکٹھے ہونگے مگر الہامی کتابوں میں یہ رنگ نہیں ہوتا اور اُن کی ترتیب بالکل اور قسم کی ہوتی ہے جو دُنیوی کتب کی ترتیب سے نرالی ہوتی ہے یہاں تک کہ جاہل لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہے ہی نہیں۔

الہامی کتب کی نرالی ترتیب میں حکمتیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ الہامی کتابوں میں دنیا کی تمام کتابوں سے نرالی ترتیب کیوں رکھی جاتی ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس میں بھی کئی حکمتیں ہیں۔

(الف) اِس ترتیب سے سارے کلام سے دلچسپی پیدا کرانی مدِّ نظر ہوتی ہے۔ اگر الہامی کتاب کی ترتیب اُسی طرح ہو جس طرح مثلاً قدوری کی ترتیب ہے کہ وضو کے مسائل یہ ہیں، نکاح کے مسائل وہ، تو عام لوگ اپنے مذاق کے مطابق اُنہی حصوں کو الگ کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیتے اور باقی قرآن کو نہ پڑھتے مگر اب اللہ تعالیٰ نے سارے مسائل کو اس طرح پھیلا کر رکھ دیا ہے کہ جب تک انسان سارے قرآن کو نہ پڑھ لے مکمل علم اُسے حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

(ب) لوگوں کو غور و فکر کی عادت ڈالنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب اختیار کی ہے۔ اگر عام کتابوں کی طرح اس میں مسائل بیان کر دیئے جاتے تو لوگوں کا ذہن اِس طرف منتقل نہ ہوتا

کہ ان مسائل کے باریک مطالب بھی ہیں۔ وہ صرف سطحی نظر رکھتے اور غور وفکر سے محروم رہتے مگر اب اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کو اس طرح پھیلا دیا اور ایک دوسرے میں داخل کر دیا ہے کہ انسان کو ان کے نکالنے کے لئے غور وفکر کرنا پڑتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سمندر ہے۔

(ج) یہ ترتیب اس لئے بھی اختیار کی گئی ہے تا خشیت الٰہی پیدا ہو کیونکہ خشیت الٰہی پیدا کرنے کے لئے یہ ترتیب ضروری تھی۔ مثلاً اگر یوں مسائل بیان ہوتے کہ وضو یوں کرو، کُلّی اس طرح کرو، عبادت اس طرح کرو، اتنی رکعتیں پڑھو تو خشیت الٰہی پیدا نہ ہوتی۔ جیسے عبادت وغیرہ کے تمام مسائل قدوری اور ہدایہ وغیرہ میں بھی مذکور ہیں مگر قدوری اور ہدایہ پڑھ کر کوئی خشیتُ اللہ پیدا نہیں ہوتی لیکن وہی مسئلہ جب قرآن میں آتا ہے تو انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن ان مسائل کو خشیتُ اللہ کا ایک جزو بنا کر بیان کرتا ہے الگ نہیں اور دراصل نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ مسائل کا اصل مقصد تقویٰ ہی ہے۔ پس قرآن تقویٰ کو مقدم رکھتا ہے تا جب انسان کو یہ کہا جائے کہ وضو کرو تو وہ وضو کرنے کے لئے پہلے ہی تیار ہو۔ اسی طرح جب کہا جائے کہ نماز پڑھو تو انسان نماز پڑھنے کے لئے پہلے ہی تیار ہو۔ اگر قرآن میں نماز کا الگ باب ہوتا تو اُسے پڑھ کر خشیت اللہ پیدا نہ ہوتی۔ پس الہامی کتاب چونکہ اصلاح کو مقدم رکھتی ہے اس لئے وہ سطحی ترتیب کو چھوڑ کر ایک نئی ترتیب پیدا کرتی ہے جو جذباتی ہوتی ہے۔ یعنی قلب میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں الہامی کتاب اُن کا ذکر کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ وضو کے بعد نماز کا ذکر کرے بلکہ وہ وضو سے روحانیت، طہارت اور خدا تعالیٰ کے قُرب کی طرف انسان کو متوجہ کرے گی کیونکہ وضو سے طہارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں پھر جب نماز کا مسئلہ آئے گا تو یہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے مسائل بیان کرنا شروع کر دے بلکہ سجدہ اور رکوع کے ذکر سے جو جذبات انسانی قلب میں پیدا ہوتے ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ اُسے اپنی طرف متوجہ کرے گا تا جو جذبات بھی انسان کے اندر پیدا ہوں اُن سے وہ ایسا اثر لے جو اُسے خدا تعالیٰ کے قریب کر دے۔

قلبی واردات کی دو مثالیں

پس ترتیبِ قرآن ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ قلب کے جذبات کی لہروں پر مبنی ہے اور یہ لہریں

مختلف ہوتی ہیں۔ میں اِس کے متعلق دو مثالیں دے دیتا ہوں۔ ایک اچھی اور ایک بُری۔ کہتے ہیں کسی مسجد کا مُلاّ ایک دن جماعت کرانے لگا تو اُس نے دیکھا کہ مقتدی آسودہ حال ہیں۔ اِس پر نماز میں ہی اسے خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ مجھے تحفے تحائف دیں تو میرے پاس بڑا مال اکٹھا ہو جائے۔ پھر جب مال جمع ہو گیا تو میں اُس سے تجارتی سامان خریدوں گا اور خوب تجارت کروں گا۔ کبھی دلّی میں اپنی اشیاء لے جاؤں گا کبھی کلکتے چیزیں لے جاؤں گا۔ غرض اِسی طرح وہ خیالات دَوڑاتا چلا گیا۔ پھر ہندوستان اور بخارا کے درمیان اُس نے تجارت کی سکیم بنانی شروع کر دی۔ اب بظاہر وہ رکوع اور سجدہ کر رہا تھا مگر خیالات کہیں کے کہیں تھے۔ ایک بزرگ بھی اُن مقتدیوں میں شامل تھے۔ اُن پر کشفی حالت طاری ہوئی اور اُنہیں امام کے تمام خیالات بتا دیئے گئے۔ اِس پر وہ نماز توڑ کر الگ ہو گئے۔ جب اُس مُلاّ نے نماز ختم کی تو وہ اُن پر ناراض ہوا اور کہنے لگا۔ تمہیں یہ مسئلہ معلوم نہیں کہ نماز امام کے پیچھے پڑھا کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے مسئلہ تو مجھے معلوم ہے مگر میری صحت کچھ کمزور ہے میں آپ کے ساتھ چلا اور دلّی تک گیا۔ پھر دلّی سے بخارا گیا اور میں تھک کر رہ گیا اور چونکہ اتنے لمبے سفر کی میں برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لئے آپ سے الگ ہو گیا۔ اس پر وہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔

اب یہ بیہودہ خیالات تھے جو اُس کے دل میں پیدا ہوئے مگر ان خیالات میں بھی وہی ترتیب رہی جو اس کے جذباتِ قلب پر مبنی تھی۔ یہی حال نیک خیالات کا ہے اور وہ بھی اسی رنگ میں پیدا ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہوگا کہ مثلاً تم سجدہ میں گئے ہو اور تم سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی کہتے ہو تو اُس وقت تمہارا دل بھی حاضر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سبوحیّت کا نقشہ تمہارے سامنے آنے لگتا ہے۔ اُس وقت گو تمہارے منہ سے دوسری اور تیسری دفعہ بھی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی نکل رہا ہوتا ہے مگر تمہارا دل پہلے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی کو ہی چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے ہو اور اُس وقت تمہارا دل حاضر ہوتا ہے تو اُس وقت حمد کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے احسانات تمہارے سامنے یکے بعد دیگرے آنے شروع ہو جاتے ہیں اور تم انہی احسانات کی یاد میں محو ہو جاتے ہو۔ اب اگر ایسی حالت میں تم کسی کے پیچھے نماز پڑھ رہے تو گو تم اُس کی اقتدا میں کبھی سجدہ کرو گے، کبھی رکوع میں جاؤ گے اور منہ سے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وغیرہ بھی کہو گے مگر تمہارے دل پر حمد ہی جاری ہو گی۔ تو

قلوب پر بعض روحانی واردات آتی ہیں اور وہی حقیقی نماز ہوتی ہے۔ اُس وقت انسان گو الفاظ منہ سے نکال رہا ہوتا ہے مگر اُس کے جذبات روحانیت کے لحاظ سے ایک خاص رستہ پر چل رہے ہوتے ہیں۔ پس وہ واردات جو انسانِ مومن پر آتی ہیں قرآن کریم کی ترتیب ان پر مبنی ہے۔ وہ نماز کے بعد روزہ کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری یہ ہدایت پڑھنے کے بعد کیا کیا خیالات انسان کے اندر پیدا ہونگے۔ پس وہ خیالات جو اس کے نتیجہ میں انسانی قلب میں پیدا ہو سکتے ہیں قرآن کریم ان کو بیان کرے گا۔ غرض بالعموم مذہبی کتابوں کی ترتیب خصوصاً قرآن مجید کی ترتیب ظاہری تعلق پر نہیں بلکہ اُن جذبات پر ہے جو قرآن کریم پڑھتے وقت پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ فلاں آیت یا فلاں حکم کے نتیجہ میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے بجائے ظاہری ترتیب کے اُس نے قرآن کریم کی ترتیب اُن جذبات پر رکھی جو قلب مومن میں پیدا ہوتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ جو لوگ غور سے اور محبت اور پیار کے جذبات کے ساتھ قرآن مجید کو نہیں پڑھتے اُنہیں یہ کتاب پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ کیا ہوا کہ ابھی موسیٰ کا ذکر تھا پھر نوحؑ کا ذکر شروع کر دیا پھر شعیبؑ کے حالات بیان ہونے لگ گئے ابھی سُود کا ذکر تھا کہ ساتھ نماز کا ذکر آ گیا۔ ان کے نزدیک یہ باتیں اتنی بے جوڑ ہوتی ہیں کہ وہ اِن کا آپس میں کوئی تعلق سمجھ ہی نہیں سکتے مگر وہی مضمون جب کسی عالم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ سُنتا ہے اور سر دُھنتا ہے۔

قرآنی علوم سے فائدہ اُٹھانے کا اصول

اگر کہو کہ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ تو گو میرے مضمون سے اِس کا کوئی تعلق نہیں مگر چونکہ میں نے بتایا ہے کہ انسان بسا اوقات جذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے اس لئے مَیں بھی جذبات کے ماتحت دو تین علاج بتا دیتا ہوں۔

پہلا علاج یہ ہے کہ انسان سارے کلام کو پڑھے اور بار بار پڑھے یہ نہیں کہ کوئی خاص حصّہ چُن لیا اور اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔

دوم اُس وقت پڑھے جب اُس کے دل میں محبت اور اخلاص کا جوش ہو۔ جن لوگوں کا جذبہ

محبت ہر وقت کامل رہتا ہو اُن کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ صبح یا شام کا وقت تلاوت کے لئے مقرر کر لیں مگر جن کا جذبہ محبت ایسا کامل نہ ہو وہ اُس وقت تلاوت کیا کریں جب اُن کے دل میں محبت کے جذبات اُبھر رہے ہوں۔ چاہے دوپہر کو اُبھریں یا کسی اَور وقت۔

سوم قرآن کریم کو اِس یقین کے ساتھ پڑھا جائے کہ اس کے اندر غیر محدود خزانہ ہے۔ جو شخص قرآن کریم کو اِس نیت کے ساتھ پڑھتا ہے کہ جو کچھ مولوی مجھے اِس کا مطلب بتائیں گے یا پہلی کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہیں تک اِس کے معارف ہیں اُس کے لئے یہ کتاب بند رہتی ہے مگر جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اِس میں خزانے موجود ہیں وہ اِس کے معارف اور علوم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کوئی سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے ایک سوال پوچھنا ہے۔ مجھے اُس وقت جلدی تھی میں نے کہا کوئی مختصر سوال ہے یا تفصیل طلب؟ وہ کہنے لگا میں مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت چاہتا ہوں۔ میں نے کہا مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت سارے قرآن سے ملتا ہے۔ کہنے لگا کوئی آیت بتائیں۔ میں نے کہا ممکن ہے مَیں جو آیت بتاؤں آپ کہیں کہ اِس کا یہ مطلب نہیں وہ مطلب ہے۔ اس لئے آپ ہی قرآن کی کوئی آیت پڑھ دیں۔ مَیں اس سے مرزا صاحب کی صداقت ثابت کر دونگا۔ اُس نے جلدی سے یہ آیت پڑھ دی کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔[۴۲] مَیں نے مختصراً اس آیت کا مضمون بیان کر کے اُسے بتایا کہ اِس آیت سے بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ مَیں نے کہا آپ بتائیں آج کل مسجدوں میں لوگ کتنے جاتے ہیں؟ کہنے لگا بہت کم۔ مَیں نے کہا پھر جو نماز پڑھنے جاتے ہیں ان میں سے نماز کی حقیقت سے کتنے آگاہ ہوتے ہیں؟ کہنے لگا بہت ہی کم۔ پھر مَیں نے کہا ان میں سے جو باقاعدہ پانچ وقت نمازیں پڑھتے ہیں ان کی تعداد کتنی ہوتی ہے؟ کہنے لگا ان کی تعداد تو اور بھی تھوڑی ہوتی ہے۔ میں نے کہا خدا اِس آیت میں یہ کہتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتے۔ اب آپ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ یہ آیت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُتری آج بھی اپنے مضمون کی صداقت ظاہر کر رہی ہے۔ پھر اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانہ کی بدیاں آج پیدا ہوگئی ہیں تو کیا اِن بدیوں کو دُور کرنے کے لئے مصلح نہیں آنا چاہئے تھا؟ آخر یہ آیت اسی لئے قرآن میں آئی ہے تا اللہ تعالیٰ بتائے کہ ایسے گندے لوگ چونکہ دنیا میں موجود ہیں اِس لئے ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ پھر اگر ایسے لوگوں کی اصلاح کے لئے قرآن کی ضرورت تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت تھی تو جب کہ موجودہ زمانہ میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ اِس آیت کا مضمون لوگوں کے عمل سے نظر آتا ہے تو جس اصلاح کا سامان خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کیا تھا وہ بھی ہونا چاہئے۔ اِس پر وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم میں ایسے وسیع مطالب بیان کئے گئے ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو وہ خزانہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ ہاں جو لوگ اِسے بند کتاب سمجھ لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اِس میں سے نئے معارف نہیں نکل سکتے اُن پر واقعہ میں کوئی بات نہیں کھلتی۔ جس طرح اگر تم کسی جنگل میں سے گزر رہے ہو تو تمہارے سامنے ہزاروں درخت آئیں گے مگر تم کسی کو غور سے نہیں دیکھو گے لیکن اگر محکمہ جنگلات کا افسر معائنہ کرنے کے لئے آجائے تو وہ بیسیوں نئی باتیں معلوم کر لیتا ہے۔ اِسی طرح جو شخص اس نیت سے قرآن پڑھتا ہے کہ یہ غیر محدود خزانہ ہے وہ اِس سے فائدہ اُٹھالیتا ہے اور جو اِس نیت سے نہیں پڑھتا وہ محروم رہتا ہے۔

ہر زبان میں تشبیہہ اور استعارہ کا استعمال

الہامی کتابوں کے مطالب کے متعلق دوسری مشکل جیسا کہ میں بتا چکا ہوں تشبیہہ اور استعارہ کی ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں تشبیہہ اور تمثیل کا استعمال موجود ہے۔ ہر اعلیٰ علمی کتاب میں تشبیہات و تمثیلات بیان ہوتی ہیں۔ ہر ملک میں استعاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں محاورہ ہے کہ ''آنکھ بیٹھ گئی'' مگر کوئی نہیں کہتا کہ کیا آنکھ کی بھی ٹانگیں ہیں؟ یا وہ بیٹھی ہے تو کس پلنگ اور کُرسی پر کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ آنکھ بیٹھنے کے معنی یہ ہیں کہ آنکھ ضائع ہوگئی اور پھوٹ گئی۔ اِسی طرح اور بیسیوں نہیں سینکڑوں محاورے زبانِ اُردو میں استعمال کئے جاتے ہیں اور یہ استعارے زبان کے کمال پر دلالت کرتے ہیں۔

غرض تشبیہ اور استعارہ ایسی ضرور چیز ہے کہ اس کے بغیر گذارہ ہی نہیں ہوسکتا اور چونکہ اس کے استعمال سے مضامین خوبصورت اور مزیّن ہو جاتے ہیں اس لئے الہامی کتابیں بھی اسے استعمال کرتی ہیں اور اس طرح وہ اِس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ تشبیہہ اور استعارہ بڑی ضروری چیز ہے۔

الہامی کتب کے بارہ میں لوگوں کی مشکلات

لیکن جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے الہامی کتابوں کو چونکہ بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کے لفظ لفظ پر بیٹھ جاتے ہیں اور تشبیہہ اور استعارہ کی وجہ سے غلطی خوردہ لوگ دو انتہاؤں کو پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو تشبیہہ اور استعارہ کو بالکل نظر انداز کر کے اسے حقیقت پر محمول قرار دے دیتے ہیں۔ اگر قرآن میں خدا کے ہاتھ کا ذکر آئے تو وہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بس اسی طرح چمڑے کا ہے جس طرح ہمارا ہاتھ ہے۔ اُس کی بھی انگلیاں ہیں اور انگوٹھا ہے اور اگر انہیں کہا جائے کہ ہاتھ سے مراد خدا کی طاقت ہے تو وہ کہیں گے تم تاویلیں کرتے ہو جب خدا نے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے تو تمہارا کیا حق ہے کہ تم اس کی کوئی اور تاویل کرو۔ اسی طرح خدا کی آنکھ کا ذکر آئے تو وہ کہیں گے اس کے بھی ڈیلے ہیں اور اگر اس کے کوئی اور معنی کئے جائیں گے تو وہ کہیں گے یہ تو تاویلیں ہوئیں۔ ایسے معنی کرنا خدا کی ہتک ہے۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کے متعلق اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ[5] کے الفاظ آجائیں تو وہ کہیں گے کہ جب تک خدا تعالیٰ کو ایک سنگِ مرمر کے تخت پر بیٹھا ہوا تسلیم نہ کیا جائے قرآن سچا نہیں ہوسکتا۔ یا اگر حدیثوں میں بعض ایسے ہی الفاظ آجائیں کہ خدا اپنا پاؤں دوزخ میں ڈالے گا یا قرآن میں اُنہیں یہ دکھائی دے کہ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ[6] تو جب تک وہ یہ تسلیم نہ کریں کہ خدا نے بھی پاجامہ پہنا ہوا ہوگا اور وہ اپنی پنڈلی سے نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اپنا پاجامہ اُٹھائے گا اُس وقت تک ان کی تسلّی ہی نہیں ہوتی۔ پس وہ تشبیہہ اور استعارہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ٹھوکر کھا گئے اور خدا تعالیٰ کے تجسّم کے قائل ہوگئے اور کسی نے ان الفاظ کی حکمت پر غور نہ کیا۔

وارفتگی کا استثنا

بے شک بعض دفعہ جذبات کی رَو میں بھی انسان ایسے الفاظ منہ سے نکال دیتا ہے جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی مجسّم ہے مگر وہ ایک عارضی حالت ہوتی ہے جو وارفتگی کے وقت انسان پر وارد ہوتی ہے جیسے مثنوی رومی والے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام ایک دفعہ جنگل سے گزر رہے تھے کہ اُنہوں نے ایک گڈریے کو دیکھا جو مزے لے لے کر کہہ رہا تھا کہ خدایا! اگر تُو مجھے مل جائے تو میں تجھے بکری کا تازہ تازہ دودھ پلاؤں، تیری جوئیں نکالوں، تجھے مَل مَل کر نہلاؤں، تیرے پاؤں میں کانٹے چُبھ جائیں تو میں نکالوں۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے جب یہ باتیں سُنیں تو اُنہوں نے اُسے سونٹا مارا اور کہا نالائق! تُو خدا تعالیٰ کی گستاخی کرتا ہے۔ اُسی وقت حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کو الہام ہوا کہ اے موسیٰؑ! اِس بندے کو تو میری کسی کتاب یا الہام کا پتہ نہ تھا اسے کیا خبر تھی کہ میری کیا شان ہے یہ تو جذبۂ محبت میں سرشار ہو کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ تیرا کیا بگڑتا تھا اگر یہ اسی طرح مجھ سے باتیں کرتا رہتا۔ تو دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کا عام انسانوں پر قیاس کر لیتے ہیں اور جب اُنہیں محبت کا جوش اُٹھتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا مل جائے تو ہم اُس کی خدمت کریں حالانکہ خدا تعالیٰ خدمت سے بالا ہستی ہے لیکن بہرحال یہ ایک وارفتگی کی کیفیت ہے اور اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ کہنے والا خدا تعالیٰ کے تجسّم کا قائل ہے لیکن بعض پڑھے لکھے ایسے بھی ہوتے ہیں جو الفاظ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ظاہری ہاتھ اور اُس کی آنکھ سے ظاہری آنکھ مراد لے لیتے ہیں۔

فلسفی مزاج لوگوں کا حدود سے تجاوز

اس کے مقابلہ میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے اندر محبت کا جوش نہیں ہوتا بلکہ فلسفہ اُن کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے۔ وہ جب سنتے ہیں کہ ایک شخص کہتا ہے خدا کی آنکھیں ہیں اور دوسرا کہتا ہے اس سے آنکھیں مراد نہیں بلکہ فلاں چیز مراد ہے یا خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ظاہری ہاتھ مراد نہیں بلکہ طاقت و قوت مراد ہے تو وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ سارا قرآن ہی استعارہ ہے۔ ایسے

لوگوں کو جب کہا جاتا ہے کہ قرآن کہتا ہے نماز پڑھو تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز پڑھی جائے بلکہ یہ ہے کہ خدا سے محبت پیدا کی جائے۔ اسی طرح جب قرآن کہتا ہے روزے رکھو تو وہ کہتے ہیں اِس کا یہ مطلب نہیں کہ بھوکے رہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ حرام خوری نہ کرو۔ اسی طرح جب حج کا ذکر آتا ہے تو وہ کہتے ہیں اس سے یہ مراد نہیں کہ خواہ مخواہ مکے جاؤ بلکہ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں بھی قومی ضروریات اجتماع چاہتی ہوں وہاں انسان چلا جائے۔ خواہ علیگڑھ چلا جائے یا کسی اور جگہ۔ حتّٰی کہ بعض نے تو اِس حد تک استعارات کو بڑھایا ہے کہ میں نے ایک تفسیر دیکھی جس میں تمام قرآن کو استعارہ اور مجاز ہی قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی جگہ موسیٰؑ کا نام آیا ہے تو اس کے کچھ اور ہی معنی لئے ہیں اور اگر آدم کا لفظ آیا ہے تو اس کے بھی کچھ اور معنی لئے گئے ہیں۔ ایسا آدمی بالکل سو فسطائی بن جاتا ہے اور اس کی مثال اُس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو بادشاہ کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ بادشاہ سلامت! ہر چیز وہم ہی وہم ہے۔ بادشاہ نے اُسے نیچے صحن میں کھڑا کر کے مست ہاتھی چھوڑ دیا اور احتیاطاً ایک سیڑھی بھی لگا دی تا کہ وہ اس کے حملہ سے بچ کر سیڑھی پر چڑھ جائے۔ جس وقت ہاتھی نے حملہ کیا تو وہ بھاگا اور دَوڑ کر سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ بادشاہ کہنے لگا کہاں جاتے ہو؟ ہاتھی واقعی کوئی نہیں یہ تو وہم ہی وہم ہے۔ وہ بھی کچھ کم چالاک نہ تھا کہنے لگا بادشاہ سلامت! کون بھاگ رہا ہے یہ بھی تو وہم ہی ہے۔ تو بعض لوگ استعارہ کو اس حد تک لے جاتے ہیں کہ کوئی کلام بغیر استعارہ پر محمول کئے نہیں چھوڑتے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک خدا ایک طاقت کا نام ہے۔ فرشتے اخلاق کا نام ہیں۔ جنّت اور دوزخ قومی ترقی اور تنزّل کے نام ہیں اور اُن کے نزدیک یہ سب عبادتیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ لوگوں کو بہلانے کے لئے رکھی گئی ہیں۔

عیسائیوں کی مذہبی کیفیت

بعض قوموں میں ایک ہی وقت میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں یعنی بعض باتوں کے متعلق تو وہ یہ کہتی ہیں کہ یہ استعارے ہیں اور بعض باتوں کے متعلق کہتی ہیں کہ یہ استعارے نہیں اور بعض ایسی قومیں ہیں جن کا اگر استعارہ میں فائدہ ہو تو استعارہ مراد لے لیتی ہیں اور حقیقت میں فائدہ ہو تو حقیقت مراد لے لیتی ہیں۔ عیسائی اِسی قسم کے شُتر مُرغ ہیں اُنہیں جس چیز میں فائدہ نظر آتا ہے وہ

اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے اپنے متعلق کہا کہ مَیں خدا کا بیٹا ہوں۔ یہ ایک استعارہ تھا مگر عیسائیوں نے اسے حقیقت قرار دے کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت عیسٰیؑ سچ مچ خدا کے بیٹے تھے مگر جب مسیحؑ نے روزے رکھنے اور عبادت کرنے کا حکم دیا تو کہہ دیا کہ یہ استعارہ ہے۔ گویا جس میں اپنا فائدہ دیکھا وہی رَوِش خود اختیار کر لی۔ جیسے کہتے ہیں کوئی پوربن تھی جس کا خاوند مر گیا۔ پوربن نے رونا پیٹنا شروع کر دیا اور اپنی بے کسی ظاہر کرنے کے لئے کہنے لگی۔ میرے خاوند نے فلاں سے اتنے روپے وصول کرنے تھے وہ اب کون وصول کرے گا؟ ایک پوربیہ جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہنے لگا۔ ''اری ہم ری ہم'' وہ کہنے لگی فلاں جگہ اتنی زمین اور جائیداد ہے اب اُس پر کون قبضہ کرے گا؟ تو وہ پھر بولا۔ ''اری ہم ری ہم'' پھر وہ کہنے لگی اُس نے فلاں کا سَو روپیہ دینا تھا وہ کون دے گا؟ تو وہ کہنے لگا۔ ارے بھئی! میں ہی بولتا جاؤں یا برادری میں سے کوئی اور بھی بولے گا۔ تو عیسائیوں نے اپنا مذہب ایسا ہی بنایا ہوا ہے۔ جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام یہ کہتے ہیں کہ مَیں خدا کا بیٹا ہوں وہاں کہتے ہیں بالکل ٹھیک مگر جب وہ کہتے ہیں کہ بُھوتوں کے نکالنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ روزے رکھے جائیں تو وہ کہہ دیتے ہیں یہ استعارہ ہے۔

استعارات کی ضرورت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب استعارات میں اس قدر خطرے ہیں تو الہامی کتابوں نے اسے استعمال کیوں کیا؟ کیونکہ خرابیاں یا تو استعارہ کو محدود کر دینے سے پیدا ہوتی ہیں یا اسے وسیع کر دینے سے۔ اگر استعارہ رکھا ہی نہ جاتا تو اس میں کیا حرج تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ استعارہ کی کئی ضرورتیں ہیں۔

اوّل اس کی ضرورت اختصار ہے۔ تشبیہ اور استعارہ میں جس قدر اختصار پیدا ہو سکتا ہے وہ اور کسی طریق سے نہیں ہو سکتا۔ اس طرح لمبے لمبے مضامین بعض دفعہ صرف ایک فقرہ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ وہ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ہے یعنی صُبحوں کا پھاڑنے والا ہے۔ اِس جگہ اِصْبَاح جمع کا لفظ رکھا ہے اور پھر اس کے ساتھ فَالِق کا لفظ رکھا ہے اور گو بظاہر یہ دو لفظ نظر آتے ہیں لیکن اِس مضمون کو اگر دیکھیں جو اِس میں بیان کیا گیا ہے تو

وہ بہت لمبا ہے۔ یعنی دنیا میں قسم قسم کی تاریکیاں ہوتی ہیں اور ان تمام تاریکیوں کو دُور کرنے کے کچھ ذرائع ہوتے ہیں جن کی آخری کڑی خدا ہے۔ جب وہ کڑی تیار ہو جاتی ہے تو تاریکی دور ہو جاتی ہے اور فلقِ صبح ہو جاتا ہے۔ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ لوگ بیمار ہوتے ہیں اور ڈاکٹر اُن کا علاج کرتے ہیں مگر کیا ان کے علاج سے سارے مریض اچھے ہو جاتے ہیں؟ یقیناً تمام قسم کا علاج کرنے کے باوجود بعض مریضوں پر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب ڈاکٹر کہہ دیتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہی حال ہر پیشے کا ہے۔ وکیل کو لے لو تو اُسے وکالت میں، انجینئر کو لے لو تو اسے انجینئرنگ میں ایک جگہ پہنچ کر رستہ بالکل بند نظر آتا ہے اور سوائے اِس کے اور کوئی صورت نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اُس کی غیب سے مدد کرے۔ پس ایسی حالت میں سوائے خدا کے اور کوئی مصیبت دُور نہیں کر سکتا اور اسی کو فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے لیکن اگر خالی یہ کہا جاتا کہ اللہ مشکلات کو دور کرنے والا ہے تو اس سے وہ مضمون ادا نہ ہوتا جو فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کے الفاظ میں ادا ہوا ہے اور جو رات اور صبح کی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے پس اس استعارہ نے لمبے مضامین کو نہایت مختصر الفاظ میں ادا کر دیا۔

دوسرے استعارہ سے وُسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بندر اور سؤر بنا دیا۔ اب اگر قرآن کریم یہ کہتا کہ ہم نے انہیں بے حیا بنا دیا تو ان الفاظ میں اس مضمون کا ہزارواں حصہ بھی ادا نہ ہوتا جو قِرَدَةً اور خَنَازِیْر کے الفاظ میں ادا ہوا ہے کیونکہ قِرَدَةً اور خَنَازِیْر کی بیسیوں خصوصیتیں ہیں کوئی ایک خصوصیت نہیں۔ مثلاً بے حیائی بھی ایک خصوصیت ہے۔ گندگی بھی ایک خصوصیت ہے۔ خنزیر نہایت ہی گندہ ہوتا ہے اور یہودی بھی حد درجہ غلیظ ہوتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ جہاز کا سفر کیا تو کچھ یہودی بھی اس جہاز میں سوار ہو گئے۔ میں نے اُنہیں دیکھا تو وہ اتنے گندے تھے کہ گویا چوہڑے ہیں مگر جب بمبئی جہاز پہنچا تو میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ نہایت زرق برق لباس پہنے بیٹھے ہیں۔ میں کچھ حیران سا ہوا کہ یہ کہاں سے آگئے مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ وہی یہودی ہیں جو سارے سفر میں ساتھ رہے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے جو قِرَدَةً اور خَنَازِیْر کے الفاظ استعمال کئے ہیں تو اسی لئے کہ بتائے کہ بندر اور سؤر میں جو خصوصیتیں پائی جاتی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔ اگر صرف اتنا کہہ دیتا کہ

یہودی گندے اور بدکار ہیں تو وہ مضمون ادا نہ ہوسکتا۔ غرض قِرَدَةً اور خَنَازِیر کے الفاظ سے مضمون کو حیرت انگیز وسعت ہوئی ہے حتّٰی کہ قِرَدَةً اور خَنَازِیر کی بعض خصوصیات آج معلوم ہو رہی ہیں اور وہ خصوصیات بھی یہودی قوم میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً بندر میں نقالی کا مادہ ہوتا ہے اور یہودیوں میں بھی نقل کا مادہ کمال درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ پس یہودیوں کے متعلق بتایا کہ وہ صرف بدکار ہی نہیں بلکہ نقال بھی ہیں۔ اسی طرح بندر پانی سے ڈرتا ہے۔ یہود بھی ہمیشہ خشکی میں رہتے ہیں سمندر میں سفر نہیں کرتے۔ اسی طرح درجن سے زیادہ خصوصیات ایسی ہیں جو یہود میں پائی جاتی ہیں مگر وہ سب قِرَدَةً اور خَنَازِیر کے الفاظ کے اندر خدا تعالیٰ نے بیان کر دیں۔ اگر قِرَدَةً اور خَنَازِیر کے الفاظ اللہ تعالیٰ استعمال نہ کرتا اور الگ الگ ان کی خصوصیات بیان کرتا تو اِس کے لئے ایک مکمل سورۃ چاہئے تھی۔ اب رہے خَنَازِیر۔ تو خَنَازِیر میں بھی کئی عیب ہیں۔ مثلاً ایک عیب تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سیدھا جاتا ہے رستہ نہیں بدلتا حتّٰی کہ حملہ بھی کرتا ہے تو سیدھا کرتا ہے۔ یہود میں بھی یہ عیب پایا جاتا ہے وہ بھی اپنی زندگی کے شعبے تبدیل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح خِنْزِیر میں گندگی پائی جاتی ہے اور یہود بھی حد درجہ گندے ہوتے ہیں۔ پھر بعض امراض بھی خِنْزِیر میں ہوتی ہیں جو یہودیوں میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر میں اُن کا ذکر نہیں کرتا۔

تیسرے تشبیہہ اور استعارہ کی ضرورت تبعید کے لئے ہوتی ہے یعنی مضمون کو اُونچا کر دینا اور نظر کو وسیع کر دینا استعارہ کا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً یہ استعارہ تھا کہ خواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور بھائیوں کو سورج، چاند اور ستاروں کی صورت میں دیکھا۔ اب خالی بھائی کہہ دینے سے وہ مضمون ادا نہ ہوتا جو ستاروں میں ادا ہوا ہے یا جیسے سورج اور چاند کے الفاظ میں ادا ہوا ہے کیونکہ سورج، چاند اور ستارے ایک وسیع مضمون رکھتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ تیرے بھائی باوجود اس کے کہ اس وقت تیرے مخالف ہیں اور ان کی عملی حالت اچھی نہیں اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں سے دنیا کی ایسی ہی راہنمائی کرے گا جس طرح ستارے راہنمائی کرتے ہیں۔ اب یہ ایک وسیع مضمون تھا جو بھائی کہہ کر ادا نہیں ہوسکتا تھا مگر ستارے کہہ کر ادا ہو گیا۔

چوتھے تقریب مضمون کے لئے بھی استعارہ ضروری ہوتا ہے۔ یعنی بعض دفعہ مضمون اتنا

وسیع ہوتا ہے کہ انسان اُسے سمجھ نہیں سکتا جب تک کسی خاص طریق سے اُسے ذہن کے قریب نہ کر دیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑی محبت کرتا ہے تو اس پر بچہ پوچھتا ہے کہ کتنی محبت کرتا ہے؟ تو اگر ہم اُسے کہہ دیں کہ ماں سے بھی زیادہ تو وہ فوراً بات سمجھ جائے گا حالانکہ ماں کی محبت اور خدا تعالیٰ کی محبت میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسی لئے بعض مذاہب نے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا ماں ہے، خدا باپ ہے کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی محبت کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا جب تک استعارہ کے رنگ میں اسے ادا نہ کیا جائے۔ تو استعارہ اور تشبیہہ نہایت ضروری چیز ہے اور کلام کا ویسا ہی اہم جزو ہے جیسے اور الفاظ اور اسے کسی صورت میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں وُسعتِ مضمون ہوگی اور جہاں تھوڑے الفاظ میں مضامین کا ادا کرنا ناممکن ہوگا وہاں استعارہ ہی استعمال کرنا پڑے گا بلکہ خود الفاظ بھی ایک قسم کا استعارہ ہی ہیں۔ مثلاً جب ہم گھوڑا کہتے ہیں تو یہ خود ایک استعارہ ہوتا ہے۔ ورنہ گ ھ و ڑ اور الف کا گھوڑے سے کیا تعلق ہے؟ پس یہ ایک تشبیہہ اور استعارہ ہے جو انسانی کلام میں تجویز کیا گیا۔ ورنہ اگر گھوڑے کی تشریح کی جاتی تو بڑی مشکل پیش آجاتی۔ جیسے مشہور ہے کہ کوئی حافظ صاحب تھے جنہوں نے کبھی کھیر نہیں کھائی تھی۔ ایک دن کسی نے اُن کی دعوت کی اور شاگرد نے آکر بتایا کہ آج اُس نے کھیر پکائی ہے۔ وہ کہنے لگے کھیر کیا کھانا ہوتا ہے؟ اُس نے بتایا کہ میٹھا میٹھا اور سفید سفید ہوتا ہے۔ اب حافظ صاحب نے چونکہ رنگ بھی کبھی نہ دیکھے تھے اس لئے انہوں نے پوچھا کہ سفید رنگ کس طرح کا ہوتا ہے؟ شاگرد کہنے لگا بگلے کی طرح ہوتا ہے۔ حافظ صاحب پوچھنے لگے بگلا کس طرح کا ہوتا ہے؟ اس پر شاگرد نے ہاتھ کی شکل بگلے کی طرح بنائی اور اُس پر حافظ صاحب کا ہاتھ پھیر دیا۔ حافظ صاحب نے فوراً شور مچا دیا اور کہنے لگے جاؤ جاؤ میں ایسی دعوت میں شریک نہیں ہوسکتا۔ یہ کھیر تو میرے گلے میں اٹک کر مجھے مار ڈالے گی۔ یہ ہے تو ایک لطیفہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ بگلے سے فلاں چیز مراد ہے، گھوڑے سے فلاں چیز مراد اور گدھے سے فلاں چیز تو کوئی گھوڑے کو گدھا سمجھے گا اور بھینس کو گھوڑا۔ پس استعارہ انسانی کلام کا ایک ضروری جزو ہے اور اسے کسی صورت میں بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔

استعاروں کے بغیر بعض مضامین ادا ہی نہیں ہوسکتے

حقیقت یہ ہے کہ استعارہ کے صحیح استعمال کے بغیر مضمون صحیح طور پر ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً عام طور پر جب کسی شخص سے کوئی حماقت کا کام سرزد ہو تو اُسے گدھا کہہ دیا جاتا ہے۔ یا کوئی بہادر شخص ہو تو اُس کے متعلق ہم شیر کا لفظ استعمال کر دیتے ہیں۔ اب اگر ہم شیر کا لفظ استعمال نہ کریں اور خالی بہادر کہہ دیں تو جو شخص استعارہ کو سمجھنے کی طاقت رکھتا ہے وہ بہادر کے لفظ سے کبھی وہ مفہوم نہیں سمجھ سکتا جو شیر کے لفظ سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی استعارہ غلط استعمال کر دے۔ مثلاً گدھا ہے گدھا ہمیشہ بے موقع کام کرنے والا ہوتا ہے۔ راہ چلتے ہوئے باقی جانوروں کو ہٹاؤ تو وہ ایک طرف ہو جائیں گے مگر گدھے کو ہٹاؤ تو وہ ٹیڑھا کھڑا ہو جائے گا اور رستہ روک لے گا۔ اب اگر ہم کسی کو بیوقوف کہیں تو اِس بیوقوف کے لفظ سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ بے موقع کام کرتا ہے لیکن گدھے کا لفظ استعمال کرنے سے فوراً دوسرا شخص سمجھ جائے گا کہ یہ بے موقع کام کرتا ہے۔ اسی طرح گدھے سے بوجھ اُٹھانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اِسی وجہ سے علمائے یہود کی مذمّت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اب جو لوگ اِس نکتہ کو سمجھتے ہیں کہ کسی کو گدھا کہنے سے ایک مقصد اس امر کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ وہ بدعمل ہے وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ جسے گدھا کہا گیا ہے وہ نہ صرف بے موقع کام کرتا ہے بلکہ بے عمل بھی ہے لیکن خالی احمق یا بیوقوف کا لفظ کہنے سے یہ مضمون ادا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو مضمون کسی کو شیر کہنے سے ادا ہوتا ہے وہ خالی بہادر کہنے سے ادا نہیں ہوتا کیونکہ شیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ بلا وجہ حملہ نہیں کرتا۔ دوسرے وہ زیردست سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اگر شیر کے آگے لیٹ جائیں تو وہ حملہ نہیں کرتا سوائے اِس کے کہ اُس کے منہ کو خون لگ چکا ہو۔ یہ خوبی شیر میں یہاں تک دیکھی گئی ہے کہ بعض جگہ چھوٹے بچے لیٹ ہوئے تھے کہ اتفاقاً وہاں شیر آ گیا۔ ایسی حالت میں بجائے اُن پر حملہ کرنے کے وہ اُنہیں چاٹنے لگ گیا۔ اسی طرح اس میں خوف بالکل نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیات ہیں جو شیر میں پائی جاتی ہیں۔ اب اگر ہم کسی کے متعلق محض بہادر کا لفظ استعمال کریں تو گو اِس سے اُس کی جرأت اور دلیری کا اظہار ہو جائے گا مگر یہ اظہار نہیں ہوگا کہ وہ بلا وجہ حملہ نہیں کرتا۔ وہ زیردست سے چشم پوشی کرتا ہے اور ڈر اور خوف اس میں بالکل نہیں۔ تیسرے اس میں ہیبت ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت بھی ایسی ہے جو شیر میں ہی پائی جاتی ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ نے ایسی ہیبت پیدا کر دی ہے کہ حملہ سے نہیں

بلکہ اُس کی شکل سے ہی دوسرے کوڈر لگنے لگ جاتا ہے۔

غرض استعارہ مضمون میں وُسعت پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت کہ یہ ضروری چیز ہے یہ ہے کہ رؤیا میں نوّے فیصدی استعارات سے کام لیا جاتا ہے۔ انسان دیکھتا ہے کہ میں بینگن کھا رہا ہوں اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اُسے کوئی غم پہنچے گا۔ وہ دیکھتا ہے کہ فلاں عزیز مر گیا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کی عمر لمبی ہوگی۔ وہ دیکھتا ہے کہ اپنے بچے کو ذبح کر رہا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے دین کے لئے وقف کر دے گا۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں بکرا ذبح کر رہا ہوں اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کا کوئی بچہ مر جائے گا۔ میں اس بحث میں اِس وقت نہیں پڑتا کہ رؤیا خدا تعالیٰ کی طرف سے دکھائی جاتی ہیں یا دماغی کیفیت کا ایک نتیجہ ہیں لیکن بہر حال اگر رؤیا ایک دماغی کیفیت ہے تب بھی سب دماغوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر دیا ہے کہ استعارہ کے بغیر گزارہ نہیں اور اگر رؤیا خدا تعالیٰ کی طرف سے دکھائی جاتی ہے تب بھی خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ استعارہ کے بغیر گذارہ نہیں۔ پس بنی نوع انسان اور خدا تعالیٰ کی متفقہ شہادت اس امر پر ہے کہ استعارہ کے بغیر گذارہ نہیں ہوسکتا۔ باقی رہے خطرات سو میں انہیں تسلیم کرتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ استعاروں کو نہ سمجھ کر ہی عیسائی گمراہ ہو گئے۔ کہیں انہوں نے حضرت عیسٰی کو خدا قرار دے لیا تو کہیں شریعت کو لعنت قرار دے دیا لیکن اگر کوئی ذریعہ ایسا ہو جس سے یہ خطرات دُور کئے جا سکیں تو اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو کلام ان خطرات کا ازالہ کر دے وہ بہترین کلام سمجھا جائے گا۔ (میں اِس وقت انسانی کلام پر گفتگو نہیں کر رہا بلکہ الہامی کتابوں کا ذکر کر رہا ہوں)

غلط فہمیاں دُور کرنے کے ذرائع

پہلی الہامی کتابوں نے بے شک استعارے استعمال کئے ہیں مگر ان کے خطرات کو دُور کرنے کے لئے بعد میں نبی آتے رہے اور جب بھی لوگوں کو کوئی غلطی لگی، آنے والے نبیوں کے ذریعہ اس کا ازالہ ہوتا رہا لیکن اِن استعارات کو سمجھنے کے لئے ان میں اندرونی شہادت موجود نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً انجیل میں حضرت مسیح کو ابن اللہ کہا گیا ہے مگر اِس استعارہ کو حل کرنے کے لئے اندرونی شہادت اس میں موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ ایک عارضی تعلیم ہے جب اس کے ذریعہ لوگوں کو دھوکا لگا

تو پھر ایک مکمل شریعت اُتاری جائے گی جیسے گورنمنٹیں جب عارضی طور پر پُل بناتی ہیں تو ایسے سامان سے بناتی ہیں جو تھوڑے عرصہ تک کام دے سکے۔ زیادہ پائیدار اور پختہ سامان نہیں لگاتیں۔ اِسی طرح پہلی تعلیمیں چونکہ عارضی تھیں اور اللہ تعالیٰ اُن کو منسوخ کر کے ایک کامل تعلیم اُتارنے کا ارادہ کر چکا تھا اِس لئے ان کتب میں اندرونی شہادت نہ رکھی صرف بیرونی شہادت سے خطرات کا ازالہ کرتا رہا۔ اس لئے جب بیرونی شہادت بند ہوگئی تو سابقہ الہامی کتب بھی منسوخ کر دی گئیں لیکن قرآن کریم چونکہ ابدی ہدایت نامہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس قسم کے خطرات کے ازالہ کے لئے دو صورتیں رکھی ہیں۔ اوّل بعثتِ مامورین۔ دوم اندرونی شہادت۔ تا کہ کسی وقت بھی ایسی غلطیاں مسلمانوں میں پیدا نہ ہوں جو سب کو گمراہ کر دیں۔ پہلی کتب کے ساتھ چونکہ یہ حفاظت کے اسباب نہیں تھے اس لئے ان کے بعض مضامین سے لوگوں کو ٹھوکر لگی اور بعض مضامین کو وہ سمجھ ہی نہ سکے۔ مثلاً بائیبل کی کئی آیات ان ہدایت پر مشتمل ہیں کہ اگر کپڑے کو کوڑھ ہو جائے تو تم کیا کرو۔[8]

اب یہ امر کہ کپڑے کو کوڑھ کس طرح ہو سکتا ہے انسانی عقل سے بالا ہے۔ ڈاکٹر بھی اس بات سے ناواقف ہیں مگر بائیبل کی کتاب گنتی میں باقاعدہ کپڑوں کے کوڑھ کی قسمیں بیان کی گئی ہیں اور پھر اِس کوڑھ کا علاج بتایا گیا ہے۔ اب یقیناً یہ کوئی استعارہ ہوگا۔ مثلاً ممکن ہے کپڑوں سے مراد دل ہوں اور کپڑے کے کوڑھ سے مراد دل کی گندگی ہو۔ جیسے قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ[9] لیکن چونکہ اندرونی شہادت اِس میں موجود نہیں اور نبی آنے بند ہو گئے اس لئے اب انسان ان باتوں کو پڑھتا اور ہنستا ہے۔ گزشتہ دِنوں ایک جرمن اُستانی مَیں نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لئے رکھی۔ اُسے انگریزی کم آتی تھی میں نے سمجھا اُسے انگریزی نہیں آتی تو اس سے جرمن زبان ہی سیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ پڑھاتی رہی۔ ایک دن ایک شخص میرے پاس آیا اور میں نے اُسے تبلیغ کی تو وہ کہنے لگی۔ ہر کتاب میں ہدایت کی باتیں ہیں۔ توریت میں بھی بڑی بڑی کام کی باتیں ہیں پھر قرآن کو ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا ہدایت ہونے پر تو کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو اس امر پر ہے کہ اس میں بعض ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو لغو ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا کیا کپڑے کو بھی کوڑھ ہو سکتا ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔ میں نے کہا بائیبل میں یہ لکھا

ہے چنانچہ بائبل منگوا کر اُس کے سامنے رکھی گئی اور وہ باب نکال کر اُسے دکھایا گیا۔ وہ سارا دن سر ڈالے بار بار اُسے پڑھتی اور سوچتی رہی۔ آخر مجھے کہنے لگی یہ بات میری عقل سے باہر ہے۔ مَیں کسی پادری کو اِس کے متعلق لکھوں گی اور جو جواب اِس کا آئے گا وہ میں آپ کو بتاؤں گی۔ میں نے کہا پادری بھی اِس کا مطلب کچھ نہیں بتا سکتا مگر خیر اُس نے ایک پادری کو خط لکھ دیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد اُس کا جواب آیا مگر وہ بھی اُس نے خود نہیں لکھا بلکہ اُس کی کسی سہیلی سے لکھوایا اور جواب یہ تھا کہ اگر سچ مچ تمہیں اسلام پسند آ جائے تو اسے اختیار کرلو ورنہ قومی مذہب ہی اچھا ہوتا ہے اور اِس قسم کی باتیں جو بائبل میں آتی ہیں یہ ہر ایک کو سمجھانے والی نہیں ہوتیں۔ تو اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک استعارہ تھا مگر چونکہ اندرونی شہادت موجود نہیں اور اِس کی تشریح کے لئے جو نبی آیا کرتے تھے اُن کا سلسلہ بند ہو گیا اس لئے لوگوں کے لئے ان باتوں کا سمجھنا بڑا مشکل ہو گیا لیکن قرآن نے اپنے استعارات کے حل کے متعلق دونوں شہادتیں رکھی ہیں یعنی اندرونی بھی اور بیرونی بھی۔ پس پہلی کتب اور قرآن کریم میں یہ فرق ہے کہ گو تشبیہہ اور استعارہ دونوں کتب میں استعمال ہوئے ہیں مگر پہلی کتب سے جو غلطی پیدا ہو جاتی تھی وہ ان کتب سے دُور نہیں ہو سکتی تھی مگر قرآن کریم کی کسی بات سے اگر کوئی غلطی لگے تو وہ قرآن سے ہی دُور ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے استعاروں کو کوئی حقیقت نہیں بنا سکتا اور نہ حقیقت کو استعارہ بنا سکتا ہے۔ مَیں یہ مانتا ہوں کہ اِس امر کا امکان ہے کہ کسی وقت مسلمان غلط فہمی سے لاکھ دو لاکھ یا چار لاکھ کی تعداد میں بگڑ جائیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے بگڑ جائیں حالانکہ عیسائی سب کے سب بگڑ گئے۔

قرآن کریم اپنے استعاروں کو آپ حل کرتا ہے

چنانچہ یہ دعویٰ جو مَیں نے کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے استعارات کو آپ حل کرتا ہے اِس کو قرآن کریم نے خود پیش کیا ہے۔ وہ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ

اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ ؎ فرماتا ہے قرآن کے جو مضامین ہیں ان میں سے کچھ تو محکم ہیں یعنی ان میں استعارہ استعمال نہیں ہوا مگر کچھ آیتیں ایسی ہیں جن میں استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی الفاظ تو ہیں مگر ان میں تشابہ ہے۔ مثلاً انسان کو بندر اور سؤر کہہ دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے وہ لوگ جو کجی چاہتے ہیں وہ استعاروں والی آیات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہی حقیقت ہے۔ اگر یہود کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں بندر بنا دیا تو وہ کہتے ہیں کہ واقعہ میں انسانی شکل مسخ کر کے انہیں بندر بنا دیا گیا تھا اور اگر یہ آئے کہ انہیں سؤر بنا دیا گیا تھا تو وہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ واقعہ میں وہ سؤر بن گئے تھے۔ اگر یہ ذکر آئے کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے تو یہ کہنے لگ جائیں گے کہ اس کے واقعہ میں گھٹنے ہیں اور وہ کسی تخت پر بیٹھا ہے اور اس سے غرض ان کی یہ ہوتی ہے کہ وہ فتنہ پیدا کریں۔ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ اور حقیقت سے پھرانے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔ تاویل کے معنی پھرانے کے ہوتے ہیں چاہے حقیقت سے دُور لے جانے کے معنوں میں ہو یا حقیقت کی طرف لے جانے کے معنوں میں ہو مگر یہاں وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ کے معنی حقیقت سے دُور لے جانے کے ہیں۔ یعنی استعارے کو وہ حقیقت قرار دے کر لوگوں کو اصل معنوں سے دُور لے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ استعارہ ہوتا ہے اور استعارہ کی وجہ سے اس کا مفہوم خدا ہی بیان کر سکتا ہے جو عالم الغیب ہے۔ تم خود کس طرح سمجھ سکتے ہو۔ اگر کہو کہ پھر ہمیں استعاروں کے مفہوم کا کس طرح پتہ لگے؟ تو فرمایا وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ہم نے اِن کا مفہوم قرآن میں بیان کر دیا جو سمجھنے والے ہیں اُن کے سامنے جب دونوں آیات آتی ہیں وہ بھی جن میں استعارہ ہوتا ہے اور وہ بھی جن میں حقیقت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ وہ آیت بھی خدا کی طرف سے ہے جو استعارے والی ہے اور وہ آیت بھی اس کی طرف سے ہے جو اسے حل کرنے والی ہے اور ناممکن ہے کہ ان دونوں میں اختلاف ہو۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ زید گدھا ہے اور پھر کہیں کہ زید نے فلاں کتاب نقل کر کے دی ہے تو اِس صورت میں اگر کوئی دوسرا اس استعارے کو حقیقت قرار دیتے ہوئے سوال کرے کہ کیا زید چوپایہ ہے؟ تو اُسے دوسرے فقرہ کو جس میں اُس کی طرف کتاب کا نقل کرنا منسوب کیا گیا ہے جھٹلانا پڑے گا لیکن اگر ہم کہہ دیں کہ دونوں فقرے صحیح ہیں تو لازماً استعارہ کو استعارہ کے معنوں میں لانا پڑے گا اور حقیقت کو حقیقت کے معنوں میں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یہ کہتے ہیں کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ یعنی اے بھلے مانسو! جو استعارے کو حقیقت قرار دیتے ہو کیا تم اس امر کو نہیں جانتے کہ جب تم استعارہ کو حقیقت قرار دو گے تو قرآن کریم کی بعض آیات جھوٹی ہو جائیں گی اور وہ سچی ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک استعارہ کو استعارہ کی حد میں نہ رکھا جائے۔ حالانکہ وہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور دونوں سچی ہیں اور جب دونوں باتیں سچی ہیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ایک حقیقت ہے اور ایک استعارہ۔ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ مگر یہ فائدہ عقلمند لوگ ہی اُٹھاتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کا معجزہ احیائے موتٰی

اِس ضمن میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر ایک موٹی مثال احیائے موتٰی کی ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام مُردے زندہ کیا کرتے تھے اور دوسری طرف قرآن میں ہی لکھا ہے کہ مُردے کی روح اِس جہان میں واپس نہیں آتی۔ اب اگر ہم مُردوں کو زندہ کرنے سے حقیقی مُردوں کا اِحیاء مُراد لیں تو ان میں سے ایک آیت کو نَعُوْذُ بِاللہِ جھوٹا ماننا پڑتا ہے لیکن اگر مُردوں سے روحانی مُردے مُراد لیں تو دونوں آیتیں سچی ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف حضرت عیسٰی علیہ السلام سے فرمایا کہ مُردے زندہ کرو اور دوسری طرف کہہ دیا کہ مُردے واپس نہیں آتے۔ اس طرح جو استعارہ کا فائدہ تھا وہ بھی حاصل ہو گیا اور جو نقصان تھا وہ بھی دُور ہو گیا۔ احیائے موتٰی کے الفاظ استعمال کرنے سے مضمون میں جو وُسعت پیدا کرنا مدِّ نظر تھا وہ وُسعت بھی پیدا ہو گئی اور جو خطرہ تھا کہ جاہل مسلمان اُنہیں خدا قرار نہ دے لیں اسے بھی دُور کر دیا۔

مجاز اور استعارہ کے بارہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد

اِن معنوں کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے متعلق سُنا کہ وہ محکمات و متشابہات کے بارہ میں جھگڑتے اور استعارہ اور حقیقت میں فرق نہ سمجھتے ہوئے قابلِ اعتراض

باتیں کرتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اسی اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی کتاب اس لئے اُتری ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری کی تصدیق کرے۔[11] پس جو آیت دوسری آیت کی تصدیق نہ کرے اس کے معنی بدلنے چاہئیں اور دونوں آیات کے مضمون میں مطابقت پیدا کرنی چاہئے۔ پس کبھی قرآن کے وہ معنی نہ کرو جو اس کی کسی دوسری آیت کو جھٹلاتے ہوں۔ اگر مطلب سمجھ میں نہ آئے تو جانے دو اور کسی عالمِ قرآن سے دریافت کرو وہ تمہیں اس کا مطلب بتادے گا۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتادیا کہ قرآن کریم کی آیات آپس میں مخالف نہیں اگر استعارہ سمجھ میں آجائے تو اُسے محکم آیات کے مطابق کرو اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو کسی واقف کے پاس جاؤ اور اُس سے دریافت کرو کہ کیا بات ہے وہ تمہاری عُقدہ کشائی کردے گا۔

غرض اس اصل کے ماتحت جو قرآن کریم نے بتایا ہے اور حدیث کے بھی ماتحت ہے جہاں دوسری کتب میں بعض خلافِ عقل اور خلافِ سنّت باتیں پائی جاتی ہیں وہاں قرآن کریم ان باتوں سے پاک ہے کیونکہ مستعمل استعاروں کا حل قرآن میں موجود ہے۔

قرآنی استعارات کی ایک مثال

اس سلسلہ میں اگرچہ قرآن کریم کی بیسیوں باتیں بیان کی جاسکتی ہیں مگر چونکہ مَیں قرآن کی تفسیر نہیں کررہا اس لئے مثال کے طور پر مَیں صرف ایک امر بیان کردیتا ہوں اور وہ وہی ہے جس کا ذکر سورہ نمل کے اُس رکوع میں کیا گیا ہے جس کی آج ہی مَیں نے تقریر شروع کرنے سے قبل تلاوت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور ان دونوں نے کہا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔[12] اللہ تعالیٰ ہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ اور سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث بنا اور اس نے کہا اے لوگو! مجھے اور میرے باپ کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہم کو ہر ایک چیز دی گئی ہے اور ہم پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے اور سلیمانؑ کے لئے لشکر جمع کئے گئے۔ وہ لشکر انسانوں کے بھی تھے اور جنوں کے بھی اور پرندوں

کے بھی۔ گویا ہر ایک کی الگ الگ کمپنی تھی۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ۔ پھر حضرت سلیمانؑ
اپنا لشکر لے کر چلے یہاں تک کہ وہ وَادِ النَّمْلِ یعنی چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے۔ ایک چیونٹی نے
اُنہیں دیکھ کر کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر غیر
شعوری حالت میں تمہیں اپنے پیروں کے نیچے مسل دیں۔ حضرت سلیمانؑ اُس کا یہ قول سُن کر ہنس
پڑے اور انہوں نے کہا اے میرے خدا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر ادا کر سکوں۔ وہ
نعمتیں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیں اور یہ کہ میں نیک کام کروں جن سے تو راضی ہو
جائے اور مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں داخل فرما۔ پھر حضرت سلیمانؑ نے جب پرندوں
والے لشکر کی دیکھ بھال کی تو فرمایا یہ کیا بات ہے کہ ہُدہُد نظر نہیں آتا۔ میں اُسے سخت عذاب دونگا
ورنہ وہ دلیل پیش کرے اور وجہ بتائے کہ کیوں غیر حاضر ہوا؟ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ہُدہُد آ گیا
اور اُس نے کہا کہ حضور! ناراض نہ ہوں۔ میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو علم نہیں۔ میں سبا کے
ملک سے ایک یقینی خبر لایا ہوں اور وہ یہ کہ میں نے وہاں ایک عورت کو دیکھا جو اُن کی ساری قوم پر
حکومت کر رہی ہے اور ہر نعمت اُسے حاصل ہے اور اُس کا ایک بڑا تخت ہے اور میں نے اُسے اور
اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور شیطان نے اُن کے اعمال
اُن کو خوبصورت کر کے دکھائے ہیں اور اُن کو سچے راستہ سے روک دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہدایت
نہیں پاتے اور اس بات پر مُصر ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہیں کریں گے وہ اللہ جو آسمانوں اور زمین
کی پوشیدہ تقدیر کو ظاہر کرتا ہے اور جو کچھ تم چُھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اُسے جانتا ہے حالانکہ اللہ وہ
ہے جس کے سِوا کوئی معبود نہیں اور وہ ایک بڑے تخت کا مالک ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا اچھا ہم
دیکھیں گے کہ تو نے سچ بولا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے۔ تو میرا یہ خط لے جا اور اِسے اُن کے
سامنے جا کر پیش کر دے اور پھر ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو جا اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

اِس قسم کا مضمون سورہ سبا رکوع ۲ میں بھی آتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ
وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ [۱۳] یعنی ہم نے داؤدؑ پر بھی
بڑا فضل کیا اور اُس کے زمانہ میں ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ اے پہاڑو! اس کے ساتھ چلو اور

پرندوں کو بھی حکم دے دیا کہ اُس کے ساتھ رہیں اور اس کے لئے ہم نے لوہا نرم کر دیا اور اُسے کہا کہ اس لوہے سے زِرہیں بناؤ اور ان کے حلقے چھوٹے رکھو اور نیک اعمال بجالاؤ میں تمہارے کاموں سے خوب واقف ہوں۔

اسی طرح سورہ انبیاء رکوع ٦ میں فرماتا ہے۔ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ○ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ۔ [14] ہم نے داؤدؑ کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا جو ہر وقت تسبیح کرتے تھے اور پرندے مسخر کر دیئے اور ہم یہ سب کچھ کرنے پر قادر تھے اور ہم نے اس کو تمہارے لئے لباس کا بنانا سکھلایا تا کہ وہ تمہیں لڑائی میں تکلیفوں سے بچائے پس کیا تم شکر گذار بنو گے؟

پھر سورہ صٓ رکوع ٢ میں آتا ہے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ○ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ○ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ○ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ [15] یعنی ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو جو بڑی طاقت کا مالک تھا اور ہماری درگاہ میں بار بار جھکتا تھا ہم نے اُس کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے جو صبح و شام تسبیح کرتے تھے۔ اسی طرح پرندے اُس کی خاطر اکٹھے کر دیئے تھے اور وہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی طرف جھکنے والے تھے اور ہم نے اُس کی سلطنت کو خوب مضبوط بنا دیا تھا اور اُسے حکمت دی تھی اور ایسے دلائل سکھائے تھے جو دشمن کا منہ بند کر دیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے قبضہ میں جِنّ بھی تھے، پرندے بھی تھے، پہاڑ بھی تھے۔ وہ چیونٹیوں کی زبان بھی جانتے تھے۔ ایک ہُدہُد بھی انہوں نے رکھا ہوا تھا جو اُن کے بڑے بڑے کام کرتا تھا۔

مفسّرین کی عجیب وغریب قیاس آرائیاں

اب جن لوگوں نے متشابہ کو محکم سے پڑھنے کی کوشش نہیں کی وہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کے قبضے میں پہاڑ تھے۔ جِنّ تھے، پرندے تھے، حیوانات تھے اور سب مل کر حضرت داؤدؑ کے ساتھ ذکرِ الٰہی کرتے تھے۔ جب وہ کہتے سُبْحَانَ اللّٰہِ تو پہاڑ بھی اور پرندے بھی

اور جنّ بھی اور حیوانات بھی سب سُبْحَانَ اللّٰہِ ، سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنے لگ جاتے۔ جیسے کشمیری واعظوں کا دستور ہے کہ لیکچر دیتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سستانے کے لئے کہہ دیتے ہیں پڑھو درود وہ بھی گویا اِسی طرح کرتے تھے۔ جب خود ذکرِ الٰہی کرتے کرتے تھک جاتے تو کہتے ہمالیہ! پڑھو درود اور وہ درود پڑھنے لگ جاتا۔ پھر جب انہیں آرام آجاتا تو کہتے چپ کرو اب میں خود درود پڑھتا ہوں۔ بعض کہتے ہیں پہاڑوں وغیرہ کا سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا کونسی بڑی بات ہے وہ تو باقاعدہ رکوع و سجود بھی کرتے تھے۔ جب حضرت داؤد سجدہ میں جاتے تو سارے پہاڑ، پرند اور چرند بھی سجدہ میں چلے جاتے اور جب وہ رکوع کرتے تو سب رکوع کرنے لگ جاتے۔ بعض کو اس تاویل سے بھی مزا نہیں آیا وہ کہتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ حضرت داؤد جہاں بھی جاتے پہاڑ آپ کے ساتھ چل پڑتے۔ حضرت داؤدؑ تو شام میں تھے اور یہ ہمالیہ، شوالک اور الپس سب آپ کے ساتھ ساتھ پھرا کرتے تھے۔ اسی طرح پرندے بھی مل کر تسبیح کرتے تھے۔ اُن دِنوں چڑیاں بھی چوں چوں نہیں کرتی تھیں، بکریاں مَیں مَیں نہیں کرتی تھیں بلکہ سُبْحَانَ اللّٰہِ ، سُبْحَانَ اللّٰہِ کیا کرتی تھیں۔ کوئی یہ نہ پوچھے کہ بکری کس طرح پرندہ ہوگیا؟ کیونکہ تفسیروں میں اِسی طرح لکھا ہے۔ غرض وہ عجیب زمانہ تھا۔ اسی طرح سلیمانؑ پر خدا تعالیٰ نے ایک اور مہربانی کی اور وہ یہ کہ جنّ اُن کے حوالے کر دیئے جو اُن کے اشارے پر کام کرتے۔ جب چلتے تو پرندے اُن کے سر پر اپنے پَر پھیلا کر سایہ کر دیتے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نَعُوْذُبِاللّٰہِ حضرت داؤدؑ بڑے شکّی طبیعت کے آدمی تھے۔ جب کہیں باہر جاتے تو اپنی بیویوں کو گھر میں بند کر کے جاتے۔ ایک دفعہ گھر میں آئے تو دیکھا کہ ایک جوان مضبوط آدمی اندر پھر رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر سخت خفا ہوئے اور کہنے لگے۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ اندر آگیا ہے۔ پھر اُس سے پوچھا کہ جب مکان کے تمام دروازے بند تھے تو تُو اندر کس طرح آ گیا؟ وہ کہنے لگا مَیں وہ ہوں جسے دروازوں کی ضرورت نہیں۔ آپ نے پوچھا کیا تُو ملک الموت ہے؟ اُس نے کہا ہاں اور یہ کہتے ہی اُس نے آپ کی جان نکال لی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب دفن کرنے لگے تو تمام پرندے اکٹھے ہوگئے اور انہوں نے آپ پر اپنے پَروں سے سایہ کیا۔

کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام تمام پرندوں کی بولیاں جانتے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیا جانوروں کی بولیاں جانتے تھے یا نہیں؟ تو مفسّرین نے اِس کا جواب یہ دیا ہے کہ جانتے تو تھے مگر

اختصار کے لحاظ سے صرف پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی تو لوگوں نے حضرت سلیمانؑ سے کہا چلیں اِستِسقاء کی نماز پڑھائیں۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ گھبراؤ نہیں بارش ہو جائے گی کیونکہ ایک چیونٹی پیٹھ کے بَل کھڑی ہو کر کہہ رہی تھی کہ خدایا! اگر بارش نہ ہوئی تو ہم مر جائیں گی۔ ایک دفعہ وہ وادیُ النمل میں سے گزرے تو چیونٹیوں کی ملکہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ مگر مفسّرین نے یہیں تک اپنی تحقیق نہیں رہنے دی انہوں نے چیونٹیوں کے قبیلوں کا بھی پتہ لگایا ہے اور کہتے ہیں جس طرح انسانوں میں مغل، راجپوت اور پٹھان وغیرہ ہوتے ہیں اِسی طرح چیونٹیوں کی قومیں اور قبائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ علم آپ کے کام آئے گا کہ چیونٹیوں کے ایک قبیلے کا نام شیسان ہے جو مفسرین نے لکھا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی جو سردار چیونٹی تھی وہ ایک پاؤں سے لنگڑی تھی اور اُس کا قد بھیڑ کے برابر تھا۔ یہ وہ واقعات ہیں جو استعارہ اور تشبیہہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مفسّرین کو گھڑنے پڑے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ چنانچہ مَیں باری باری ہر واقعہ کو لیتا ہوں اور سب سے پہلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا قصہ لیتا ہوں۔

پہاڑوں کی تسخیر سے کیا مراد ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے داؤدؑ کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ایسے قصوں کی ضرورت ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق اگر خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے اُس کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے تو اللہ تعالیٰ ہمارے متعلق بھی قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ
اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔[٦] یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے مومنو! اور اے کافرو اور منافقو! ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے سمندر مسخر کر دیئے ہیں جس میں کشتیاں اُس کے حکم سے چلتی ہیں تا کہ تم خدا کا فضل تلاش کرو اور صرف سمندر ہی نہیں آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس میں غور و فکر کرنے والوں کے

لئے بڑے بڑے نشانات ہیں۔ اب اس آیت سے حضرت داؤدؑ والی آیت بالکل حل ہو جاتی ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں خواہ دریا ہیں یا پہاڑ سب انسان کے لئے مسخر ہیں۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ پہاڑ میرے لئے بھی مسخر ہوں مگر میرے ساتھ ہمالیہ کی ایک اینٹ بھی نہ چلے اور داؤد کے ساتھ پہاڑ کا پہاڑ چلنے لگ جائے۔ اگر داؤد کے ساتھ یہ واقعات ہوئے ہیں تو ہمارے ساتھ بھی ہونے چاہئیں اور اگر ہمارے ساتھ نہیں ہوتے تو صاف پتہ لگ گیا کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔

پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کے معنے

اب رہا سوال تسبیح کا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں تو لکھا ہے پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے کیا اب بھی یہ چیزیں تسبیح کرتی ہیں؟ سو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ جمعہ میں دے دیا ہے۔ فرماتا ہے۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ۔ [کے] یعنی سورج بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہا ہے۔ چاند بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہا ہے۔ ستارے بھی تسبیح کر رہے ہیں۔ اسی طرح مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تسبیح کر رہے ہیں۔ یہ لیمپ بھی تسبیح کر رہا ہے۔ لاؤڈ سپیکر بھی تسبیح کر رہا ہے۔ اسی طرح درخت بھی تسبیح کر رہے ہیں۔ اُن کے پتے بھی تسبیح کر رہے ہیں۔ آم بھی تسبیح کر رہا ہے۔ کیلا بھی تسبیح کر رہا ہے بلکہ کیلے کا چھلکا جس کو ہم اُتار کر پھینک دیتے ہیں وہ بھی تسبیح کر رہا ہے۔ روٹی بھی تسبیح کر رہی ہے۔ تھالی بھی تسبیح کر رہی ہے۔ جب تم چائے پیتے ہو تو تمہارے ہونٹ بھی تسبیح کر رہے ہوتے ہیں۔ چائے بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ مصری یا کھانڈ بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ پیالی بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ پرچ بھی تسبیح کر رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح مکان بھی، چھت بھی، دیواریں بھی، دروازے بھی، وہ بستر جس پر تم لیٹتے ہو اُس بستر کی چادر بھی اور توشک اور رضائی بھی سب سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ کہہ رہی ہوتی ہیں اور جب ہر چیز سُبْحَانَ اللّٰهِ کہہ رہی ہے تو حضرت داؤدؑ کے لئے اگر یہی الفاظ آجائیں تو اس کے نئے معنی کیوں بن جاتے ہیں۔ دیکھ لو وہ دونوں باتیں جو حضرت داؤدؑ کے متعلق کہی گئی تھیں ہمارے لئے بھی موجود ہیں۔ ہمارے لئے بھی

خدا کہتا ہے کہ میں نے ہر چیز مسخر کردی اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہر چیز تسبیح کر رہی ہے بلکہ حضرت داؤدؑ کے لئے تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ پہاڑ اور پرندے تسبیح کرتے تھے مگر ہمارے لئے تو یہ کہا گیا ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب تسبیح کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تسبیح سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز یہ ثابت کر رہی ہے کہ خدا بے عیب ہے۔ چونکہ اسلام نے دنیا بھر سے عیب دُور کرنے تھے اس لئے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ تسبیح کر رہا ہے لیکن حضرت داؤد نے چونکہ صرف جبال سے عیب دُور کرنے تھے اور وہ ساری دنیا کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک محدود مقام کی طرف تھے اس لئے حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں صرف جبال نے تسبیح کی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سارے جہان کی طرف تھے اس لئے آپ نے فرمایا جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا [18] زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں جو تسبیح نہیں کر رہا۔ اس لئے ہم جہاں جائیں گے وہ مسجد بن جائے گی، پس يُسَبِّحُ لِلّٰهِ والے مضمون کو داؤد کے مضمون میں محدود کر کے صرف پہاڑوں تک رکھا گیا۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کے لئے تھے اور حضرت داؤدؑ صرف چند جبال کے لئے۔

باقی رہا اَوِّبِيْ مَعَهٗ کے الفاظ سے یہ استدلال کہ پہاڑ حضرت داؤدؑ کے ساتھ ان کی تسبیح میں شامل ہو جاتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل دنیا کا ذرّہ ذرّہ تسبیح میں شامل ہے۔ کوئی کہے کہ پھر حضرت داؤدؑ کی خصوصیت کیا رہی؟ تو یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں تو ان کی کوئی خصوصیت نہیں کہ پہاڑ اُن کے لئے مسخر تھے کیونکہ میں قرآن کریم سے ثابت کر چکا ہوں کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے یہ سب کا سب خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ہاں جس ملک کا خدا تعالیٰ کسی کو بادشاہ بنا دیتا ہے اُس میں اُسے عام انسانوں سے زیادہ عظمت حاصل ہوتی ہے۔ پس گو زمین و آسمان کی چیزیں حضرت داؤدؑ کے لئے اسی طرح مسخر تھیں جس طرح عام بنی نوع انسان کے لئے۔ لیکن حضرت داؤدؑ کو ایک زائد خصوصیت یہ حاصل تھی کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو بادشاہ بھی بنا دیا تھا۔ پس گو تسخیر بعینہٖ وہی ہے جو ہمارے لئے ہے مگر اس تسخیر کی عظمت میں فرق ہے۔

جبال سردارانِ قوم کو بھی کہتے ہیں

اب مَیں لُغت سے بتاتا ہوں کہ اس کے اور معنے بھی ہیں۔ چنانچہ جَبَلٌ کے معنے لُغت میں سَیِّدُ الْقَوْمِ کے لکھے ہیں۔[19] پس حضرت داؤدؑ کے لئے جِبَال مسخر کر دیئے کے معنی یہ تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام یہود کے وہ پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے اردگرد کے قبائل پر فتح پائی اور وہ ان کے ماتحت ہو گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہوا جس نے اپنی قوم کے علاوہ دوسری اقوام پر بھی حکومت کی ہو لیکن حضرت داؤدؑ پہلے بادشاہ ہیں جن کے اردگرد کے حکمران ان کے مُطیع ہو گئے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو یُسَبِّحْنَ کا لفظ آتا ہے۔ تم اس کے معنے مطیع کے کس طرح کرتے ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جِبَال چونکہ مؤنث ہے اس لئے یُسَبِّحْنَ کا لفظ آیا ہے ورنہ سردارانِ قوم کے معنے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ قومیں آپ کی مطیع ہو گئی تھیں۔

پرندوں کی تسبیح کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں

باقی رہے طَیْر۔ سو ان کے لئے تسبیح قرآن میں آئی ہی نہیں اور اِس امر کا کہیں ذکر نہیں کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے۔ دراصل لوگوں کو عربی زبان کے ایک معمولی قاعدہ سے ناواقفیت کی وجہ سے دھوکا لگ گیا اور وہ خیال کرنے لگے کہ جِبَال کے ساتھ طَیْر بھی تسبیح کیا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ یہاں طَیْرَ پر زبر ہے اور زبر دینے والا سَخَّرْ کا لفظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے داؤد کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے جو تسبیح کرتے تھے۔ اسی طرح ہم نے طَیْر بھی مسخر کر دیئے یہاں کسی تسبیح کا ذکر نہیں۔ صرف اتنے معنے لئے جا سکتے ہیں کہ انہیں پرندوں سے کام لینے کا علم آتا تھا۔ جیسے کبوتروں سے خبر رسانی وغیرہ کا کام لے لیا جاتا ہے۔ پس قرآن میں سَخَّرْنَا الطَّیْرَ ہے یُسَبِّحْنَ الطَّیْرَ نہیں ہے۔

دوسری آیت یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ

347

وَالْاِشْرَاقِ۔ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً یہاں بھی طَیْرَ کا ناصِبْ سَخَّرَ ہے اور میں حیران ہوں کہ مفسرین نے پرندوں کے تسبیح کرنے کے معنے کہاں سے لئے۔

تیسری آیت یہ ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ۔ ہم نے داؤدؑ پر بڑا فضل کیا اور پہاڑوں سے کہا اے پہاڑو! تم بھی اس کی تسبیح کا تسبیح سے جواب دیا کرو۔ اسی طرح ہم نے اسے پرندے بھی دیئے۔ گویا یہاں اٰتَيْنَا الطَّيْرَ فرمایا گیا ہے یہ نہیں کہا گیا کہ پرندے تسبیح کیا کرتے تھے۔ غرض طَیْرَ کا ناصب یا سَخَّرَ ہے یا اٰتٰی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے حضرت داؤدؑ کو طَیْرَ بھی دیئے تھے لیکن میں کہتا ہوں اگر اس کے معنے تسبیح کے بھی کرلو تو جب زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے تو پرندوں کی تسبیح میں کونسی بڑی بات ہو سکتی ہے۔ مجھے ہمیشہ آج کل کے علماء پر تعجب آیا کرتا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ یا حضرت سلیمانؑ یا حضرت عیسیٰ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ کے متعلق کوئی آیت آئے تو اس کے وہ اور معنی لے لیتے ہیں لیکن اگر ویسی ہی آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آجائے تو اس کے معنی اور کر لیتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہاڑ اس کے ساتھ ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ تو کہتے ہیں پہاڑ واقعہ میں سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ کیا کرتے تھے اور جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ کہے کہ ہم نے زمین و آسمان آپ کے لئے مسخر کر دیئے تو کہیں گے یہاں تشبیہہ مراد ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ذکر آئے کہ انہوں نے مُردے زندہ کئے تو کہیں گے یہاں مُردوں سے روحانی مُردے مراد ہیں لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اگر یہ الفاظ آجائیں تو جب تک وہ یہ نہ منوالیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مُردوں کے نتھنوں میں پھونک مار کر انہیں زندہ کر دیا تھا، اُس وقت تک انہیں چین ہی نہیں آتا۔

جنّات کا ذکر

اِس کے بعد مَیں جنّوں کو لیتا ہوں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت میرے سامنے ایک ایسے دوست بیٹھے ہیں جو جنوں کے قابض کہلاتے ہیں اور بائیں طرف وہ بیٹھے ہیں جو کوشش کرتے رہتے ہیں کہ جنّ اُن کے قبضہ میں آجائیں۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ اگر میں ان کے خلافِ طبیعت کوئی

بات کہہ دوں تو وہ مجھے معاف کریں گے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھی یا بُری کوئی مخلوق جنّ ضرور ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر سوال یہ نہیں کہ جنّ کوئی مخلوق ہے یا نہیں بلکہ سوال اُن جنوں کا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے ساتھ تھے اور حضرت سلیمانؑ کے متعلق اُن جنّوں کا ذکر ہے جن کا باقاعدہ لشکر تھا۔ وہ خبریں لالا کر دیا کرتے تھے، وہ باقاعدہ لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے حتّٰی کہ جنّوں کے پیروں کے نیچے چیونٹیاں بھی کچلی جاتی تھیں۔ پس اِس وقت سوال اُن جنوں کا ہے جو ہر وقت حاضر رہتے تھے اور جن کی فوجیں رائٹ لیفٹ کرتی رہتی تھیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جنوں کی آمد

اب سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا قرآن میں حضرت سلیمان کے متعلق ہی یہ ذکر آیا ہے یا اور کسی نبی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اُس کے پاس جنّ آئے۔ سو جب ہم اس غرض کے لئے قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو سورہ احقاف میں ہمیں یہ آیات نظر آتی ہیں۔ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ ؎٢ یعنی اُس وقت کو بھی یاد کرو جب ہم جنوں میں سے کچھ لوگ جو قرآن سننے کی خواہش رکھتے تھے تیری طرف پھیر کر لے آئے۔ جب وہ تیری مجلس میں پہنچے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا خاموش ہو جاؤ تا کہ قرآن کی آواز ہمارے کانوں میں اچھی طرح پڑے۔ جب قرآن کی تلاوت ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے اور انہوں نے اسلام کی اشاعت شروع کر دی اور اپنی قوم سے کہا اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب کی تلاوت سُنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد اُتاری گئی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ سچا نبی تھا اور اُس نے جو کچھ کہا تھا خدا کی طرف سے کہا تھا۔ یہ کتاب حق کی طرف بُلاتی ہے اور سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ تعالیٰ کے مُنادی کی آواز کو سُنو اور

اُسے قبول کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنّ تورات پر، حضرت موسیٰؑ پر، قرآن پر اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ پس حضرت سلیمانؑ ہی ایک ایسے نبی نہیں جن پر جنّ ایمان لائے بلکہ موسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے کہ جنّات آپ پر ایمان لائے مگر افسوس اُن لوگوں پر جو سلیمانؑ کے جنّوں کے تو عجیب عجیب قصّے سناتے ہیں۔ کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام قالین پر بیٹھ جاتے اور چار جنّوں کو چاروں کونے پکڑوا دیتے اور وہ انہیں اُڑا کر آسمانوں کی سیر کراتے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو جنّ ایمان لائے اُن کے متعلق یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبھی ایسی مدد کی ہو حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا کر سفر کرتے تھے۔ آپ کے صحابہؓ کو کئی دفعہ سواریاں نہ ملتیں اور وہ روتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ ہمارے لئے کسی سواری کا انتظام فرما دیجئے تو ہم جانے کے لئے حاضر ہیں۔ کئی دفعہ صحابہؓ نے ننگے پیر لمبے لمبے سفر کئے ہیں مگر یہ تمام دُکھ اور تکلیفیں دیکھنے کے باوجود اُن سنگدل جنّوں کا دل نہ پسیجا اور انہوں نے آپ کی کوئی مدد نہ کی۔ حضرت سلیمانؑ کے وقت تو لشکر کا لشکر اُٹھا کر وہ دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے اور یہاں ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ دس بیس مہاجرین کو ہی اُٹھا کر میدانِ جنگ میں پہنچا دیتے۔

ان الفاظ کو استعارہ نہ سمجھنے والوں کی ایک دلیل

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنّ غیر از انسان وجود ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ پر ایمان لائے تھے مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان معنوں کو قرآن کریم تسلیم کرتا ہے۔ اگر یہ ایک استعارہ ہے تو یقیناً قرآن کریم نے اس کو اپنی کسی دوسری آیت میں حل کیا ہوگا اور استعارہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں قرآن کریم کی دو آیتیں باہم ٹکرا جائیں گی اور اس طرح قرآن میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ پس ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس کو استعارہ تسلیم نہ کرنے سے قرآن میں

اختلاف پیدا ہوتا ہے یا استعارہ تسلیم کر کے۔ جو لوگ استعارہ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے شیطان کا لفظ آتا ہے۔ جس طرح شیطان سے مراد ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے علیحدہ ہے اسی طرح جنّ بھی ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے الگ ہے حالانکہ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ [41] میں مفسّرین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ اس جگہ شیاطین سے مراد یہودی اور اُن کے بڑے بڑے سردار ہیں۔ پس اگر انسان شیطان بن سکتا ہے تو انسان جنّ کیوں نہیں بن سکتا؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط [42] یعنی ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں شیطان آدمیوں میں سے بھی اور جنّوں میں سے بھی جو لوگوں کو مخالفت پر اُکساتے اور انہیں نبی اور اُس کی جماعت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ انسان بھی شیطان ہوتے ہیں۔ پس اگر شیاطین الانس ہو سکتے ہیں تو جِنّ الانس کیوں نہیں ہو سکتے۔ یعنی جس طرح انسانوں میں سے شیطان کہلانے والے پیدا ہو سکتے ہیں اسی طرح ان میں سے جنّ کہلانے والے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ پس قرآن سے ہی پتہ لگ گیا کہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہی جنّ نہیں تھے بلکہ حضرت موسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جنّ ایمان لائے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت انسانوں کی طرف تھی نہ کہ جنّوں کی طرف

اب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کن کی طرف ہوئی تھی؟ اللہ تعالیٰ سورۃ نساء میں فرماتا ہے۔ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا [43] یعنی ہم نے تجھے تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس آیت میں صاف طور پر بتایا ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے حالانکہ اگر آدمیوں کے علاوہ کوئی اور نرالی مخلوق بھی جسے جنّ کہتے ہیں آپ پر ایمان لائی تھی تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ وَالْجِنِّ مگر وہ یہ نہیں فرماتا بلکہ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھے آدمیوں کے لئے بھیجا ہے۔ پس جب آدمیوں کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے تھے تو صاف پتہ لگ گیا کہ جہاں یہ ذکر ہے کہ جنّ آپ پر

ایمان لائے وہاں ان سے جِنِّ الْاِنس ہی مراد ہیں۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ [24] یعنی اے میری قوم! تم نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا کہ ایک بچھڑے کو پوجا۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بنی اسرائیل تھے جنہوں نے بچھڑے کی پرستش کی، جنّ نہیں تھے حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ جنّ آپ پر ایمان لائے تھے۔ پس صاف ثابت ہوا کہ ان جنّوں سے آدمی جنّ ہی مراد تھے نہ کہ وہ جنّ جن کا نقشہ عام لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں جس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہؓ ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ ایسی خصوصیتیں دی گئی ہیں جو پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً کہ پہلے ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً [25] مگر میں روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور پر بیان فرماتے ہیں کہ انبیائے سابقین میں ایک نبی بھی ایسا نہیں جو اپنی قوم کے سوا کسی اور قوم کی طرف مبعوث ہوا ہو لیکن مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ جنوں اور طیور کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اگر واقعہ میں حضرت سلیمانؑ جنوں اور طیور کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ درجہ میں بڑھ گئے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

جنّوں کے انسان ہونے پر بعض اور دلائل

پھر اگر یہ جنّ غیر از انسان ہیں تو وہ مخاطب کیونکر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ [26] فرماتا ہے جب قیامت کے دن سب لوگ جمع ہونگے تو ہم جنّوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے کہ اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں میں سے اکثر لوگوں کو اپنے قابو میں کیا ہوا تھا۔ ہم تو جنوں کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ جنوں نے اکثروں کو اپنے قابو میں کیا ہوا ہے حالانکہ ہم تلاش کرتے ہیں تو ملتے نہیں۔ لوگ وظیفے پڑھتے ہیں، چلّہ کشیاں کرتے ہیں اور جب ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے

اور خشکی سے کان بجنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں جنّ آ گیا حالانکہ اُس وقت ان کا دماغ بگڑ چکا ہوتا ہے۔ تروتازہ دماغ کے ہوتے ہوئے جنّ کبھی انسان کے پاس نہیں آتے۔

اس جگہ جنوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْإِنْسِ کہ ان کے اکثر انسانوں سے تعلقات ہیں اور انسان بھی کہیں گے کہ ہم ان سے بڑا فائدہ اُٹھاتے رہے مگر تم اپنے محلے اور گاؤں میں پھر کر لوگوں سے دریافت کرلو کہ کیا پچاس یا اکاون فیصدی لوگ جنوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سو میں سے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ میں جنوں سے فائدہ اُٹھاتا ہوں اور میرے ان سے تعلقات ہیں۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس جگہ جنّ سے مراد انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہی بعض جنّ مراد ہیں اور انسانی جنّوں کی دوستیاں بڑی کثرت سے نظر آتی ہیں۔

قرآن کریم سے ثبوت کہ جنّ انسانوں کے گروہ کا ہی نام ہے

پھر اس سے بڑھ کر ایک اور دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قیامت کے دن دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ [٢٧] یعنی اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! جو ہمارے سامنے کھڑے ہو بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس ایسے رسول جو تم ہی میں سے تھے نہیں آئے؟ اب بتاؤ جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم پر بعض جنّ بھی ایمان لائے اور دوسری طرف یہ فرماتا ہے کہ ہمارا رسول بھی ان ہی میں سے تھا تو کیا اس سے صاف ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جنّ بھی انسان تھے کوئی غیر مرئی وجود نہیں تھے۔ پھر یہیں تک بات ختم نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا [٢٨] وہ تمہیں انذار بھی کرتے تھے اور اس دن سے ڈراتے تھے۔ گویا حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کو ڈرایا بھی کرتے تھے اور انہیں یوم آخرت اور اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا کرتے تھے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنّ جنّ الانس تھے جس طرح شیاطین الانس ہوتے ہیں کوئی علیحدہ قسم کی مخلوق نہیں تھے۔

مومن جنّوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدد کیوں نہ کی؟

اب ایک اور بات سنو۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ[29] یعنی اے رسول! ہم نے تجھے اپنی صفات کے لئے گواہ اور مومنوں کے لئے مبشر اور کافروں کے لئے نذیر بنا کر بھیجا ہے تا کہ تم اس کے ذریعہ اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی عزت بجا لاؤ۔ اب جب کہ جنّ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے تو کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ ان جنوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کبھی مدد کی ہو۔ ایک معمولی مُلّا کے لئے تو جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے وہ انگور کے خوشے لے آتے ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ لائے اور آپ کو بسا اوقات کئی کئی وقت کے فاقے برداشت کرنے پڑے۔ ایک دفعہ آپ کے چہرہ پر ضُعف کے آثار دیکھ کر صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک صحابیؓ نے بکری ذبح کی اور آپ کو اور بعض اور صحابہؓ کو کھانا کھلایا مگر ایسے مواقع میں سے کسی ایک موقع پر بھی جنوں نے مدد نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں وہ بڑے ہی شقی القلب جنّ تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن پر وہ ایمان لائے تھے ان کو تو انہوں نے ایک روٹی بھی نہ کھلائی اور آج کے مولویوں کو سیب اور انگور کھلاتے ہیں پھر وہ مومن کس طرح ہو گئے؟ وہ تو پکّے کافر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ جنّ کوئی ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے نرالی ہے۔ وہ جنّ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ بھی انسان ہی تھے اور جس طرح اور لوگوں نے آپ کی مدد کی وہ بھی مدد کرتے رہے۔ اگر کوئی نرالی مخلوق مانی جائے تو پھر اس سوال کا حل کرنا اُن لوگوں کے ذمہ ہوگا جو جنات کے قائل ہیں کہ وجہ کیا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور قرآن میں انہیں یہ حکم تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدد کریں۔

بنی نوع انسان کے علاوہ دوسری مخلوق شریعت پر ایمان لانے کی پابند نہیں

پھر اس سے بڑھ کر ایک اور دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب میں بطور قاعدہ کلّیہ کے فرماتا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۖ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ [۳۳] یعنی ہم نے اپنی شریعت اور کلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوق کے سامنے پیش کیا اور کہا کوئی ہے جو اِسے مانے اور اس پر عمل کرے؟ اس پر تمام آسمانی مخلوق نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم یہ بارِ امانت اُٹھانے کے ہرگز اہل نہیں۔ پھر ہم نے زمینوں کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا اور کہا۔ لو! یہ بوجھ اُٹھاتے ہو؟ انہوں نے بھی کہا ہرگز نہیں۔ پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے بھی انکار کیا۔ حالانکہ لوگ عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ جِنّ پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا سارے ڈر گئے اور کسی نے بھی اس ذمہ داری کو اُٹھانے کی جرأت نہ کی فَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ صرف ایک انسان آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ مجھے شریعت دیجئے مَیں اِس پر عمل کر کے دکھا دونگا۔ فرماتا ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا کیونکہ وہ ہمارے عشق میں سرشار اور عواقب سے بے پرواتھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ بوجھ کتنا بڑا ہے بلکہ شوق سے اُسے اُٹھانے کے لئے آگے نکل آیا۔ اب دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ شریعت کو اُٹھانے والا صرف انسان ہے اور کوئی شریعت کا مکلّف نہیں۔ پھر جب کہ انسان کو ہی خدا نے شریعت دی تو سوال یہ ہے کہ اگر جِنّ غیر از انسان ہیں تو وہ کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر اپنے ایمان کا کیوں اظہار کیا؟ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ غیر از انسان تھے تو خدا تعالیٰ کا کلام باطل ٹھہرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ انسان کے سوا سب مخلوق نے اِس شریعت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جب کہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ جِنّ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ یہاں جِنّ سے مراد جِنّ الْاِنس ہی ہیں۔ ایسی مخلوق مراد نہیں جو انسانوں کے علاوہ ہو اور نہ میں ایسے جِنوں کا قائل ہوں جو انسانوں سے آ کر چمٹ جاتے ہیں۔ میرے سامنے ہی اِس وقت ایک دوست بیٹھے ہیں جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی خدمت میں لکھا کہ میری ہمشیرہ کے پاس جنّ آتے ہیں اور وہ آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں لکھا کہ آپ جنوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ ایک عورت کو کیوں ستاتے ہو اگر ستانا ہی ہے تو مولوی محمد حسین بٹالوی یا مولوی ثناء اللہ کو جا کر ستائیں ایک غریب عورت کو تنگ کرنے سے کیا فائدہ؟ بیشک کئی ایسے لوگ ہونگے جو انگریزی تعلیم کے ماتحت پہلے ہی اِس امر کے قائل ہوں کہ ایسے جنات کا کوئی وجود نہیں لیکن مومن کے سامنے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اُس کی عقل کیا کہتی ہے بلکہ سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ اگر قرآن کہتا ہے کہ جنّ موجود ہیں تو ہم کہیں گے اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا اور اگر قرآن سے ثابت ہو کہ انسانوں کے علاوہ جنّ کوئی مخلوق نہیں تو پھر ہمیں یہی بات ماننی پڑے گی۔

متکبّر قوموں اور اُمراء کو بھی جنّ کہا جاتا ہے

اصل بات یہ ہے کہ بعض قومیں بڑی متکبر ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا اور بلند مرتبہ سمجھتی ہیں۔ ایسی قوموں کے بڑے بڑے صنادید کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے دروازے پر لے آتا ہے اس لئے یہ لوگ جنّ کہلاتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کا ہی واقعہ ہے۔ ایک نہایت جاہل شخص یہاں ہوا کرتا تھا پیرا اُس کا نام تھا۔ اُسے دو چار آنے کے پیسے اگر کوئی شخص دے دیتا تو وہ دال میں مٹی کے تیل کی آدھی بوتل ڈال کر کھا جاتا۔ دین کی معمولی معمولی باتوں سے بھی اتنا ناواقف تھا کہ حضرت خلیفہ اوّلؓ نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ تیرا مذہب کیا ہے؟ وہ اُس وقت تو خاموش رہا مگر دوسرے تیسرے دن آپ کے پاس ایک کارڈ لایا کہ ہمارے گاؤں کے نمبر دار کو لکھ دیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا لکھنا ہے؟ تو وہ کہنے لگا آپ نے جو میرا مذہب دریافت کیا تھا۔ میں نمبر دار کو لکھ کر دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میرا مذہب کیا ہے؟ حضرت خلیفہ اوّلؓ ہمیشہ اُس کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ نماز پڑھو مگر وہ کہتا کہ مجھے نماز نہیں آتی صرف سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا آتا ہے۔ خیر ایک دن حضرت خلیفہ اوّلؓ نے پیرے سے کہا کہ اگر تم ایک دن پورے پانچ وقت کی نمازیں جماعت سے ادا کرو تو میں تمہیں دو روپے انعام دونگا۔ اُس نے عشاء سے نماز شروع کی اور اگلی مغرب کو پوری پانچ ہوتی تھیں۔ اُن دنوں مہمان چونکہ تھوڑے ہوتے

تھے اس لئے اُن کا کھانا ہمارے گھر میں ہی تیار ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت جب کھانا تیار ہوا تو اندر سے خادمہ نے آواز دی کہ پیرے! کھانا لے جاؤ۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور یہ اُس کی پانچویں نماز تھی لیکن بُلانے والی عورت کو اِس کا علم نہ تھا اِس لئے وہ برابر آوازیں دیتی گئی۔ اِس پر پیرا نماز میں ہی زور سے کہنے لگا۔ ''ٹھہیر جا۔ التحیات ختم کر کے آنداہاں۔''

ایک دفعہ کسی کام کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے بٹالہ بھیجا۔ وہاں اسے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی مل گئے۔ وہ اکثر لوگوں کو قادیان آنے سے باز رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اُس دن اتفاقاً انہیں اور کوئی نہ ملا تو انہوں نے پیرے کو ہی پکڑ لیا اور کہا۔ پیرے! تو کیوں قادیان بیٹھا ہے؟ پیرے نے جواب دیا مولوی صاحب! میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں، ہاں ایک بات ہے جو میں جانتا ہوں اور وہ یہ کہ مرزا صاحب قادیان میں بیٹھے ہیں اور لوگ دُور دُور سے یکّوں میں دھکے کھا کھا کے ان کے پاس پہنچتے ہیں مگر آپ بٹالہ میں رہتے ہیں جہاں لوگ آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں مگر آپ کے پاس کوئی نہیں آتا۔ حتّٰی کہ روزانہ لوگوں کو سمجھانے کے لئے آپ خود سٹیشن پر آتے ہیں اور شاید اس کوشش میں آپ کی جوتی بھی گِھس گئی ہوگی لیکن لوگ آپ کی بات نہیں مانتے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ لوگ مرزا صاحب کی طرف اِس طرح کھچے چلے جاتے ہیں اور آپ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ غرض اِس قسم کے آدمی ہی جِنّ ہوتے ہیں جو کسی کی بات نہیں مانتے اور دوسرے کی اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے مگر جب انبیاء کے سامنے آتے ہیں تو یکدم ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کو ہی دیکھ لو۔ وہ ابتداء میں اسلام کی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ایک دفعہ تو انہیں یہاں تک جوش آیا کہ تلوار سونت لی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ کے قدموں میں گر گئے۔ تو بعض طبائع ناری ہوتی ہیں مگر جب نبیوں کے سامنے جاتی ہیں تو ٹھنڈی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی طبیعت رکھنے والے انسانوں کو عربی زبان میں جِنّ کہتے ہیں۔ اسی طرح بڑے لوگوں کو اس لحاظ سے بھی جِنّ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نگاہ سے بالعموم مخفی رہتے ہیں۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں اُن کی رہائش ہوتی ہے اور اُن کے دروازہ پر لوگ آسانی سے نہیں پہنچ سکتے۔

نملہ سے کیا مراد ہے؟

اب اس کے بعد میں نملہ کو لیتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں کہ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ جب وہ وادی نملہ میں پہنچے تو ایک نملہ نے کہا اے نملہ قوم! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تمہارے حالات کو نہ جانتے ہوئے تمہیں اپنے پاؤں کے نیچے مَسل دیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ نملہ سے کیا مراد ہے؟

پہلی بات جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نملہ سے مراد چیونٹی نہیں یہ ہے کہ ذکر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو مَنْطِقَ الطَّيْرِ سکھائی مگر اس کی دلیل یہ دی گئی کہ چیونٹی بولی تو حضرت سلیمانؑ سمجھ گئے کہ اُس نے کیا کہا ہے۔ حالانکہ جب دعویٰ یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی آتی تھی تو دلیل میں مثلاً یہ بات پیش کرنی چاہئے تھی کہ فلاں موقع پر بُلبل بولی اور حضرت سلیمانؑ نے کہا بُلبل یہ کہہ رہی ہے مگر وہ کہتے ہیں چیونٹی بولی تو حضرت سلیمانؑ کو سمجھ آ گئی حالانکہ چیونٹی پرندہ نہیں۔ پس نملہ سے مراد اگر چیونٹی لی جائے تو یہ دلیل بالکل عقل میں نہیں آسکتی کیونکہ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو مَنْطِقَ الطَّيْرِ آتی تھی اور وہ اس کو سمجھتے تھے مگر بولنے لگ جاتی ہے نملہ اور وہ اس کی بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ غرض پہلی بات جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نملہ کیا چیز ہے؟

دوسری چیز یہ دیکھنے والی ہے کہ یہاں حَطَمَ کا لفظ آیا ہے اور حَطَمَ کے معنی ہوتے ہیں توڑنے اور غصہ سے حملہ کرنے کے۔ عام طور پر لوگ اِس کا ترجمہ یہ کر دیتے ہیں کہ سلیمانؑ اور اُس کا لشکر تمہیں اپنے پیروں کے نیچے نہ مَسل دے مگر یہ حَطَمَ کے صحیح معنی نہیں۔ عربی میں حطم کے معنی توڑ دینے اور غصہ میں حملہ کر دینے کے ہیں۔ [۱۲۷] چنانچہ قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کا ایک نام حُطَمَہ بھی رکھا گیا ہے کیونکہ وہ جلا دیتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آگ کے پاؤں ہو گئے اور وہ دوزخیوں کو اپنے پیروں کے نیچے مَسل ڈالے گی۔ تو لَا يَحْطِمَنَّكُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ایسا نہ ہو کہ

سلیمانؑ اور اُس کا لشکر تمہیں توڑ دے یا غصہ سے تم پر حملہ کر دے اور تمہیں تباہ کر دے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو اتنے بڑے نبی تھے جن کے پاس جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر در لشکر تھے کیا اُن کا سارا غصہ چیونٹیوں پر ہی نکلنا تھا اور کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ چیونٹیوں پر حملہ کرنے لگ جائیں گے؟ میں بتا چکا ہوں کہ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ کے معنی پیروں میں مَسل دینے کے نہیں بلکہ طاقت کو توڑ دینے اور حملہ آور ہونے کے ہیں۔ اسی لئے عربی زبان میں قحط کو حاطوم کہتے ہیں [۳۲] کیونکہ اس سے ملک کی طاقت ٹوٹ جاتی ہے۔ اگر یہ معنی کئے جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چیونٹیوں نے ایک دوسری سے کہا کہ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُس کا لشکر کدالیں لیکر آ جائے اور ہماری بلوں کو کھود کھود کر غلّہ کے دانے نکال لے اور اِس طرح ہماری طاقت کو توڑ دے مگر کیا عقلمندان معنوں کو تسلیم کر سکتا ہے؟

تیسری دلیل جو نہایت ہی بیّن اور واضح ہے وہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جتنے صیغے استعمال کئے ہیں سب وہ ہیں جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اُدۡخُلُوۡا کا لفظ آیا ہے حالانکہ چیونٹیوں کے لحاظ سے اُدۡخُلۡنَ کا لفظ آنا چاہئے تھا۔ اسی طرح لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ میں کُمۡ کا لفظ آتا ہے حالانکہ کُنَّ کا لفظ آنا چاہئے تھا۔ پس قرآن مجید کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ کوئی انسان تھے جن کے لئے کُمۡ اور اُدۡخُلُوۡا وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ گھروں میں گھس جاؤ اس کا ثبوت حدیث سے بھی ملتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی لشکر کہیں گذرے اور وہاں کے لوگ اپنے گھروں میں گھس جائیں اور دروازے بند کر لیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ فتح مکّہ کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جائیں گے اور دروازے بند کر لیں گے ان سے کوئی باز پُرس نہیں ہوگی۔ یہی نملہ نے کہا کہ اپنے اپنے گھروں میں جاؤ اور دروازے بند کر لو۔ حضرت سلیمانؑ سمجھ جائیں گے کہ یہ میرا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم باہر رہیں گے تو ممکن ہے وہ حملہ کر دیں۔ حضرت سلیمانؑ نے جب یہ نظارہ دیکھا تو وہ ہنسے اور انہوں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میری نیکی اور تقویٰ کی کتنی دُور دُور خبر پہنچی ہوئی ہے۔ یہ قوم بھی جو اتنی دُور رہتی ہے سمجھتی ہے کہ سلیمانؑ ظالمانہ طور پر حملے نہیں کیا کرتا۔ اگر ہم اپنے دروازے بند کر لیں گے تو یہ ہم پر حملہ نہیں

کرے گا اور ہماری کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

وادی النَّمل کی تحقیق

باقی رہا وَادِ النَّمْلِ کے الفاظ سو یاد رکھنا چاہئے کہ تاج العروس جو لغت کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ شام کے ملک میں جبرین اور عسقلان کے درمیان ایک علاقہ ہے جسے وادی النمل کہا جاتا ہے۔ ۳۳ اور عسقلان کے متعلق تقویم البلدان صفحہ ۲۳۸ پر لکھا ہے کہ عسقلان ساحل سمندر کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک شہر تھا جو غزہ سے جو سینا کے ملحق فلسطین کی ایک بندرگاہ ہے بارہ میل اوپر شمال کی طرف واقع ہے اور جبرین شمال کی طرف کا ایک شہر معلوم ہوتا ہے جو ولایتِ دمشق میں واقع ہے۔ ۳۴ پس وادی النمل ساحلِ سمندر پر یروشلم کے مقابل پر یا اس کے قریب دمشق سے حجاز کی طرف آتے ہوئے ایک وادی ہے جو اندازاً دمشق سے سَو میل نیچے کی طرف ہوگی۔ ان علاقوں میں حضرت سلیمانؑ کے وقت تک عرب اور مدین کے قبائل بہت بستے تھے۔ (مقام کی وضاحت کے لئے دیکھو نقشہ فلسطین وشام بعہد قدیم و عہد جدید نیلسنز انسائیکلوپیڈیا)

اب رہ گیا نملہ سو قاموس میں اَلْبَرْقُ کے ماتحت لکھا ہے۔ وَالْاَبْرَقَةُ مِنْ مِّيَاهِ نُمْلَةَ ۳۵ یعنی ابرقہ ایک وادی ہے جہاں نملہ قوم کے چشمے ہیں۔ غرض نملہ قوم بھی مل گئی، وَادِی النمل کا بھی پتہ لگ گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ علاقہ شام میں حضرت سلمانؑ کے علاقہ کے نزدیک تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے نام پُرانے زمانہ میں بڑے مقبول تھے۔ چنانچہ جنوبی امریکہ میں بعض قوموں کے نام بھیڑیا، سانپ، بچھو اور کنکھجورو غیرہ ہوا کرتے تھے بلکہ ہمارے ملک میں ہی ایک قوم کا نام کاڈھا ہے۔ نورالدین کاڈھا لاہور کے ایک مشہور شخص ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایک قوم کا نام کیڑے ہے ایک کا نام مکوڑے ہے۔ کشمیر میں ایک قوم کا نام ہاپت ہے جس کے معنی ریچھ کے ہیں اِسی طرح حضرت سلیمانؑ جس جگہ سے گزرے وہاں جو قوم رہتی تھی اُس کا نام نملہ تھا۔

خَلقِ طَیر کا مسئلہ

اب مَیں طَیر کی بحث کو لیتا ہوں۔ طَیر کے متعلق جو امور قابلِ غور ہیں ان میں سے ایک اہم امر خلقِ طَیر کا مسئلہ ہے۔ مَیں اس کے متعلق گزشتہ سے پیوستہ سال جلسہ سالانہ کی تقریر میں روشنی ڈال چکا ہوں لیکن مضمون کی تکمیل کے لئے پھر مختصراً اسے دُہرا دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ۔ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ [۳۶] یعنی ہم نے مریم کو الہام کیا کہ ہم تجھے ایک بیٹا عطا کریں گے جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکمت کی باتیں سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اُسے اِس پیغام کے ساتھ رسول بنا کر بھیجے گا کہ مَیں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے یہ نشان لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے فائدہ کے لئے پانی ملی ہوئی مٹی یعنی طینی خصلت رکھنے والوں میں سے پرندہ کے پیدا کرنے کی طرح ایک مخلوق تجویز کروں گا۔ پھر مَیں اُس میں ایک نئی روح پھونکوں گا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُڑنے والے ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ ۔ [۳۷] یعنی اللہ تعالیٰ حضرت مسیح سے فرمائے گا کہ تو اُس وقت کو بھی یاد کر جب کہ میں نے تجھے کتاب اور حکمت سکھائی اِسی طرح توراۃ اور انجیل سکھائی اور اُس وقت کو بھی یاد کر جبکہ تو میرے حکم سے طینی خصلت رکھنے والے افراد میں سے پرندہ کے پیدا کرنے کی طرح ایک مخلوق تجویز کرتا تھا پھر تو اُس میں پھونک مارتا تھا جس سے وہ میرے حکم سے اُڑنے کے قابل ہو جاتا۔

اب یہاں دونوں جگہ پرندے کا ذکر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ استعارہ ہے یا حقیقت؟ اگر حقیقتاً پرندہ مان کر کوئی دوسری آیت باطل ہوتی ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ استعارہ ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم قرآن کی اور آیات پر نگاہ دَوڑاتے ہیں تو ایک آیت ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ [۳۸] یعنی کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک تجویز کئے ہیں

جنہوں نے اُس جیسی کچھ مخلوق پیدا کی ہے جس کی وجہ سے اُس کی اور دوسروں کی پیدا کردہ مخلوق آپس میں مل گئی ہے اور ان کے لئے مشتبہ صورت پیدا ہو گئی ہے۔ تُو اُن سے کہہ دے کہ اللہ ہی ہر ایک چیز کا خالق ہے اور وہ کامل طور پر یکتا اور ہر ایک چیز پر کامل اقتدار رکھنے والا ہے۔ اب دیکھو! اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ وہ لوگ جن کو خدا کا شریک قرار دیا جاتا ہے اور جن کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے اندر صفتِ خلق رکھتے ہیں ان کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا محض بہتان ہے۔ جس قسم کی پیدائش خدا تعالیٰ کرتا ہے اُس قسم کی پیدائش اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اب اگر یہ مانا جائے کہ حضرت مسیح علیہ السلام واقعہ میں پرندے پیدا کیا کرتے تھے تو سورۃ رعد کی یہ آیت غلط ہو جاتی ہے اور اگر یہ آیت سچی ہو تو لازماً ماننا پڑے گا کہ خَلْقِ طَیر کے وہ معنی غلط ہیں جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں اور ماننا پڑے گا کہ یہ کوئی استعارہ ہے۔ تبھی یہ آیتیں آپس میں متضاد نظر آتی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا تشریح ہے؟

كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ کا مفہوم

سو اس کی تشریح کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید میں كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ کے الفاظ آتے ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح پرندہ بچے پیدا کیا کرتا ہے اسی طرح میں بھی کرتا ہوں مگر لوگوں نے غلطی سے اس کے یہ معنی سمجھ لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام پرندے پیدا کیا کرتے تھے۔ اب یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ پرندہ پہلے انڈے لیتا ہے پھر اس پر بیٹھتا اور انہیں گرمی پہنچاتا ہے تب ان سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مَیں بھی ایسے لوگوں کو جن کی مٹی میں الہام کا پانی شامل ہو اپنی صُحبت میں لیتا ہوں اور اپنے بازوؤں کے نیچے رکھ کر ایسی روحانیت ان میں پیدا کر دیتا ہوں کہ تھوڑے ہی دِنوں میں وہ خدا تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب دیکھو قرآن کریم کا مضمون کتنا بلند ہو گیا اور اس کے معنی کیسے اعلیٰ ہو گئے۔ وہ بھی کیا معنی تھے کہ آپ چمگادڑیں بناتے پھرتے تھے اور پھر قرآن میں حضرت مسیح نے کہیں نہیں فرمایا کہ مَیں پرندے بناتا ہوں بلکہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ مَیں كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بناتا ہوں یعنی جس طرح پرندہ انڈوں کو سیتا ہے اسی طرح مَیں بھی لوگوں کو اپنی تربیت میں لیتا ہوں اور جن میں ترقی کی

قابلیت ہوتی ہے وہ اُڑنے لگ جاتے ہیں۔ پھر زیادہ سے زیادہ پرندے چالیس دن تک انڈوں کو سیتے رہتے ہیں بلکہ بعض تو اس سے بھی کم عرصہ میں پیدا ہو جاتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی اعلان کیا کہ جو شخص میرے معجزات کا منکر ہو، وہ چالیس دن میرے پاس رہے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور کوئی نہ کوئی معجزہ دکھا دے گا۔ اب جو شخص فطرتِ صحیحہ رکھتا ہے وہ تو بہت جلد نبی کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے مگر جس طرح سخت چھلکے کا انڈا چالیس دن لیتا ہے اسی طرح نبی کی صحبت میں اگر کوئی سخت دل انسان بھی چالیس دن رہے تو وہ کوئی نہ کوئی معجزہ دیکھ لیتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے نصیحت فرمائی ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ [۹] یعنی اے وہ لوگو! جن میں نیکی کی قابلیت تو ہے مگر تم ابھی انڈے کی حد تک ہی ہو پرندے نہیں بنے تم کسی صادق کے پَروں کے نیچے چلے جاؤ تم تھوڑے دنوں میں ہی پرندے بن جاؤ گے۔

ایک لطیفہ

تَشَابَهَ الْخَلْقُ کے الفاظ پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِسی آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی مولوی کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے جو پرندے بنائے تھے وہ کہاں چلے گئے؟ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ممکن ہے اِس کا ذہن اِس طرف چلا جائے کہ اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بھی پرندے بنائے ہیں اور خدا نے بھی تو پھر تو تَشَابه فِي الْخَلْقِ ہو گیا اور یہ قرآن کے خلاف ہے۔ کہنے لگا کہ ''وِچے ہی رَل مِل گئے ہیں۔''

ترتیب مضامین کے لحاظ سے غور

اَب مَیں بتاتا ہوں کہ خود یہی آیت اُن معنوں کو رڈ کرتی ہے جو عام لوگ لیتے ہیں۔ یہ ساری آیت یوں ہے حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ [۲۰] اس آیت

کی ترتیب اپنے مدنظر رکھ لو اور پھر سوچو کہ آیا پرندے بنانے والے معنی کسی صورت میں بھی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں؟ یہ صاف بات ہے کہ قرآن کریم کا کوئی لفظ ترتیب سے خالی نہیں۔ فرض کرو ہم مان بھی لیں کہ اس جگہ پرندہ سے مراد پرندہ بنانا ہی ہے تو دیکھنا یہ چاہئے کہ ان معنوں کو تسلیم کر لینے کے بعد اس آیت میں کوئی ترتیب بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس آیت میں کوئی ترتیب نہیں مگر ہم اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آیت دو جگہوں میں آتی ہے ایک سورۃ آل عمران میں اور دوسرے سورۃ مائدہ میں اور دونوں جگہ الفاظ اسی ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔ اب دونوں جگہ ان الفاظ کا اسی ترتیب سے رکھا جانا بتاتا ہے کہ اس میں کوئی خاص مقصد ہے۔ ہم تو قرآن کریم کی ہر آیت میں ترتیب کے قائل ہیں مگر جو لوگ اس کے قائل نہیں انہیں بھی اگر کسی اور جگہ نہیں تو اس جگہ ترتیب ضرور ماننی پڑتی ہے کیونکہ پہلے خَلْقِ طَیْر کا ذکر ہے پھر اَکْمَہَ کا ذکر ہے پھر اَبْرَصَ کا اور پھر اِحْیَائے مَوْتٰی کا اور ان کا ذکر ایک جگہ نہیں بلکہ دونوں جگہ اسی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ترتیب میں دو باتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ کبھی چھوٹی بات پہلے بتائی جاتی ہے پھر اُس سے بڑی بات بتائی جاتی ہے اور پھر اُس سے بڑی اور کبھی پہلے سب سے بڑی بات بتائی جاتی ہے پھر اُس سے چھوٹی بات بتائی جاتی ہے اور پھر اُس سے چھوٹی اور ان دونوں ترتیبوں میں مخاطب کا فائدہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی جس رنگ میں وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہو اُسی رنگ میں بات بیان کر دی جاتی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر وہ معنی کئے جائیں جو ہمارے مخالف لیتے ہیں تو ان معنوں میں کوئی ترتیب ہی نظر نہیں آتی کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت میں پہلے سب سے بڑی بات کو بیان کیا گیا ہے اور پھر اس سے چھوٹی بات کو اور پھر اس سے چھوٹی بات کو تو اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ سب سے بڑی چیز پرندوں کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے اُتر کر اندھوں کو آنکھیں بخشنا۔ اس سے اُتر کر کوڑھیوں کو اچھا کرنا اور اس سے اُتر کر مُردوں کو زندہ کرنا۔ حالانکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مُردہ زندہ کرنا سب سے بڑی بات ہے۔ پس یہ ترتیب صحیح نہیں ہو سکتی اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ پہلے سب سے چھوٹی بات کو بیان کیا گیا ہے اور پھر اس سے بڑی بات کو اور پھر اس سے بڑی بات تو اس کے یہ معنی بنتے ہیں کہ سب سے آسان کام دنیا میں پرندے بنانا ہے۔ اس سے مشکل کام اندھوں کو آنکھیں دینا ہے۔ اس سے

مشکل کام کوڑھی کو اچھا کرنا ہے اور اس سے مشکل کام مُردے زندہ کرنا ہے۔ گویا اس صورت میں سب سے آسان تر بات پرندے بنانا ٹھہرتی ہے۔ اب اگر یہ درست ہے تو کوئی مولوی ہمیں دو چار پرندے ہی بنا کر دکھا دے۔

دوسری مشکل ان معنوں میں یہ پیش آتی ہے کہ قرآن کریم نے ایک اور جگہ اِحیائے موتٰی کو ادنیٰ اور پیدائش کو اعلیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔ [1] یعنی انسان کا یہ طریق ہے کہ وہ ہماری ہستی کے متعلق باتیں بنانے لگ جاتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ جب ہماری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو پھر ان کو کون زندہ کرے گا؟ فرماتا ہے تم اِحیائے موتٰی کا انکار اسی لئے کرتے ہو کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہڈیاں گل سڑ کر پھر کس طرح اصل شکل وصورت میں آجائیں گی۔ حالانکہ جب اُس نے تمہیں ایک دفعہ پیدا کیا ہے تو دوسری دفعہ پیدا کرنا اُس کے لئے کیا مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا ان لوگوں سے کہہ دے کہ ایسی ہڈیوں کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کی حالت سے خوب واقف ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ مُردہ زندہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ادنیٰ قرار دیا ہے اور پیدائش کو اعلیٰ قرار دیا ہے مگر اُوپر کی ترتیب تسلیم کر لینے کی صورت میں پیدائش کو ادنیٰ ماننا پڑتا ہے اور اِحیائے موتٰی کو اعلیٰ۔

پھر اس ترتیب سے کوڑھیوں کو اچھا کرنا پرندے پیدا کرنے کی نسبت زیادہ مشکل قرار پاتا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر بھی چالموگرا آئیل کی پچکاریوں اور مالش وغیرہ سے کئی کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے ہیں۔ اب چاہئے تھا کہ جب کوڑھی اچھے ہو رہے ہیں تو ان کوڑھیوں کے اچھا ہونے سے پہلے چڑیاں اور کبوتر بھی بننے شروع ہو جاتے حالانکہ انہیں کوئی انسان نہیں بنا سکتا۔ اگر کہا جائے کہ اس ترتیب سے مخاطب کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اگر ایک یہودی کے سامنے حضرت مسیحؑ چڑیا پیدا کرتے تو کیا وہ اس سے زیادہ متاثر ہوسکتا تھا یا اس سے زیادہ متاثر ہوسکتا تھا کہ آپ کسی کوڑھی یا مادرزاد اندھے کو اچھا کر دیتے۔ پس جس چیز سے وہ زیادہ متاثر ہوسکتا تھا چاہئے تھا کہ اسے پہلے رکھا جاتا مگر رکھا اسے بعد میں ہے۔

ترتیب قرآنی کے لحاظ سے خَلقِ طَیر اور اِحیائے مَوْتٰی کے معنی

غرض ہمارے مخالف علماء جو معنی لیتے ہیں وہ ہر ترتیب کی رُو سے غلط ٹھہرتے ہیں مگر ہمارے معنوں کی رُو سے ترتیب پر کسی قسم کا اعتراض نہیں پڑتا۔ ہم پرندے پیدا کرنے سے مراد روحانی آدمی پیدا کرنا لیتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص یہ پوچھے کہ مرزا صاحب نے کیا کیا؟ اور اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ انہوں نے ایک کام کرنے والی جماعت دنیا میں پیدا کر دی ہے تو بالعموم وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ کونسا بڑا کام ہے کیونکہ لوگوں کی نگاہ میں روحانی آدمی پیدا کرنا سب سے کم حیثیت رکھتا ہے اسی لئے اس کو پہلے رکھا۔ پھر اَکْمَہَ یعنی اندھراتے کا علاج ہے یہ چونکہ ایک جسمانی چیز ہے اور ہر ایک کو نظر آجاتی ہے اس لئے اسے بعد میں رکھا اور برص چونکہ اس سے زیادہ سخت ہے اس لئے اَکْمَہَ کے بعد اَبْرَصَ کا ذکر کر دیا اور اِحیائے مَوْتٰی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بالکل مُردہ ہونے کی حالت تک پہنچ جائے اور دُعا سے زندہ ہو جائے۔ برص والے اور اندھراتے والے کو گو سخت مرض ہوتا ہے مگر طاقت قائم ہوتی ہے لیکن جس کی نبضیں چھوٹ جائیں اور پھر کسی نبی یا پاکباز انسان کی دُعا سے زندہ ہو جائے وہ بڑا معجزہ ہوتا ہے۔ پس ہمارے معنے تسلیم کرنے کی صورت میں یہ ترتیب بالکل درست رہتی ہے اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں پڑتا۔

ھُد ھُد کوئی پرندہ نہیں بلکہ انسان تھا

طَیر کا دوسرا ذکر حضرت سلیمانؑ کے حالات کے بیان میں آتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے۔ اب یہاں بھی طَیر سے مراد تمام قسم کے پرندے نہیں اس لئے کہ:-

(ا) جس وقت ہُدہُد کہیں جاتا ہے حضرت سلیمانؑ سخت ناراض ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یعنی ہُدہُد چونکہ غائب ہے اس لئے جب وہ آیا تو میں اُسے سخت سزا دوں گا، میں اُسے ذبح کر ڈالوں گا ورنہ وہ دلیل پیش

کرے اور بتائے کہ کیوں غائب رہا۔ اب بتاؤ کیا قرآن سے یہی پتہ لگتا ہے کہ پرندے ایسی عقل کے مالک ہیں کہ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو تو آدمی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اُسے کہے کہ وجہ بیان کرو ورنہ ابھی تیرا سر کاٹ دوں گا۔ یا کبھی تم نے دیکھا کہ تمہارا کوئی ہمسایہ ہُد ہُد کو پکڑ کر اُسے سوٹیاں مار رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میرے دانے تو کیوں کھا گیا؟ اور اگر تم کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کیا تم اُسے پاگل قرار نہیں دو گے؟ پھر وہ لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف یہ اَمر منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے ہُد ہُد کے متعلق یہ کہا وہ اپنے عمل سے یہی فتویٰ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی لگاتے ہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مَیں اُسے سخت ترین سزا دوں گا اَوْلَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ورنہ وہ ایسی دلیل پیش کرے جو نہایت ہی واضح اور منطقی ہو۔ گویا وہ ہُد ہُد، سقراط، بقراط اور افلاطون کی طرح دلائل بھی جانتا تھا اور حضرت سلیمانؑ اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے دلائل پیش کرے گا۔

(۲) پھر قرآن تو یہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جنوں، انسانوں اور طَیر کے لشکر تھے مگر حضرت سلیمانؑ کی نظر صرف ہُد ہُد کی طرف جاتی ہے اور فرماتے ہیں مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ کیا ہوا کہ اس لشکر میں ہُد ہُد کہیں نظر نہیں آتا۔ حکومت کے نزدیک تو جس کا قد پانچ فٹ سے کم ہو وہ فوج میں بھرتی کے قابل نہیں سمجھا جاتا مگر حضرت سلیمانؑ نے یہ عجیب بھرتی شروع کر دی تھی کہ ہُد ہُد بھی ان کے لشکر میں شامل تھا۔ پھر ہُد ہُد کی کوئی فوج آپ کے پاس ہوتی تب بھی کوئی بات تھی۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ ہُد ہُد صرف ایک آپ کے پاس تھا اس ایک ہُد ہُد نے بھلا کیا کام کرنا تھا اور ایک جانور ساتھ لے جانے سے آپ کی غرض کیا تھی؟

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے ہُد ہُد نے واپس آ کر یہ یہ باتیں بیان کیں اور معجزہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے حالانکہ اصولی طور پر یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بیان ہونا چاہئے تھا مگر بیان ہُد ہُد کا معجزہ ہوتا ہے جو سلیمانؑ کے معجزہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ پھر پرندوں کی بولی سمجھنا حضرت سلیمانؑ سے ہی مخصوص نہیں، تمام شکاری پرندوں کی آوازیں سمجھتے ہیں۔

(۴) ایک اور بات یہ ہے کہ ہُد ہُد اُن جانوروں میں سے نہیں جو تیز پرواز ہوں اور اس قدر

دُور کے سفر کرتے ہوں۔ یہ جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے مگر قرآن یہ بتلاتا ہے کہ ہُد ہُد دمشق سے اُڑا اور ۸ سَو میل اُڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سبا کے ملک تک پہنچا اور پھر وہاں سے خبر بھی لے آیا۔ گویا وہ ہُد ہُد آج کل کے ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ تیز رفتار تھا اور معجزہ دکھلانے والا ہُد ہُد تھا نہ کہ حضرت سلیمانؑ۔ حالانکہ بتانا یہ مقصود تھا کہ حضرت سلیمانؑ نے معجزہ دکھایا۔

(۵) اِسی ہُد ہُد کا دوسرا معجزہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ شرک اور توحید کے باریک اسرار سے واقف تھا اور اس کو وہ وہ مسائل معلوم تھے جو آج کل کے مولویوں کو بھی معلوم نہیں۔ کتنی اعلیٰ توحید وہ بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ یعنی میں نے اُس کو اور اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کے آگے سجدہ کرتے دیکھا اور شیطان نے اُن کے عمل اُن کو خوبصورت کر کے دکھائے ہیں اور اُن کو سچے راستہ سے روک دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے۔ پھر اس کی غیرتِ دینی دیکھو۔ آج کل مولویوں کے اپنے ہمسایہ میں بُت پرستی ہو رہی ہو تو وہ اس کے روکنے کی کوشش نہیں کرتے مگر ہُد ہُد چاروں طرف دَوڑا پھرتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو خبر لا کر دیتا ہے کہ فلاں جگہ شرک ہے فلاں جگہ بُت پرستی ہے۔

(۶) پھر وہ سیاسیات سے بھی واقف تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی ملکہ سبا میں بادشاہت کی تمام صفات موجود ہیں اور اسے لوازمِ حکومت میں سے ہر چیز ملی ہوئی ہے۔ گویا وہ اُس کے تمام خزانے اور محکمے چیک کر کے آیا اور اس نے رپورٹ کی کہ تمام وہ چیزیں جن کی حکومت کے لئے ضرورت ہوا کرتی ہے وہ اُس کے پاس موجود ہیں۔

(۷) پھر شیطان اور اُس کی کارروائیوں سے بھی وہ خوب واقف ہے کیونکہ وہ کہتا ہے مَیں جانتا ہوں کہ انسان کا جب شیطان سے تعلق پیدا ہو جائے تو بُرے خیالات اُس کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ اِن خیالات کے نتائج سے بھی واقف تھا کیونکہ کہتا ہے کہ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ ایسے خیالات کے نتیجہ میں انسان کے دل پر زنگ لگ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قُرب کے راستہ سے دُور جا پڑتا ہے۔ یہ ہُد ہُد کیا ہوا اچھا خاصہ عالم ٹھہرا۔ ایسا ہُد ہُد تو اگر آج مل جائے تو اس کو مُفتی بنا دینا چاہئے۔

(۸) ہاں ایک بات رہ گئی اور وہ یہ کہ وہ تختِ سلطنت کی حقیقت سے بھی خوب واقف تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ملکہ سبا کے پاس ایک ایسا عظیم الشان تخت ہے جو آپ کے پاس نہیں۔ گویا وہ لالچ بھی دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس پر حملہ کیجئے۔

شریعت کا بوجھ انسان کے سِوا کسی اور پر نہیں ڈالا گیا

یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ یہ ہدہد کوئی پرندہ نہیں تھا کیونکہ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ وہ امانت جسے فرشتے بھی نہ اُٹھا سکے، جسے آسمان اور زمین کی کوئی چیز اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئی اسے انسان نے اُٹھالیا۔ وہی ہے جو ہماری شریعت کے اسرار کو جانتا ہے۔ فرشتہ صرف ایک ہی بات سمجھتا ہے یعنی نیکی کی بات کو مگر انسان بدی اور نیکی دونوں پہلوؤں کو جانتا ہے اور تمام حالات پر مکمل نگاہ رکھتا ہے۔ مفسّرین کہتے ہیں کہ ہدہد کوئی جانور تھا حالانکہ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ والی آیت موجود ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے سوا اور کوئی مخلوق اسرارِ شریعت کی حامل نہیں۔ پس جب کہ ہدہد بھی اسرارِ شریعت سے واقف تھا تو لازمًا وہ بھی انسان ہی تھا نہ کہ پرندہ۔

طَیر کی مختلف اقسام

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا طَیر کے متعلق قرآن کریم میں کوئی اشارہ پایا جاتا ہے یا نہیں؟ سو جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ طَیر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ [۴۲] یعنی زمین پر چلنے والے جانور اور دونوں پَروں سے اُڑنے والے پرندے سب تمہاری طرح کی جماعتیں ہیں۔ اب یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے پرندوں کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ کہ وہ پرندے جو اپنے دونوں پَروں کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا پرندہ بھی ہوتا ہے جو پَروں سے نہیں اُڑتا۔

پھر اس سے بھی واضح آیت ہمیں ایک اور ملتی ہے جس سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ واقعہ میں طَیر کسی اور چیز کا نام ہے۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۔ ۴۲؎ یعنی کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وہ تمام ذَوِی العقول کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اور ان ذَوِی العقول میں سے جو طَیر ہیں وہ صفیں باندھ باندھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور ان گروہوں میں سے ہر ایک کو نماز اور تسبیح کا طریق معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ ان ذَوِی العقول کے تمام اعمال سے واقف ہے۔ یہاں تین دلیلیں اس بات کی موجود ہیں کہ طَیر سے مراد پرندے نہیں۔

اوّل: يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں سے اللہ تعالیٰ نے طَیر کیوں نکال ڈالے اور ان کا الگ کیوں ذکر کیا؟ پھر مَنْ کا لفظ ہمیشہ ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ غیر ذَوِی العقول کے لئے نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے صرف طَیر کو کیوں نکالا؟ جنات اور دوسری مخلوق کا الگ ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا اس سے صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ طَیر کوئی الگ چیز ہے؟

پھر فرماتا ہے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے۔ اب سارے قرآن میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ پرندے بھی نمازیں پڑھا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ خالی تسبیح ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں نماز کا بھی علم ہے اور وہ صفیں باندھ باندھ کر نمازیں پڑھتے ہیں۔ آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ اور يَفْعَلُوْنَ کا صیغہ پھر ذَوِی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ آخر تم نے کبھی ایسے طَیر دیکھے ہیں جو صفیں باندھ باندھ کر نمازیں پڑھتے ہوں؟ ایسے طَیر تو دنیا میں صرف مسلمان ہی ہیں اور کوئی نہیں۔ پس مَنْ کا استعمال، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ کا استعمال اور وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ کا ذکر بتا رہا ہے کہ اس میں انسانوں کا ہی ذکر ہے خصوصاً اُن مؤمنوں کا جو باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں۔

مومنوں کو طَیر کیوں کہا گیا؟

اب سوال یہ ہے کہ اگر طَیر سے مراد اس جگہ مومن ہی ہیں تو پھر انہیں طَیر کیوں کہا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی اعمال کا جو نتیجہ ہو اُسے عربی میں طائر کہتے ہیں اور اس کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ اعراف میں فرماتا ہے۔ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ

الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ [44] یعنی جب اُن کو کوئی خوشی پہنچتی ہے اور ان پر خوشحالی کا دور آتا ہے تو کہتے ہیں یہ ہمارا حق ہے اور جب ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں موسیٰؑ اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ سنو! اُن کا پرندہ یعنی اُن کے وہ اعمال جنہیں وہ بجالاتے ہیں خدا کے پاس موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی وجہ سے عذاب آیا اور خدا کہتا ہے کہ ان کا پرندہ ہمارے پاس موجود ہے۔ بظاہر اس کا آپس میں چونکہ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اس لئے لغت والے لکھتے ہیں کہ طائر کے ایک معنی انسانی اعمال کے بھی ہیں۔ چنانچہ امام راغب لکھتے ہیں۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ کے معنی ہیں عَمَلَهُ الَّذِيْ طَارَ عَنْهُ مِنْ خَيْرٍ وَّشَرٍّ [45] یعنی اِس جگہ طائر سے مراد ہر اچھا یا بُرا عمل ہے جو انسان سے سرزد ہوتا اور پھر اُڑ کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اقرب میں بھی طائر کے ایک معنی عمله الَّذِيْ قَلَّدَهٗ طَارَ عَنْهُ مِنْ خَيْرٍ وَّشَرٍّ [46] کے لکھے ہیں یعنی انسانی عمل خواہ اچھا ہو یا بُرا۔

پھر فرماتا ہے قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ۔ [47] جب ثمود کے پاس حضرت صالح علیہ السلام آئے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ تیرے اور تیرے ساتھیوں کے بُرے اعمال کی نحوست کی وجہ سے ہم تباہ ہوئے ہیں جیسے آج کل کہتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب کی نحوست کی وجہ سے ہی طاعون اور دوسری وبائیں آئیں۔ فرماتا ہے ان کے نبی نے ان کو جواب دیا کہ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ تمہارا طائر تو اللہ کے پاس ہے بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو جسے آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔

پھر تین رسولوں کا سورۃ یٰسٓ میں ذکر کر کے فرماتا ہے قَالُوْۤا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ قَالُوْا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ [48] یعنی جب وہ مصلح اور رسول ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری وجہ سے بڑی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں اور تمہارا آنا ہم منحوس سمجھتے

ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ انہوں نے کہا تمہارا پرندہ تو تمہارے ساتھ ہے یعنی تم جہاں بھی ہو گے تمہارے اعمالِ بد کا نتیجہ تم ہی کو تباہ کرے گا ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور کیا تم یہ بات اس لئے کہتے ہو کہ ہم تمہیں اچھے کام یاد دلاتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ تم حد سے گزرنے والی قوم ہو اِس لئے تم اپنے اعمال کی ضرور سزا پاؤ گے۔ اس جگہ بھی طائر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قوتِ عملیہ اور نتیجہ عمل کے معنوں میں ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کے استعمال کی حقیقت کیا ہے اور اس کی انسان کے ساتھ نسبت کیا ہے؟ سو اس کے متعلق جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں سورۃ بنی اسرائیل میں ایک آیت نظر آتی ہے جو ہمیں اس مضمون کے بہت زیادہ قریب کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ [۶۸] یعنی ہم نے ہر انسان کے ساتھ ایک پرندہ اُس کی گردن کے نیچے باندھا ہوا ہے اور ہم قیامت کے دن اُس کے اعمال نامہ کو اُس کے سامنے لائیں گے جسے وہ بالکل کُھلا ہوا پائے گا اور اُسے کہا جائے گا اِسے پڑھ کر دیکھ لے اور اپنی نیکی بدی کا آپ حساب کر لے کیونکہ آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے اور یاد رکھو کہ جو ہدایت پاتا ہے وہ اپنے لئے پاتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے اس کا نقصان بھی اُسی کو ہوتا ہے کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا اور ہم اُس وقت تک لوگوں کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ اُن کی طرف کوئی رسول مبعوث نہ کر لیں۔

یہاں قرآن نے طائر کے نہایت لطیف معنی کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ہر انسان کی گردن کے نیچے اُس کا پرندہ بندھا ہوا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ سو جب ہمیں خدا تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ یہ پرندہ ہر انسان کی گردن کے نیچے ہے تو ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے کہ کوئی پرندہ گردن کے نیچے نہیں ہوتا۔ پس صاف معلوم ہوا کہ اس پرندے سے مراد کوئی اور چیز ہے اور وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ قوتِ عمل یا نتیجہ عمل کا نام خدا تعالیٰ نے طائر رکھا ہے۔ پس جس قسم کے بھی انسان

اعمال بجالاتا ہے اُن کی پرندے والی شکل بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر تو انسان نیک اعمال بجالاتا ہے تو وہ انسان کو آسمانِ روحانیت کی طرف اُڑا کر لے جاتے ہیں جیسے ہوائی جہاز فضائے آسمانی میں اُڑا کر لے جاتا ہے اور اگر اعمال بُرے ہونگے تو لازمًا پرندہ بھی کمزور ہوگا اور انسان بجائے اُوپر اُڑنے کے نیچے کی طرف گرے گا۔ اب قرآن کریم ایک طرف تو یہ مضمون بیان کرتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کے ساتھ ایک طائر باندھ رکھا ہے اگر وہ اچھے عمل کرے گا تو وہ طائر اسے اُوپر اُڑا کر لے جائے گا اور اگر بُرے اعمال کرے گا تو وہ اُسے نیچے گرا دے گا اور دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں کہ مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاہُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ [50] کہ ہر انسان کو خدا تعالیٰ نے فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے پھر ماں باپ اُسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں گویا انسان میں اُڑنے کی طاقت موجود ہے اور اُسے پرواز کے پَر عطا کئے گئے ہیں۔ یہی مضمون کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ میں بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے اُس کا پرندہ بھی اُس کے ساتھ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ پھر بعض ماں باپ تو اُس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور بعض جو بچ جاتے ہیں اُن کے لئے پرواز کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور عملِ نیک کی وجہ سے اُن کا طائر یعنی فطرتی مادۂ سعادت ترقی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ فاطر میں فرماتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ [51] یعنی سب تعریفیں اُس اللہ کی ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو ایسی حالت میں رسول بنا کر بھیجنے والا ہے جب کہ کبھی تو اُن کے دو دو پَر ہوتے ہیں کبھی تین تین اور کبھی چار چار۔ پھر وہ انسانوں کی طرف آتا ہے اور فرماتا ہے۔ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ؕ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِیْنَ یَمْکُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَمَکْرُ اُولٰٓئِکَ هُوَ یَبُوْرُ۔ [52] فرماتا ہے تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ مختلف فرشتوں کی ترقی کے لئے ہم نے کئی کئی پَر بنائے ہوئے ہیں مگر اے انسانو! تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ تمہارے لئے بھی ترقی کے مواقع موجود ہیں بلکہ اگر تم چاہو تو فرشتوں سے بھی آگے بڑھ سکتے ہو۔ پس تم میں سے جو کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے یاد رکھنا چاہئے کہ تمام عزت اللہ تعالیٰ کے

ہاتھ میں ہے اور اُسی کی طرف سچی اور پاکیزہ روحیں بلند ہوتی ہیں۔ اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ یعنی خدا کا کلام جن کو میسر ہو وہ ترقی کر جاتے ہیں مگر خالی کلام نہیں بلکہ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ اعمالِ صالحہ کا اُسے سہارا چاہئے۔ گویا اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ ایک پرندہ ہے مگر وہ اکیلا نہیں اُڑ سکتا بلکہ اعمالِ صالحہ کی مدد سے صعود کرتا ہے۔ اسی طرح اُس کے دو پَر بن جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ آسمانِ روحانیت کی طرف پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ پرندے کی دو خاصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اونچا جاتا ہے یعنی فضا میں اُڑتا ہے دوسرے یہ کہ اُس کا آشیانہ ہمیشہ اونچا ہوتا ہے۔ جو پرندے آشیانوں میں رہتے ہیں وہ درختوں کی ٹہنیوں پر آشیانہ بناتے ہیں اور جو بغیر آشیانے کے رہتے ہیں وہ بھی درخت پر بسیرا کرتے ہیں نیچے نہیں بیٹھتے۔ اب یہی دو خاصیتیں قرآن کریم میں مومنوں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔[۵۳] اے مومنو! جب تمہیں کہا جائے کہ اُٹھو! تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوا کرو اور نبی یا اُس کے خلیفہ کی آواز پر دَوڑ پڑا کرو کیونکہ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو تم میں سے مومن ہیں اور علمِ حقیقی رکھنے والے ہیں اونچا کر دے گا اور انہیں درجات میں بڑھا دے گا۔ گویا اُوپر اُڑنے کی خاصیت کا مومنوں کے تعلق میں ذکر آ گیا۔

دوسری خاصیت یہ تھی کہ پرندہ ہمیشہ اپنا آشیانہ اونچا بناتا ہے اس کا بھی مومنوں میں پایا جانا قرآن کریم سے ثابت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۔[۵۴] یہ نور کچھ گھروں میں ہے جن کے متعلق ہمارا حکم ہے کہ انہیں اونچا کر دیا جائے۔ ان گھروں میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور صبح و شام اس کی تسبیح کی جاتی ہے مگر فرماتا ہے رِجَالٌ ہماری مراد گھروں سے نہیں بلکہ آدمیوں کو اونچا کرنے سے ہے ایسے آدمیوں کو جن کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ بیع۔ گویا پرندے کی جو دو خاصیتیں تھیں ان دونوں کا مومنوں کے اندر پایا جانا بھی بیان کر

دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ عملِ صالح مومن کو اُڑا کر اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی مومن مرتا ہے تو اُس کی روح کو فرشتے آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دروازے کھول دو ایک مومن کی روح آتی ہے مگر جب کافر مرتا ہے تو اُس کی روح اُٹھائی نہیں جاتی بلکہ نیچے پھینکی جاتی ہے۔

غرض طَیْر سے مراد وہ اعلیٰ درجہ کی روحیں ہیں جو دین کے لئے ہر قسم کی بلندیوں پر چڑھنے کے لئے تیار رہتی ہیں وہ مشکلات کی پرواہ نہیں کرتیں اور نہ مصائب سے گھبراتی ہیں بلکہ ہر قسم کی قربانیوں کے لئے آمادہ اور تیار رہتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے جنگِ بدر کے موقع پر کہا یا رسول اللہ! آپ حکم دیجئے ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور ذرا بھی ہمارے اندر ہچکچاہٹ پیدا نہیں ہوگی کہ حضور نے یہ حکم کیوں دیا؟ گویا مومن کو پرندہ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اُن قابلیتوں کا ذکر کیا ہے جو مومنوں میں پائی جاتی ہے اور بتایا ہے کہ وہ سفلی زندگی کی بجائے علوی زندگی اختیار کرتے اور نیچے جھکنے کی بجائے اُوپر کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

ہُدہُد کے متعلق تاریخی تحقیق

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ہُدہُد نام کیوں رکھا گیا ہے؟ اور گو اس کا عقلی جواب مَیں قرآن کریم سے ہی دے چکا ہوں مگر اَب بتاتا ہوں کہ ہُدہُد سے مراد کیا ہے؟

ہُدہُد کا پتہ لینے کے لئے جب ہم بنی اسرائیل کی کتابیں دیکھتے ہیں اور اِس امر پر غور کرتے ہیں کہ کیا اِن میں کسی ہُدہُد کا ذکر آتا ہے یا نہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں میں کثرت سے ہَدَدنام ہوا کرتا تھا جو عبرانی سے عربی میں بدل کر ہُدہُد ہو گیا۔ جیسے عبرانی میں ابراہام کہا جاتا ہے مگر جب یہ لفظ عربی میں آیا تو ابراہیم بن گیا۔ اسی طرح عبرانی میں یسوع کہا جاتا ہے مگر عربی میں عیسیٰ کہتے ہیں۔ اسی طرح عبرانی میں موشے کہا جاتا ہے مگر عربی میں یہی نام موسیٰ ہو گیا۔ اب بھی کسی اہلِ عرب کو لکھنؤ کہنا پڑے تو وہ لکھنؤ نہیں بلکہ ''لکھنا ہو'' کہے گا۔ اسی طرح عبرانی میں ہَدَد کہا جاتا تھا مگر چونکہ قرآن عربی میں ہے اس لئے جب یہ نام اس

میں آیا تو ہُد ہُد ہو گیا۔

درحقیقت تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ھدد کئی ادومی بادشاہوں کا نام تھا اور اس کے معنی بڑے شور کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی ھَدٌّ کے ایک معنی اَلصَّوْتُ الْغَلِیْظُ [۵۵] یعنی بڑی بلند آواز کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اونچی آواز والے لڑکے کا نام ہُدد یا ہُد ہُد رکھ دیتے تھے۔ پھر یہ نام تیسرے ادومی بادشاہ کا بھی تھا جس نے مدین کو شکست دی تھی اور آخری بادشاہ کا بھی یہی نام تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک لڑکے کا نام بھی ہُد ہُد تھا۔ بائبل کی کتاب نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۴ میں بھی ادوم کے خاندان کے ایک شہزادہ کا ذکر آتا ہے جس کا نام ہُدد تھا اور جو یوآب کے قتل عام سے ڈر کر مصر بھاگ گیا تھا۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ پُرانے عہد نامہ میں جب یہ لفظ اکیلا آئے اور اس کے ساتھ کوئی صفاتی فعل یا لفظ نہ ہو تو اس کے معنی ادومی خاندان کے آدمی کے ہوتے ہیں۔ غرض یہ ہُد ہُد عبرانی زبان کا لفظ ھُدد ہے جو عربی میں آکر ہُد ہُد ہو گیا۔ چونکہ مفسّرین کو یہ شوق ہوتا ہے کہ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنائیں اس لئے وہ بعض دفعہ بیہودہ قصے بھی اپنی تفسیروں میں درج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ضَبّ عربی میں گوہ کو کہتے ہیں مگر ضَبّ عرب کے ایک قبیلے کے سردار کا بھی نام تھا اور یہ ایسا ہی نام ہے جیسے ہندوؤں میں طوطارام نام ہوتا ہے۔ وہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اب وعظ کی کتابوں میں اس بات کو ایک قصہ کا رنگ دیتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں جا رہے تھے کہ رستہ میں ایک سوراخ سے گوہ نکلی اور اُس نے قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اب جن لوگوں نے یہ بنالیا کہ ایک گوہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا اُن کے لئے ہُد ہُد کا پرندہ بنالینا کونسا مشکل کام تھا۔

بہرحال قرآن کریم میں کئی مقامات پر مجاز اور استعارہ بھی استعمال کیا گیا ہے مگر چونکہ قرآن کریم دائمی شریعت ہے اس لئے اُس نے ساتھ ہی محکم آیات بھی رکھ دی ہیں جو کوئی دوسرے معنی کرنے ہی نہیں دیتیں۔ جب استعارے کو استعارے کی حد تک محدود رکھا جائے گا تو اس کے معنی ٹھیک رہیں گے مگر جب استعارہ کو حقیقت قرار دے دیا جائے گا تو دو آیتیں آپس میں ٹکرا جائیں

گی۔

غرض قرآن کریم کا یہ ایک عظیم الشان معجزہ ہے جس کے مقابلہ میں باقی الہامی کتب قطعاً نہیں ٹھہر سکتیں۔ افسوس ہے کہ باوجود ایسی عظیم الشان کتاب پاس رکھنے کے مسلمانوں کو پھر بھی ٹھوکر لگ گئی اور انہوں نے عجیب وغریب قصّے گھڑ لئے۔ چنانچہ چیونٹی کا واقعہ جو وہ بیان کرتے ہیں اسی کے ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کو جب وہ چیونٹی ملی تو آپ نے اس سے پوچھا کہ بتا مجھ سے بڑا آدمی بھی تو نے کبھی دیکھا ہے؟ وہ کہنے لگی یہ کوئی اچھی بات معلوم نہیں ہوتی کہ آپ تخت پر بیٹھے ہوں اور مَیں زمین پر۔ آپ مجھے اپنے پاس بٹھائیں پھر آپ کی بات کا مَیں جواب بھی دے دونگی۔ انہوں نے اُسے اُٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔ وہ کہنے لگی اب بھی مَیں بہت نیچے ہوں آپ ذرا اُور اُوپر کریں۔ چنانچہ انہوں نے اُسے اپنے ہاتھ پر اُٹھالیا۔ اِس پر وہ کہنے لگی بڑے آپ نہیں بلکہ مَیں بڑی ہوں جو سلیمان کے ہاتھ پر بیٹھی ہوں۔ تو ایسے ایسے لطائف انہوں نے لکھے ہیں جنہیں سُن کر ہنسی آتی ہے۔

بے شک پہلی کتب میں بھی استعارے استعمال کئے گئے ہیں مگر ان کتب میں ان استعاروں کیلئے اندرونی حل موجود نہیں تھا۔ اس کے مقابل میں قرآن کریم میں بھی استعارے ہیں مگر ساتھ ہی اس نے حل بھی رکھ دیا ہے تا کہ اگر کسی کو ٹھوکر لگے تو عالمِ قرآن اُس کو سمجھا سکے۔

غرض قرآن کریم کو وہ عظمت حاصل ہے جو دنیا کی اور کسی کتاب کو حاصل نہیں اور اگر کسی کا یہ دعویٰ ہو کہ اُس کی مذہبی کتاب بھی اس فضیلت کی حامل ہے تو مَیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے۔ اگر کوئی وید کا پیرو ہے تو وہ میرے سامنے آئے۔ اگر کوئی توریت کا پیرو ہے تو وہ میرے سامنے آئے۔ اگر کوئی انجیل کا پیرو ہے تو وہ میرے سامنے آئے اور قرآن کریم کا کوئی ایسا استعارہ میرے سامنے رکھ دے جس کو مَیں بھی استعارہ سمجھوں۔ پھر میں اس کا حل قرآن کریم سے ہی نہ پیش

کردوں تو وہ بیشک مجھے اِس دعویٰ میں جھوٹا سمجھے لیکن اگر پیش کردوں تو اُسے ماننا پڑے گا کہ واقعہ میں قرآن کریم کے سوا دنیا کی اور کوئی کتاب اِس خصوصیت کی حامل نہیں۔

اِس وقت تک مَیں نے قرآن کریم کی فضیلت کے متعلق آٹھ دس باتیں ہی بیان کی ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ تین سَو بلکہ اس سے بھی زیادہ دلائل ایسے دیئے جاسکتے ہیں جن سے قرآن کریم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور جن کے مقابلہ میں عام انسانی کتابیں تو الگ رہیں الہامی کتابیں بھی نہیں ٹھہر سکتیں لیکن ان کا لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔کام اتنا زیادہ ہو گیا ہے اور پھر صحت ایسی خراب رہتی ہے کہ اِس کو دیکھتے ہوئے یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

اِس کے بعد مَیں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور دوستوں کو اِس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ آپ لوگ جلسے پر آئے، تقریریں سنیں اور جلسہ ختم ہو گیا۔ اِس جگہ آنے اور تقریریں سننے کا آخر کوئی فائدہ ہونا چاہئے ورنہ آ کر خالی ہاتھ چلے جانا تو اپنے اوقات اور اموال کو ضائع کرنا ہے۔ پس جلسہ سالانہ سے فائدہ اُٹھاؤ اور اِس دفعہ مَیں نے جو مضمون بیان کیا ہے اس کی مناسبت سے کوشش کرو کہ تم طَیر بن جاؤ اور ہُدہُد والے کمال تم میں آ جائیں۔ اگر سلیمانؑ کی اُمت میں سے ایک شخص جس کا نام ہُدہُد تھا، اتنے کمال اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے کہ توحید کے باریک اَسرار کا اُسے علم ہو جاتا ہے، سیاست سے وہ واقف ہوتا ہے، سلیمانؑ شام میں ہوتے ہیں اور وہ یمن کی خبر انہیں پہنچا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں جو شرک نظر آتا ہے اُس کو دُور کرنا چاہئے حالانکہ سلیمانؑ صرف ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو وہ قوم جسے خدا نے یہ کہا ہے کہ جاؤ اور ساری دنیا میں میرا پیغام پہنچاؤ اُس کے افراد کے اندر اگر اپنے مذہب کا درد نہ ہو تو یہ کتنی شرم کی بات ہوگی۔ غالباً اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو شرمانے کے لئے یہ قصہ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے مقابلہ میں تو سلیمانؑ کی اُمت ایسی ہی ہے جیسے باز کے مقابلہ میں ہُدہُد۔ پس جب ہُدہُد یہ کمال دکھا سکتا ہے تو بازوں کو اپنے اندر جو کمالات پیدا کرنے چاہئیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہو سکتے۔

پس اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو! اپنے اندر جوشِ اخلاص اور ہمت پیدا کرو۔ تم آسمان کی طرف اُڑو کیونکہ تمہارا خدا اُوپر ہے۔ تم نیچے مت دیکھو اور معمولی معمولی باتوں کے پیچھے مت پڑو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں طائر بنانا چاہتا ہے۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن پر تمہیں ابتلاء آجاتے ہیں۔ کہیں اِس بات پر لڑائی ہو جاتی ہے کہ فلاں عُہدہ مجھے کیوں نہیں ملا، کہیں اس بات پر کوئی شخص ٹھوکر کھا جاتا ہے کہ انجمن کا سیکرٹری فلاں کیوں بنا مجھے کیوں نہ بنایا گیا۔ گویا ہر وقت اُن کی نظر نیچی رہتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تم کو طائر بنانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ہم نے ہر انسان کی گردن کے نیچے ایک طائر باندھ رکھا ہے۔ اب بتاؤ جس کی گردن کے نیچے کوئی چیز باندھ دی جائے اُس کی نگاہ کبھی نیچی بھی ہو سکتی ہے وہ تو ہمیشہ اُوپر کی طرف دیکھے گا۔ پس اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم اپنی نگاہیں ہمیشہ اُونچی رکھو کیونکہ تم مسلمان ہو اور مسلمان کے برابر دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا۔

پس فائدہ اُٹھاؤ میرے اِس وعظ و نصیحت سے اور جب اپنے گھروں میں جاؤ تو اِس ارادے اور نیت کے ساتھ جاؤ کہ آئندہ ہم چوہے اور چھپکلیاں نہیں بنیں گے بلکہ وہ طائر بنیں گے جو ہواؤں میں اُڑتے پھرتے ہیں اور اپنے خدا کی

آواز سننے کی کوشش کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دُعا

اس کے بعد مَیں دُعا کروں گا دوست بھی دُعا کریں۔ اپنے لئے بھی، اپنے رشتہ داروں کے لئے بھی کیونکہ یہ جامع دُعا ہوتی ہے۔ جو احمدی ہیں اُن کے لئے بھی کہ انہیں روحانی ترقی نصیب ہو اور جو غیر احمدی ہیں ان کے لئے بھی کہ انہیں ہدایت حاصل ہو۔ اِسی طرح اپنے شہر والوں کے لئے، اپنے ہمسایوں کے لئے اور اپنے ملک والوں کے لئے دُعائیں کرو اور خصوصیت سے جماعت کے لئے یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت میں سچا تقویٰ، پرہیز گاری اور تقدس پیدا کرے کیونکہ بغیر اِس کے کہ ہم اسلام کا عملی نمونہ ہوں ہماری زندگیاں کسی کام کی نہیں۔ پس دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں ایسی محبت پیدا کردے جس کے مقابلہ میں اور تمام محبتیں سرد ہو جائیں اور ہمیں ہر جگہ وہی نظر آئے۔ اگر ہم بیویوں سے محبت کریں تو خدا کے لئے، اگر ہم ماں باپ سے محبت کریں تو خدا کے لئے، اگر ہم اپنی جانوں سے محبت کریں تو خدا کے لئے، اور اگر ہم مال سے محبت کریں تو خدا کیلئے۔ ہماری مثال حضرت علیؓ کی سی ہو جائے کہ اُن سے جب اُن کے بیٹے امام حسنؓ نے ایک دفعہ پوچھا کہ کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو انہوں نے کہا ہاں! پھر انہوں نے پوچھا کیا آپ خدا سے بھی محبت کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ یہ سن کر حضرت حسنؓ کہنے لگے۔ کیا یہ شرک نہیں کہ آپ خدا کی محبت میں میری محبت کو بھی شریک کرتے ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا اے میرے بیٹے! یہ شرک نہیں کیونکہ اگر خدا کی محبت کے مقابلہ میں تیری محبت آجائے تو میں اُسے اُٹھا کر پرے پھینک دوں گا۔

پس دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی محبت دے اور اگر مَاسِوَی اللہ کی محبت ہمارے دلوں میں ہو تو محض اُس کی وجہ سے ہو مستقل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اچھے کاموں کی توفیق دے ہمیں دناءت، کمینگی اور پست ہمتی سے محفوظ رکھے۔ ہمارے خیالات میں وسعت دے، ہماری کوششوں میں برکت ڈالے اور ہماری قربانیوں کو زیادہ کرے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اسلام کی اشاعت کے لئے رات

اور دن کام کرتے چلے جائیں مگر ہم یہ سمجھیں کہ ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر وہ ہمیں اپنے فضل سے اِس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی زندگیاں اُس کے دین کے لئے وقف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے لالچ اور حرص نکال دے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے ظلم کا مادہ نکال دے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے بدظنی اور اپنے بھائیوں کی عیب جوئی اور اُن پر طعنہ زنی کا مادہ نکال دے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر عیب سے بچائے۔ ہمارے اندر رحم پیدا کرے۔ ہمیں قرآن کا علم دے۔ اس کے پڑھنے کی توفیق بخشے اور اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت عطا فرمائے اور اپنے کلام کی ایسی محبت ہمارے دلوں میں ڈال دے کہ اس کا کلام ہماری روح کی غذا بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں نور پیدا کرے۔ وہ ہماری آنکھوں، ہمارے کانوں، ہمارے دماغوں، ہمارے ہاتھوں اور ہمارے پاؤں میں نور پیدا کرے۔ ہمارے آگے بھی نور ہو ہمارے پیچھے بھی نور ہو۔ ہمارے دائیں بھی نور ہو ہمارے بائیں بھی نور ہو۔ ہمارے اندر بھی نور ہو ہمارے باہر بھی نور ہو یہاں تک کہ ہم مکمل نور بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ تمام تاریکیوں اور ظلمتوں سے ہمیں محفوظ رکھے اور ہمیں اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ ہر قسم کے دشمنوں کے حملوں سے ہمیں بچائے۔ اپنے فضلوں کے دروازے ہم پر کھول دے اور ہمارے قلوب کو اتنا پاک اور مصفّٰی کر دے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظِلّ اس پر پڑنے لگے یہاں تک کہ ہم اس کے وہ بندے بن جائیں جن کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ [٥٦]۔

پھر دعا کرو اُن مبلغوں کے لئے جو باہر گئے ہوئے ہیں۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اُن کوششوں میں جو وہ سلسلہ کی حفاظت اور ترقی کے لئے کر رہے ہیں برکت ڈالے اور ان کے تھوڑے کام کو بھی بہت بنا دے۔ اُن کی زبانوں میں تاثیر ڈالے، اُن کے قلوب میں درد پیدا کرے، اُن کے دماغوں میں خدا کی محبت کی کیفیات موجزن ہوں اور اُن کی زندگیاں خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول ہو جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ وہ ہماری آئندہ نسلوں کو بھی پاک بنائے جو ہم میں نقص ہیں وہ ان میں نہ جائیں مگر ہم میں جو خوبیاں ہیں وہ ان کے وارث ہوں۔ آمین ثم آمین۔

اس کے بعد حضور نے لمبی دعا فرمائی اور یہ مبارک جلسہ بخیر خوبی اختتام پذیر ہوا۔

۱؎ النمل:۱۶تا۲۹ ۲؎ الواقعة:۸۰

۳؎ بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبة یعرف فیه الحزن (مفہوماً)

۴؎ البقرة:۹ ۵؎ الاعراف:۵۵ ۶؎ القلم:۴۳

۷؎ الانعام:۹۷ ۸؎ احبار باب ۱۳ آیت ۴۷تا۵۹

۹؎ المدثر:۵ ۱۰؎ آل عمران:۸

۱۱؎

۱۲؎ النمل:۱۶ ۱۳؎ سبا:۱۱،۱۲ ۱۴؎ الانبیاء:۸۰،۸۱

۱۵؎ ص:۱۸تا۲۱ ۱۶؎ الجاثیة:۱۳،۱۴ ۱۷؎ الجمعة:۲

۱۸؎ بخاری کتاب الصلٰوة باب قول النبی جعلت لی الارض......

۱۹؎ اقرب الموارد الجزء الاوّل صفحه ۱۰۱ مطبوعه بیروت ۱۸۸۹ء

۲۰؎ الاحقاف:۳۰تا۳۲ ۲۱؎ البقرة:۱۵ ۲۲؎ الانعام:۱۱۳

۲۳؎ النساء:۸۰ ۲۴؎ البقرة:۵۵

۲۵؎ نسائی کتاب الطهارة باب التیمم بالصعید

۲۶؎ الانعام:۱۲۹ ۲۷،۲۸؎ الانعام:۱۳۱

۲۹؎ الفتح:۹،۱۰ ۳۰؎ الاحزاب:۷۳

۳۱؎ لسان العرب المجلد الثالث صفحه ۲۲۶_۲۲۷ مطبوعه بیروت ۱۹۸۸ء

۳۲؎ المنجد عربی اُردو صفحه ۹۱۲ مطبوعه کراچی ۱۹۷۵ء

۳۳؎ تاج العروس

۳۴؎ تقویم البلدان صفحه ۲۳۸

۳۵؎ القاموس الجزئ الثانی صفحه ۲۴۶ نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۹ھ

۳۶؎ آل عمران:۴۹،۵۰ ۳۷؎ المائدة:۱۱۱

۳۸؎ الرعد:۱۷ ۳۹؎ التوبة:۱۱۹

۴۰؎ آل عمران:۵۰ ۴۱؎ یٰس:۷۹،۸۰

۴۲ الانعام:۳۹ ۴۳ النور:۴۲
۴۴ الاعراف:۱۳۲
۴۵ المفردات فی غریب القرآن صفحہ ۳۱۰ مطبوعہ کراچی
۴۶ اقرب الموارد الجزء الاوّل صفحہ ۷۲۵ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء
۴۷ النمل:۴۸ ۴۸ یٰسٓ:۱۹، ۲۰
۴۹ بنی اسرائیل:۱۴ تا ۱۶
۵۰ الجامع الصغیر للسیوطی
۵۱ فاطر:۲ ۵۲ فاطر:۱۱
۵۳ المجادلۃ:۱۲ ۵۴ النور:۳۷، ۳۸
۵۵ اقرب الموارد الجزء الثانی صفحہ ۱۳۷۷ مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹ء
۵۶ الفجر:۳۰، ۳۱